جنوبی ایشیا میں

ہندو مُسلم تہذیب

وادی سِند سے 1707 تک

3803

ایس ایم شاھد

نیو بُک پیلس اُردو بازار لاہور

Marfat.com

جنوبی ایشیا میں
ہندو مسلم تہذیب

(وادیٔ سندھ سے 1707 تک)

ایس ایم شاہد

فیکلٹی آف ایجوکیشن

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد

نیو بک پیلس

اردو بازار، لاہور (فون: 042-7224925)

Marfat.com

87050

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

کتاب : جنوبی ایشیا میں ہندو مسلم تہذیب

تالیف : ایس۔ ایم۔ شاہد

کمپوزنگ : للهت کمپوزرز' ملتان روڈ' لاہور۔ (فون : 7571207)

ناشر : نیو بک پیلس' اردو بازار' لاہور۔

پرنٹرز : ندیم یونس پرنٹرز' لاہور۔

قیمت : 66 روپے

Marfat.com

انتساب

عظیم

کے نام-----

Marfat.com

مندرجات

	پیش لفظ	6
باب	عنوان	صفحہ
1-	وادیٔ سندھ کی تہذیب	7
2-	ابتدائی ویدک عہد میں تہذیب اور کلچر	21
3-	ویدک تہذیب و کلچر' آخری عہد میں	31
4-	ذاتوں کا نظام	40
5-	جین مت	50
6-	بدھ مت	53
7-	برصغیر میں یونانی آرٹ و کلچر	69
8-	گپتا تہذیب و تمدن	78
9-	ہندو تحریک احیائے علوم	84
10-	جنوبی ایشیا میں اسلام کی آمد	96

Marfat.com

11-	مسلم معاشرے کا قیام	107
12-	علماء و مشائخ	114
13-	مغلوں سے پہلے تمدنی ارتقاء	126
14-	مغلوں سے پہلے ادبی ارتقاء	150
15-	سلاطین کا نظام تعلیم	160
16-	سلاطین کا نظام عدلیہ	168
17-	مغلیہ معاشرہ اور کلچر	174
18-	عہد مغلیہ کا ادب	182
19-	مغل مصوری	194
20-	مغل فن تعمیر	204
21-	مغل عہد میں موسیقی	213
22-	مغلوں کا نظام تعلیم	224
23-	مغلوں کا نظام عدلیہ	231

Marfat.com

پیش لفظ

جو کوئی الف کہتا ہے
اس کے بارے میں
آج یہ افواہ اڑائی جاتی ہے
کہ اس نے
ب بھی
کہا تھا
کیوں کہ
بعض سچائیاں ایسی ہوتی ہیں
جو اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ
جھوٹ بولتی ہیں
جس کی جرات جھوٹ بھی نہیں کر سکتا
.بعضوں کی سوچ ایسی ہے
کہ وہ صرف
ایسی سچائیوں کی
تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں
دنیا جس قدر ناملائم ہوتی جاتی ہے
اسی قدر ایسی سوچ کی
چکناہٹ
بڑھتی جاتی ہے؟؟

ایسے میں' میں اپنے اللہ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ جیسے کم علم اور کم زور انسان کو یہ کتاب مرتب کرنے کی ہمت دی۔ ایم اے مطالعہ پاکستان کے طلبہ کے لئے زیر مطالعہ پرچے کے لئے کافی ہو گی۔

ایس۔ ایم۔ شاہد

Marfat.com

○باب 1

وادیٔ سندھ کی تہذیب

(INDUS VALLEY CIVILIZATION)

قدیم حجری عہد :

برصغیر میں ابتدائی انسان کی کہانی بڑی حد تک پردہ خفا میں رہی ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ قدیم ترین ماضی ست یگ تھا۔ ایک ایسا عہد جس میں انسان اطمینان و مسرت کی مثالی زندگی گزارتا تھا جو تکلیف، ضرورت اور زوال سے مبرا تھی۔ لیکن بدقسمتی سے باقاعدہ تاریخ ایسے سنہرے زمانے کی نشان دہی نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف تمام اشارے اس طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ قدیم انسان جہالت اور بربریت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، نیز یہ کہ انسان تہذیب کی روشنی کی طرف رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ برصغیر کے قدیم باشندے شاید قدیم حجری عہد کے لوگ تھے۔ وہ وحشی تھے اور درختوں کے نیچے یا قدرتی غاروں میں پناہ لیتے تھے۔ وہ زراعت کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے اور آگ روشن کرنے سے بھی غالباً پوری طرح واقف نہیں تھے۔ وہ مٹی کے برتن بنانا بھی نہیں جانتے تھے اور دھاتوں کے استعمال سے ناواقف تھے۔ وہ شکار کے ذریعہ، یا اخروٹ، قدرتی جڑی بوٹیوں اور پھل پھلار کھا کر زندگی گزارتے تھے۔ ان کے امن کے زمانے کے اوزار اور وحشی درندوں اور خوفناک آبی جانوروں سے جنگ کے لئے ہتھیار پتھر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ہوتے تھے جنھیں وہ بہت بھدے اور بھونڈے انداز میں تراشتے تھے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان اوزاروں اور ہتھیاروں کی بڑی تعداد ایک عجیب اور خاص قسم کی چٹان سے بنائی جاتی تھی جس میں سے اکثر سونا نکلتا ہے۔ جہاں یہ چٹان دستیاب نہیں ہوتی تھی وہاں بے شک دوسرے قسم کا پتھر استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ لوگ لکڑی اور ہڈی کے اوزار بھی بنا لیتے تھے لیکن وہ چونکہ فنا پذیر تھے اس لئے مفقود ہو گئے۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں غالباً جانوروں اور پرندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے تھے۔

نو حجری عہد :

برصغیر میں انسان کے ارتقا کی اگلی منزل وہاں ختم ہوئی، جہاں دوسرے ملکوں کی طرح برصغیر میں بھی پرانے قسم کے بھدے اور بھونڈے ہتھیاروں اور اوزاروں کو قطعی طور پر ترک نہیں کیا گیا بلکہ بہت احتیاط کے ساتھ انھیں سڈول اور چکنا بنایا جانے لگا۔ اس عہد میں چیزیں

Marfat.com

بہتر بننے لگیں جو شکل و صورت میں متنوع تھیں اور مختلف ضروریات پوری کر سکتی تھیں۔ ان نو حجری عہد کے لوگوں نے تہذیب کے میدان میں کافی ترقی کر لی۔ پہاڑوں کی قدرتی پناہ گاہوں میں رہنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی رہائش کے لئے "بانس اور پھوس کی جھونپڑی بناتے اس پر گوبر کرتے تھے۔" وہ آگ روشن کرنا اور کھانا بنانا بھی جانتے تھے۔ وہ مچھلی پکڑتے' شکار کھیلتے اور جانوروں کو پالتے تھے۔ انہوں نے کاشت بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن ان کی غذائیت سادہ تھی جو شکار پھل پھلار' ترکاریوں' دودھ' شہد' اور خود رو اناج پر مشتمل تھی۔ درخت کی پتیوں اور چھال یا جانوروں کی کھال سے وہ اپنا جسم ڈھکتے تھے۔ مٹی کے برتن بھی بناتے تھے۔ شروع شروع میں ہاتھ سے' لیکن بعد میں چاک کا استعمال بھی کرنے لگے' نئے پتھر کے زمانے کے لوگ اپنے آلات حرب ایک دوسرے قسم کی سیاہ رنگ کی آتش فشانی چٹان سے اور روز مرہ کے استعمال کے برتن وغیرہ مختلف رنگ کی دوسری اشیا سے بناتے تھے۔ وہ اپنے مردوں کو باقاعدہ قبر میں دفن کرتے تھے۔ دوسری طرف ایسے مرتبان نما خاک دان دستیاب ہوئے جن میں اس زمانے کے لوگ اپنے مردوں کی خاک محفوظ کر دیا کرتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں مردوں کو جلانے کا دستور بھی پایا جاتا تھا۔ ایسے قرائن بھی ملتے ہیں جن سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ درختوں اور پہاڑوں کی پرستش کرتے تھے اور انہیں راضی رکھنے کے لئے قربانیاں کرتے اور کھانے پینے کی چیزوں کے چڑھاوے چڑھاتے۔ نئے پتھر کے زمانے کی یہ تہذیب برصغیر میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

دھاتوں کا ظہور :

غالباً کئی صدیاں گزر جانے کے بعد نو حجری عہد کے انسان نے دھاتوں کا استعمال سیکھا۔ شاید سونا سب سے پہلی دھات تھی جو اس نے دریافت کی' لیکن شروع شروع میں وہ سونے سے صرف زیور کا کام لیتا تھا۔ وہ اپنے اوزار اور ہتھیار دوسری سخت دھاتوں سے بناتا تھا قدیم تاریخی مقامات سے جو عجیب و غریب اشیاء بہت بڑی تعداد میں دریافت ہوئی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ جنوبی ہند میں پتھر کے زمانے کے فوراً بعد لوہے کا زمانہ آ گیا۔ وہ عہد جن میں ان دھاتوں کا استعمال عام ہوا لوہے کا زمانہ اور تانبے کا زمانہ کہلاتے ہیں۔ بہر حال' یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ برصغیر میں صوبہ سندھ کے علاوہ کہیں اور نئے پتھر کے زمانے اور لوہے کے زمانے کے درمیان کانسے کے زمانے کیکوئی علامات اور نشانیاں نہیں پائی جاتیں۔ کانسہ تانبے اور ٹین کا مرکب ہوتا ہے جسے بھرت بھی کہتے ہیں۔ یہ خالص تانبے سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور ہتھیار بنانے کے لئے بلاشبہ بہتر دھات ہے۔ لیکن قدیم برصغیر کے لوگ اسے نہ جانے کیوں روز مرہ کے استعمال میں نہ لائے۔

دراوڑ سنسکرت کا لفظ ہے۔ دراوڑ لوگ برصغیر کی سب سے پرانی مہذب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ تاریخ کے متعدد عالموں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ دراوڑ لوگ برصغیر کے قدیم ترین

Marfat.com

باشندوں کی اولاد تھے۔ جو وقت کی رفتار کے ساتھ تہذیب کی سیڑھی پر چڑھتے چلے گئے۔ اس کے برخلاف' دیگر ماہرین یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ لوگ تبت کے پلیٹو یا وسط ایشیا میں اپنے وطن مالوف توران سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ بہر حال' مغربی ایشیا کو عام طور پر ان کا مسکن خیال کیا جاتا ہے۔ دراوڑ اور سمیری لوگوں میں جو نسلی ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ اس خیال کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں براہوی بولی کے علاقہ کو نہیں بھولنا چاہئے جو بلوچستان میں دراوڑی زبان کا ایک جزیدہ ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جب ان کی کل جمعیت دروں کے ذریعے برصغیر کی طرف بڑھ گئی تو جو لوگ پیچھے رہ گئے براہوی ان کی زبان ہے۔ دراوڑوں کی اصل جو کچھ بھی ہو یہ بات یقینی ہے کہ دراوڑ برصغیر کی آبادی کا ایک اہم عنصر تھے۔ دراوڑ دھاتوں کے استعمال سے خوب واقف تھے اور ان کے مٹی کے برتن زیادہ سڈول ہوتے وہ زراعت بھی جانتے تھے اور آب پاشی کے لئے دریاؤں پر سب سے پہلے بند باندھنے والے یہی لوگ تھے۔ وہ مکانات بناتے اور پشتے تعمیر کرتے تھے اور ان کی بستیوں پر چھوٹے چھوٹے سردار حکومت کرتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ایل۔ ڈی بارونٹ نے کہا ہے دراوڑی سماج "ایک حد تک ایسا سماجی نظام تھا جس میں عورت سر قبیلہ ہوتی تھی۔" ان کا مذہب نہایت درجہ بھیانک اور گھناؤنا تھا۔ وہ ماتا دیوی اور دوسری ارواح کی پرستش کرتے تھے اور اکثر ظالمانہ انسانی قربانیوں اور علامات تناسل کے ذریعے اظہار عقیدت کرتے تھے۔

معدنیاتی عہد——— وادیء سندھ کی تہذیب :

اب تک ہم تاریکی میں بھٹک رہے تھے۔ تانبے کے عہد میں ہمیں برصغیر میں تہذیب کی ہلکی سی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ پنجاب کے دوسرے مقامات کے علاوہ ہڑپا (ضلع ساہی وال) موہن جو دارو (ضلع لاڑکانہ) مور سندھ (مثلاً" چنہو دارو' جھوکا دارو) اور بلوچستان (جیسے نال' اور ریاست قلات) میں جو حیرت انگیز اثری دریافتیں ہوئی ہیں وہ اس بات کو مکمل طور پر واضح کر دیتی ہیں کہ رگ وید سے چند صدی پیشتر دریائے سندھ کے کنارے ایسے مرکز پائے جاتے تھے جن میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بسنے والے لوگوں کا تہذیبی معیار کافی بلند تھا۔ عراق' ایلم' اور مصر کی معاصر تہذیبوں سے مشابہ بلکہ بعض جہتوں سے ان کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس عہد کو تانبے کے عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی وہ عہد جس میں پتھر کے ہتھیاروں اور برتنوں کا استعمال بھی جاری رہا اور اس کے ساتھ ساتھ تانبے اور پیتل کی اشیاء کا جائزہ لینا ہو گا جو موہن جو دارو میں زمین کے اندر سے برآمد ہوئی ہیں۔ یہ اشیا دوسرے مقامات سے برآمد ہونے والی اشیا سے مماثل ہیں۔ ہو سکتا ہے تصویر دھندلی ہو لیکن اس کا خاکہ کافی ابھرا ہوا ہے۔ اسے ہم وادی سندھ کی تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

محمد ادریس صدیقی نے وادی سندھ پر ایک تحقیقی رپورٹ 1559ء میں شائع کی۔ یہ رپورٹ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ

Marfat.com

بیسویں صدی کے اوائل میں موہن جو دارو اور ہڑپہ کے مقامات پر باقیاتی تفتیش کے بعد ایک نہایت ہی اعلیٰ قسم کی تہذیب کے نشانات دریافت ہوئے ہیں' اور یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ تہذیب تقریباً پانچ ہزار سال قبل کی تہذیب ہے اور مصر' بابل' سمیریا اور اشوریہ کی تہذیبوں کی ہم عصر ہے۔ وادی سندھ کو اس طرح وہی مقام حاصل ہے جو وادی نیل' وادی دجلہ و فرات کو حاصل ہے۔

بستیاں : وادی سندھ کی تہذیب ایک ہزار میل سے زیادہ وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی عملداری بابل سے چار گنے اور مصر سے دو چند وسیع علاقے پر تھی۔ جتنی باقیاتی تفتش آگے بڑھتی ہے اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس وسیع علاقے میں ہزاروں بستیاں آباد رہی ہوں گی لیکن باقیاتی دریافت کے اعتبار سے موہن جو دارو' ہڑپہ' چنو دارو' ستکاجن دور' علی مراد' آمری' دابر کوٹ اور کوٹ ڈیجی بہت اہم ہیں۔

(الف) موہن جو دارو : موہن جو دارو کا مقامی نام "موئن جو دارو"۔ یعنی مرے ہوؤں کا ٹیلہ (Mound of the Dead) ہے۔ کھدائی کرنے والے افراد مقامی زبان سے ناآشنا تھے اور ان کے لئے لفظ موہن میں زیادہ جاذبیت تھی۔ لہٰذا انھوں نے موئن کی جگہ موہن کا لفظ استعمال کیا اور اب یہ لفظ اتنا عام ہو چکا ہے کہ اصلی نام نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

موہن جو دارو ضلع لاڑکانہ میں کراچی کوئٹہ ریلوے لائن پر ڈوکری اسٹیشن سے سات میل دور واقع ہے۔ دریائے سندھ اس کے مشرق میں بہتا ہے۔ کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر اس بستی کا جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہو گا کہ اس بستی میں چھ سات محلے تھے' اور ہر محلہ شمالاً جنوباً 1200 فٹ اور شرقاً و غرباً 800 فٹ علاقے پر مشتمل تھا اور ان محلوں کو وسیع شاہراہیں ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔

یہ شہر شکل و صورت میں جزائر برطانیہ سے ملتا جلتا ہے اور جس طرح بحر آئرلینڈ انگلینڈ کو آئرلینڈ سے جدا کرتا ہے اسی طرح شاید دریائے سندھ کی کسی طغیانی نے اس کے اسٹوپہ ایریا کو دوسرے خطے سے جدا کر دیا ہے اور اب یہ کھنڈرات دو بڑے حصوں یعنی بالائی شہر اور نشیبی شہر میں تقسیم ہیں۔ بالائی شہر میں اسٹوپہ' بڑا حوض' جامعہ یا درسگا اور ستونوں والا ہال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نشیبی شہر میں رہائشی مکانات' دوکانیں' سڑکیں اور گلیاں ہیں۔

اسٹوپہ : یہ بدھ عہد کی عمارت ہے۔ اس کی بلندی اور جاذبیت نے ماہرین آثار قدیمہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس عظیم الشان تہذیب کی دریافت اسی عمارت کی مرہون منت ہے۔ یہ زمین کی سطح سے ستر فٹ بلند ہے۔ اس کا گنبد گر چکا ہے۔ اسٹوپہ کی عمارت وادی سندھ کی قدیم عمارت کے ملبے سے تیار کی گئی ہے۔ چنانچہ جنوب کی طرف جہاں اس کی بنیاد نظر آتی ہے یہ بات بخوبی آشکارا ہوئی ہے کہ بدھ مت کے ماننے والوں نے اس کی تعمیر وادی سندھ کی قدیم

Marfat.com

روایات کے آثار پر کی ہے۔

بڑا حوض : بڑا حوض 29 فٹ لمبا اور 23 فٹ چوڑا ہے۔ یہ حوض وادی سندھ کی تہذیب کے وسطی عہد کی عمارت ہے۔ اس میں اترنے کے لئے شمالا جنوبا سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ حوض سے پانی کی نکاسی کا انتظام بہت عمدہ تھا۔ اس حوض کے چاروں طرف ایک برآمدہ ہے جس کے شمال جنوب اور مشرق میں مختلف کمرے اور دالان ہیں۔ ان کمروں میں سے ایک میں ایک کنواں ہے۔ جس پر دوہری منڈیر تعمیر کی گئی ہے۔ قیاس کیا گیا ہے کہ اس کنویں کے پانی سے حوض بھرا جاتا تھا۔ بڑے حوض کے جنوب میں تھوڑے سے فاصلے پر ایک دو فٹ چوڑی گلی کے دونوں طرف آٹھ غسل خانے بنے ہیں۔

جامعہ یا درس گاہ : مندرجہ بالا آٹھ غسل خانوں اور اسٹوپہ کے درمیان ایک بہت بڑی عمارت ہے جو بڑے حمام کی عمارت سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کی لمبائی 235 فٹ سات انچ اور چوڑائی 75 فٹ پانچ انچ ہے۔ اس کا صدر دروازہ مغرب میں تھا۔ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ یا تو کسی بڑے عالم یا پروہت کا مکان تھا یا کوئی بڑی جامعہ یا درسگاہ تھی۔ اس میں بہت سے کمرے ہیں' ایک بڑا ہال ہے۔ نشیبی شہر میں ہزاروں مکان' لاتعداد گلیاں اور بے شمار کنویں ہیں۔

(ب) ہڑپہ : یہ مقام ضلع ساہیوال سے پندرہ میل دور کراچی لاہور ریلوے لائن کے اسٹیشن ہڑپہ روڈ سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ہڑپہ کا موجودہ نام رگ وید میں بیان کئے ہوئے "ہاری یوپویا" کا مخفف ہے۔ ایک مقام تھا جہاں ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔

ہڑپہ کی کھدائی سے بہت سے دلچسپ چیزیں معلوم ہوئی ہیں جن سے ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے غلے کی کوٹھی' کاریگروں کے کوارٹرس' شہر پناہ اور دو قبرستانوں کی دریافت خاص ہیں۔

کاریگروں کے کواٹرس : یہ مخروطی طرز کے دو رویہ مکانوں کی قطاریں ہیں جو دونوں سروں پر نامکمل ہیں۔ شمالی قطار میں سات اور جنوبی قطار میں آٹھ مکانوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ ہر مکان میں یا تو دو کمرے تھے یا ایک کمرہ اور ایک دالان تھا۔ کوارٹروں کے فرش پختہ تھے۔

بھٹیاں : ان کوارٹروں کے قریب ہی تھوڑی اونچائی پر 16 بھٹیاں پائی گئی ہیں۔ یہ بھٹیاں ناشپاتی کی شکل کی ہیں۔ اور ساڑھے تین فٹ سے لے کر ساڑھے چھ فٹ تک لمبی ہیں۔ غالبا ان میں کوئلہ اور گوبر ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور دھونکنی سے ہوا دے کر آگ سلگائی جاتی تھی۔

Marfat.com

گول چبوترے : بھٹیوں کے شمال میں شکستہ دیواروں اور ٹوٹے ہوئے فرش کے آثار کے درمیان ایک ہی طرز کی اینٹوں کے بنے ہوئے سترہ گول چبوترے بھی ملے ہیں۔

غلے کی کوٹھی : ان چبوتروں کے شمال میں 155 گز کے فاصلے پر دریا کی خشک گذر گاہ کے کنارے 50 فٹ لمبی اور 25 فٹ چوڑی غلے کی 12 کوٹھیاں ہیں۔ ان میں غلہ رکھنے کا رقبہ 955 مربع فٹ ہے اور یہ کوٹھیاں 4 فٹ اونچی کرسی پر تعمیر کی گئی ہیں۔

معاشرت :

موہن جو دارو کی باقیات ہمیں ان لوگوں کے بارے میں کافی معلومات فراہم کرتی ہیں جو اس عالی شان شہر میں رہتے تھے۔

خوراک و زراعت : گیہوں ان کی خاص غذا تھی لیکن جو اور کھجور سے بھی وہ واقف تھے۔ گوشت' مچھلی اور انڈے بھی ان کی غذا کا ایک خاص حصہ تھے۔ ہڑپہ میں مٹر کے جلے ہوئے دانے' تربوز کے بیج اور تل دریافت ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہڑپہ سے دریافت شدہ ایک میز پر ایک ایسی تصویر بنائی گئی ہے جس پر ناریل کے درخت کا گمان ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مہر پر بنی ہوئی تصویر پر انار کے درخت ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ ایک قیاس کے مطابق یہاں گیہوں اور جو کے علاوہ چاول' دالیں' سبزیاں اور کپاس بھی کاشت کی جاتی تھی۔

پالتو مویشی : جو ڈھانچے ملے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بیل' بھینس' بھیڑ' اور اونٹ اور ہاتھی ان لوگوں کے پالتو جانور تھے۔ گھوڑے کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا چوں کہ بچوں کے کھلونوں پر کتوں کی تصویریں پائی گئی ہیں لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کتوں سے واقف تھے۔ گائے اور بکری کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ سمندری مچھلی' گھڑیال' اور کچھوؤں کی لاتعداد ہڈیاں بھی ملی ہیں۔

لباس' آرائش گیسو اور زیورات : وادی سندھ کی سب سے اہم دریافت روئی کے بنے ہوئے کپڑے کا وہ ٹکڑا ہے جو تانبے اور چاندی کے ظروف کے ساتھ پایا گیا ہے۔ یہ روئی کی قدیم ترین دریافت ہے۔ کھدائی کے دوران تقریباً ہر گھر سے سوت کاتنے کی تکلیاں برآمد ہوئیں ہیں۔ جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ امیر و غریب سب فرصت کے اوقات میں سوت کاتا کرتے تھے۔ چونکہ ایک ٹکڑے کے علاوہ اور کوئی کپڑا برآمد نہیں ہوا۔ لہٰذا مجسموں اور برتنوں پر بنے ہوئے نقوش ہی یہاں کے طریق لباس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لباس کی ترتیب اور ڈیزائین سے یہ لوگ بیگانہ نہ تھے۔ بالخصوص نسوانی مجسمے اس قسم کے مطالعے کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ عورتیں عام طور پر ایک زیر جامہ (تہ بند کی طرح کی چیز) پہنتی

Marfat.com

تھیں۔ جس کو کمر پر بٹی ہوئی ڈور' کردھنی یا کمر بند سے اس طرح باندھتی تھیں کہ سامنے کی طرف پھندے کی شکل بن جاتی تھی۔ یہ زیر جامے گھٹنے کے اوپر ہی ختم ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عورتیں ناف سے اوپر کوئی کپڑا پہنتی ہی نہ تھیں۔ عورتوں کے مجسموں اور مہروں پر بنی ہوئی تصویروں کے سر پر پنکھے کی شکل کی ایک پوشش (Fan Shaped Head Dress) بھی نظر آتی ہے۔

مرد معمولی کپڑے پہنتے تھے۔ روسا سوزن کاری کیے ہوئے نقش اور بیل بوٹے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتے تھے۔ لیکن عام پوشاک کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ بعض مجسمے تو بالکل برہنہ ہیں اور بعض میں ستر پوشی کے لئے محض ایک پتلی سے پٹی استعمال کی گئی ہے۔

دھوتی کے استعمال کا اندازہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ ایک قسم کی شال بھی اوڑھا کرتے تھے۔ اونی کپڑوں کے استعمال کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ چونکہ بھیڑ اور بکریوں سے کافی مقدار میں اون دستیاب ہوتا رہا ہو گا۔ لہٰذا یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ وادی سندھ کے مہذب باشندے اونی کپڑا بھی تیار کرتے رہے ہوں گے۔

آرائش گیسو کے معاملے میں یہ لوگ بہت آگے تھے۔ ایک مجسمے میں عورت کے گھنگریالے بال پیچھے کی جانب پڑے ہوئے دکھا ، گئے ہیں۔ بعض نسوانی مورتیوں میں بالوں کی چوٹی گوندھ کر پشت کی جانب ڈال دی گئی ہے۔ کانسے کی رقاصہ کے مجسمے کے بالوں کو یوں آراستہ کیا گیا ہے کہ سامنے کی طرف ایک بل کھاتی ہوئی اونچی لہر بن گئی ہے اور باقی بالوں کی چوٹی گوندھ کر دایاں کان چھپائے ہوئے گردن اور شانے پر ڈال دیا گیا ہے۔ عورتیں بالوں میں موباف اور کنگھی اڑستی تھیں۔ مردوں کے بال سنوارنے کے طریقے مختلف ہیں۔ پروہت کے بال پٹے نما ہیں اور ان کی پیشانی کے درمیان مانگ نکالی گئی ہے۔ ایک مجسمے سے پتہ چلتا ہے کہ بالوں کو گوندھ کر چوٹی بنائی گئی ہے۔ مٹی کے چند دیگر مجسموں میں بالوں کا جوڑا سر کے اوپر چھلے کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ وادی سندھ کے لوگوں میں ڈاڑھیاں کہیں خشخشی ہوتی تھیں تو کہیں لب تراشیدہ۔

وادی سندھ کی خواتین حسن و جمال کی آرائش کے لئے زیورات استعمال کرتی تھیں۔ ہڑپہ اور موہن جو دارو میں سونے چاندی کی ملی جلی دھات' تانبا' کانسا' سیپ' گھونگے' ہاتھی دانت اور کئی قسم کے قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے زیورات دستیاب ہوئے ہیں۔ زیوارات میں ہار کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ کچھ انگوٹھیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ سونے کی کیلیں بھی ملی ہیں۔ دست بند' کنگن اور کڑے بھی کافی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ چوڑیاں پہننے کا بھی عام رواج تھا اور سونے چاندی اور دیگر دھاتوں کی بنی ہوئی چوڑیاں دستیاب ہوئی ہیں۔

کھلونے : لاتعداد کھلونے دستیاب ہوئے ہیں جو مٹی' سیپ' پتھر اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے ہیں۔ مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی گاڑیاں بہ کثرت ملی ہیں۔ کھلونوں میں وہ جھنجھنے خاص طور پر

Marfat.com

دلچسپ ہیں جو گیند کی طرح گول اور اندر سے کھوکھلے ہیں۔ ان کے اندر چھوٹی کنکریاں پڑی ہوئی ہیں۔ جن کے ہلنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ ایسی چڑیاں بھی ملی ہیں جو اندر سے کھوکھلی ہیں۔ مختلف قسم کے جانوروں کے مجسمے بھی دریافت ہوئے ہیں۔

تفریح اور شکار : پانسہ کا کھیل وادی سندھ کے لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا' اور وادی سندھ کے پانسے مٹی اور پتھر کے بنے ہیں۔ موجودہ شطرنج کے پیادوں کی طرح مٹی اور پتھر کے لاتعداد مہرے بھی ملے ہیں۔ موہن جو دارو میں اِس شکل کی ایک اینٹ بھی دریافت ہوئی ہے جو چوسر کی بساط کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ مٹی اور پتھر کی بہت سی گولیاں بھی ملی ہیں۔

وادی سندھ کے لوگ شکار سے بھی بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ ایک مہر پر دو آدمیوں کو تیر کے ذریعے شکار کرتے دکھایا گیا ہے۔ دوسری مہر پر جنگلی بکری کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح سے موہن جو دارو کے ایک مقام پر بہت سے تیر ملے ہیں۔ جن کا شکار میں استعمال کیا جاتا ہو گا۔

رقص و سرور : اس کا ثبوت ایک رقاصہ کا کانسے کا بنا ہوا مجسمہ ہے۔ اسی طرح ہڑپہ سے پتھر کا ایک مجسمہ بھی دریافت ہوا ہے جو عالم رقص میں ہے۔

حکمت : مندرجہ ذیل اشیاء کا پایا جانا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگ طب سے بھی واقف تھے۔ سمندر جھاگ' بارہ سنگھے کے سینگ کے ٹکڑے' استخوان ماہی' مونگے اور نیم کی پتی وغیرہ۔

پیشے : یہاں کے ارباب علم پر وہت' وید' جوتشی اور ساحروں پر مشتمل تھے۔ حکام میں حکومت کے عمال اور بلدیہ کے ملازم تھے۔ ایک تجارت پیشہ قوم بھی آباد تھی۔ بیشتر لوگ صنعت کار اور اہل حرفت میں سے تھے۔ کاشتکار مچھیرے' ملاح' چرواہے' گاڑی بان' گھریلو نوکر' زرگر' کمہار' کھلونے ساز' کٹھیرے' راج' معمار' مزدور' سنگتراش اور مہر تراش لوگوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

بلدیاتی نظام : اس ہمہ گیر ترقی سے اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے کوئی بلدیاتی نظام ضرور قائم رہا ہو گا۔ موہن جو دارو میں پائے جانے والے بڑے ہال کو بلدیاتی ادارہ کا صدر دفتر بھی بتایا گیا ہے۔

قصباتی منصوبہ بندی (Town Planning)

خشت سازی : پاک و ہند کے فن تعمیر کی تاریخ میں وادی سندھ کی اینٹیں اپنی نظیر آپ

Marfat.com

ہیں۔ ان اینٹوں کا حجم 1:1/2:1/2 کی نسبت ہوتا تھا۔ موہن جو دارو اور ہڑپہ میں عام طور پر پختہ اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ اینٹوں کی لمبائی چوڑائی کی دوگنی اور موٹائی چوڑائی کی نصف ہے۔ یہ اینٹیں "1/4-5"x5"x1/4-2 سے لے کر "1/4-25"x1/2-8"x1/2-2 کے مختلف سائز میں بنائی گئی ہیں ان کے علاوہ بڑے سائز کی اینٹیں بھی ہیں جو خاص خاص مواقع مثلاً" نالیوں کے پاٹنے کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ ان اینٹوں کی چنائی مٹی کے گارے سے کی گئی ہے۔

مکانات : موہن جو دارو کے مکانات سادے اور آرام دہ ہیں۔ جن میں خوبصورتی اور ظاہری دکھاوے سے زیادہ پائیداری کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہاں نفاست و نزاکت کے بجائے زندگی کو آرام دہ اور فارغ بنانے پر زور دیا جاتا تھا۔ ان تعمیرات کی بنیادیں کافی گہری اور مضبوط رکھی گئی ہیں۔ عمارتوں کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے مٹی کے چبوتروں کی اونچی کرسی بنائی جاتی تھی۔ کھدائی کے بعد جو عمارتیں دریافت ہوئی ہیں ان کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ یعنی (1) رہائشی مکانات (2) بڑی عمارات جن کا مصرف صحیح طور پر متعین نہیں کیا جا سکا ہے (3) غسل خانے اور حمام۔

رہائشی مکانات کم از کم دو کمروں پر مشتمل ہیں۔ لیکن بعض کافی وسیع و عریض ہیں۔ ان مکانات کی بیرونی دیواریں بالکل سادہ ہیں۔ عام مکانات کا رقبہ 30x27 فٹ تھا۔ جن میں چار یا پانچ کمرے ہوتے تھے۔ بڑے مکانات اس کے دوگنے رقبہ پر تعمیر ہوتے تھے۔ بعض مکانات میں 25' 30 کمروں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ موہن جو دارو کا سب سے بڑا مکان 242 فٹ لمبا اور 112 فٹ چوڑا ہے۔ اس میں کئی صحن ہیں۔ جن کے اطراف رہائشی کمرے اور گودام وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ دروازے غالباً لکڑی کے ہی بنائے جاتے تھے۔ بیرونی دیواروں میں کھڑکیاں شاذونادر ہی ہوتی تھیں۔ بعض مکانات دو منزلہ دس منزلہ ہوتے تھے۔ اوپر کی منزلوں پر جانے والی سیڑھیاں اونچی تپلی اور تنگ ہیں۔

شاہراہیں اور گلیاں : موہن جو دارو کی سڑکیں اور گلیاں شمالاً جنوباً اور مشرقی سمت سے مغربی سمت میں بنائی گئی ہیں۔ یہ سڑکیں ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ (Right Angle) بناتے ہوئے کاٹتی ہیں۔ سڑکیں کافی کشادہ ہیں۔ گلیاں 9 فٹ سے 12 فٹ تک اور کوچے چار فٹ اور اس سے کچھ زیادہ چوڑے ہیں۔ سڑکوں کی چوڑائی 13 فٹ سے لے کر 35 تک ہے۔

کنویں : کنویں موہن جو دارو کی ایک امتیازی خصوصیت ہیں۔ ہزاروں سال پرانے ہونے کے باوجود کیچڑ اور ملبہ نکالنے کے بعد آج بھی نہایت صاف و شفاف اور ٹھنڈا پانی بہم پہنچاتے ہیں۔ کنویں ہر بڑے مکان میں پائے گئے ہیں۔ مکانوں کے علاوہ جگہ جگہ سڑکوں اور گلیوں کے کنارے کنویں بنائے گئے ہیں۔ یہ کنویں اوپر سے نیچے تک پختہ ہیں اور سب کنویں گول ہیں لیکن دو ایک مقامات پر بیضوی (Egg Shaped) کنویں بھی بنے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

صفائی اور نالیاں : وادی سندھ کے باشندے صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شاہراہوں' کنوؤں اور گلیوں سے پانی نکالنے کا جو انتظام موہن جو دارو میں نظر آتا ہے اس کے پیش نظر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہم عصر تہذیبوں میں کوئی بھی قوم اس معاملے میں ان کی پاسنگ بھی نہ تھی تو غلط نہ ہو گا۔ ہر گلی کے دونوں جانب سے مکانوں کا گندہ پانی لانے والی نالیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ نالیاں بڑی نالیوں میں ملتی ہیں۔ ان نالیوں کو ڈھانکنے کا بھی انتظام ہے۔

غسل خانے اور حمام : وادی سندھ کے لوگ غسل کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور غالباً وہ روزانہ ہوئے تھے۔ ان کے فرش پختہ ہوتے تھے۔ ان کی نالیاں سڑک کی نالیوں سے ملتی تھیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بالائی منزل پر بھی غسلخانے پائے جاتے تھے اور نیچے کی منزل تک گندہ پانی نکالنے کے لئے مٹی کے بنے ہوئے پختہ گول پائپ لگے ہوئے ملے ہیں۔

موہن جو دارو میں بعض ایسی عمارتیں بھی پائی گئی ہیں جن پر حمام ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ان عمارتوں کی دیواروں میں جا بجا ایسے نل لگے ہوئے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے گرم پانی پہنچایا جاتا ہو گا۔

یہ بات اب یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قصباتی منصوبہ بندی اور فن تعمیر کی یہ معراج وادی سندھ کے لوگوں کے صدیوں کے تجربوں اور پیہم سعی و عمل کا نتیجہ تھی۔

صنعت و حرفت

کوزہ گری : کوزہ گری کے زیادہ تر نمونے دریائے سندھ کی لائی ہوئی چکنی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ برتن کمہار کے چاک پر بنائے ہیں لیکن بعض برتن ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں۔ مٹی کے برتنوں کو بھٹیوں میں پکایا جاتا ہے۔ چاک پر برتن بنانے اور سکھانے کے بعد ایک خاص قسم کی مٹی سے رنگائی کی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ہلکا بادامی رنگ بنتا تھا۔ بعد میں گھٹائی کرکے انھیں چکنا بنایا جاتا تھا۔ برتنوں پر نقاشی کے لئے سیاہ یا سیاہی مائل سرخ مصالحے بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ برتنوں پر ہرن اور پہاڑی بکروں کی تصویریں بھی بنائی گئی ہیں۔ ہڑپہ کے دریافت شدہ ایک برتن پر ایک آدمی اور بچے کی تصویر بنی ہوئی پائی گئی ہے بعض برتنوں پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے بیضوی دائرے بنائے گئے ہیں۔ برتنوں پر چمکدار سرخ رنگ کی پالش بھی کی جاتی تھی۔ موہن جو دارو میں منقش ظروف کی بہ نسبت سادے ظروف زیادہ تعداد میں پائے گئے ہیں۔ موہن جو دارو اور ہڑپہ میں وہ تمام ظروف دستیاب ہوئے ہیں جو کسی ایسی آبادی کے لئے سوچے جا سکتے ہیں جس کے باشندے سادگی پسند ہوں۔ چنانچہ طرح طرح کے گلدان' آبخورے' کٹورے' صراحیاں' تشتریاں' ہانڈیاں' سامان رکھنے کے مٹکے' آرتی تھال اور ناندیں وغیرہ کافی تعداد میں پائے

Marfat.com

گئے ہیں۔

تانبے اور کانسے کا سامان : مٹی کے برتنوں کے علاوہ تانبے اور کانسے کی بنی ہوئی لاتعداد چیزیں دریافت ہوئی ہیں۔ مثلاً" برتن' کلہاڑیاں خنجر' چاقو' برچھے' کٹار' تیر' درانتی' مجسمے' چوڑیاں اور انگوٹھیاں وغیرہ۔

اسلحہ اور اوزار : وادی سندھ کے اسلحہ جات اور اوزار پتھر' تانبے' اور کانسے کے بنائے گئے ہیں۔ یہ اوزار زیادہ مضبوط' مفید اور عمدہ نہیں ہیں۔ اور ان سے لڑ کر کوئی جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ البتہ دفاع کے لئے ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسلحہ اور اوزاروں میں نیزے کے پھل' تیر و کمان' برچھے' گرز' بسولے' کدال' کلہاڑیاں' تیشے کثیر تعداد میں ملے ہیں۔ دریافت شدہ اسلحے میں کئی قسم کے استرے بھی ملے ہیں۔ اور اوزاروں میں کانسے کی بنی ہوئی آری بھی ملی ہے۔ جو ساڑھے 16 انچ لمبی ہے۔

سنگتراشی : موہن جودارو اور ہڑپہ میں تقریباً گیارہ مجسمے ملے ہیں۔ ان میں سے تین جانوروں کے اور چار انسانوں کے ہیں۔ انسانوں کے مجسموں میں سب سے زیادہ اہم پروہت یا پجاری کا مجسمہ ہے۔ جو سات انچ لمبا ہے۔ جانوروں کے مجسموں میں چھوٹے سینگوں والے بیل کا مجسمہ خاصا اچھا ہے۔

وادی سندھ کے باشندوں کی کامیاب ترین تخلیق مہریں (Seals) ہیں جو مہنجو دارو اور ہڑپہ میں تقریباً پانچ سو ملی ہیں۔ یہ مہریں مربع شکل ہیں جن پر جانوروں کی تصویریں اور تصویری تحریر (Pictrocraphic Writing) کندہ ہے۔ بڑی مہروں پر جانوروں کی شبیہیں بہت خوبصورتی سے تراشی گئی ہیں۔ ایک مہر پر بنے ہوئے بیل کی تصویر سنگتراشی کا بہترین نمونہ ہے۔

دوسری صنعتیں : وادی سندھ کے لوگ مختلف دھاتوں کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ لوگ تانبے کانسے' پتھر اور مٹی کے اوزار' برتن اور دوسری ضروریات زندگی بنانا بخوبی جانتے تھے۔ مہریں ان کی خاص تخلیق تھیں جو صناعوں کی فنی مہارت پر دلالت کرتی ہیں۔ سونا چاندی کے کام میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سوزن کاری' کٹاؤ کی صنعت اور ... تانے سے بھی واقف تھے۔ زیورات اور برتنوں پر چمک دمک پیدا کرنے کے ... جاج (شیشہ) مردار سنکھ استعمال کرتے تھے۔ وادی سندھ کے لوگ سوتی کپڑے استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ کشیدہ کاری اور زردوزی سے بھی واقف تھے۔ تانبے اور کانسے کی بہت سی سوئیاں (Needles) ملی ہیں۔ وادی سندھ کے قدیم شہروں میں مختلف پتھروں' سونے چاندی اور مٹی کے منکے بنانے کی صنعت کا بہت رواج تھا۔

مواصلات و تجارت

Marfat.com

مواصلات : قدیم ترین زمانے میں موہن جو دارو ایک تجارتی منڈی تھا اور یہاں آس پاس کے علاقوں اور دوسرے ممالک سے تجارتی سامان لایا جاتا تھا۔ موہن جو دارو اور ہڑپہ اور دوسرے مقامات سے لاتعداد بیل گاڑیوں کے مجسمے ملے ہیں جو بچوں کے کھیلنے کے لئے بنائے گئے ہوں گے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اپنے دور کی اصل بیل گاڑیوں کا چربہ ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وادی سندھ میں سامان اور آدمی لانے اور لے جانے کے لئے بیل گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق اونٹ گھوڑے اور گدھے بار برداری کے خاص جانور تھے بیل گاڑیوں اور جانوروں کے علاوہ یہاں کشتیوں کے ذریعہ بھی سامان لایا جاتا تھا۔

تجارت : دریافت شدہ اشیاء کے متعلق ایک اندازہ کے مطابق سونا جنوبی ہندوستان اور ایران' چاندی جنوبی ہندوستان' ایران اور افغانستان۔ تانبہ جنوبی ہند' افغانستان' بلوچستان اور راجپوتانہ۔ لاجورد افغانستان۔ فیروزہ ایران و خرآسان سے درآمد کئے جاتے تھے۔ ان معدنیات کے علاوہ زیورات اور چھوٹی مصنوعات میں استعمال کی جانے والی اشیاء۔ مثلاً ہڈیاں' ہاتھی دانت' سیپ اور گھونگے مقامی طور پر بھی ملتے تھے اور درآمد بھی کئے جاتے تھے۔ لاجورد میسوپوٹامیہ میں کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگ وہاں سے درآمد کرتے ہوں۔

موہن جو دارو اور ہڑپہ اور دوسرے مقامات پر پتھروں سے نہایت ہی صفائی کے ساتھ بنائے ہوئے ٹکڑے ملے ہیں جو غالباً وزن کرنے کے باٹ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

رسم الخط : وادی سندھ کے لوگوں کا رسم تصویری نشانات پر مشتمل تھا اسے آج تک پڑھا نہیں جا سکا ہے۔ دریافت شدہ زیادہ تر تحریریں بہت مختصر ہیں۔ چنانچہ سب سے بڑی تحریر صرف سترہ حروف پر مشتمل ہے۔ وادی سندھ کے رسم الخط کو تصویری رسم الخط (Pictographic system of Writing) کہا گیا ہے۔ چند مخصوص الفاظ اور علامات سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ رسم الخط دائیں جانب سے بائیں جانب لکھا جاتا ہو گا۔ لیکن چند کتبے ایسے بھی ملے ہیں جن سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ مہروں پر دو سطروں میں عبارت کندہ ہے اوپر والی سطر دائیں سے بائیں جانب اور نیچے کی سطر اسی تسلسل میں بائیں سے داہنی جانب لکھی گئی ہے۔ موجودہ رسم الخط سے تقریباً 396 نشانات اخذ کئے گئے ہیں۔

وادی سندھ کا مذہب

Marfat.com

وادی سندھ کے لوگوں کا مذہب اصنام پرستی' اشجار پرستی' حیوان پرستی اور چند دوسرے عقائد پر مبنی تھا۔

اصنام پرستی : وادی سندھ میں ایک ایسی دیوی کا مجسمہ عام طور پر پایا گیا ہے جو ستر پوشی کے لئے کمر کے گرد کپڑے کی لپٹی ہوئی ایک پٹی کے علاوہ تقریبا عریاں دکھائی دیتی ہے۔ ان مجسموں کے گلوں میں زیورات کی بھر مار ہے۔ ان کے سروں پر پنکھے کی طرز کا ایک انوکھا پہناوا ہے۔ عام طور پر ایک ماتا دیوی کے عقیدے کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے ہی ایک عقیدے کا پتہ ہڑپہ کی ایک چوکور مہر سے ملتا ہے۔ ماتا دیوی (ماردراض) کے ساتھ وادی سندھ میں ایک دیوتا بھی ملتا ہے۔ جس کو سرجان مارشل نے شیو کے مماثل کہا ہے۔ ایک مہر پر اس کی شبیہ بالکل واضح شکل میں ملتی ہے۔ اس کے تین چہرے ہیں۔ وہ ایک نیچی چوکی پر یوگ آسن سے بیٹھا ہے۔ اس کی رانیں اور پنڈلیاں ملی ہوئی ہیں۔

اشجار پرستی : وادی سندھ میں اس قسم کے کافی ثبوت ملتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ درختوں کو متبرک خیال کرتے تھے اور ممکن ہے ان کی پرستش بھی کرتے ہوں اس کا اندازہ مہروں پر بنے ہوئے نقوش سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مہر کے دائیں جانب اوپر کے گوشہ میں زمین پر ایک تھالے میں پیپل کی دو شاخیں نکلی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ ان دونوں شاخوں کے درمیان ایک دیوی کی تصویر ہے۔ جس کے سر پر سینگ ہیں اس کے سامنے ایک دوسری عورت سر بسجود دکھائی گئی ہے۔

حیوان پرستی : وادی سندھ میں اشجار پرستی سے زیادہ حیوان پرستی کا رواج تھا۔ جس کا پتہ مہروں پر جانوروں کی نقاشی اور مٹی اور پتھر کے مجسموں سے چلتا ہے۔ جانوروں میں ایک سینگ والے بیل' کوہان والا بیل' گینڈا' شیر اور ہاتھی جیسے جانور تھے جن کی بے شمار شکلیں اتاری گئی ہیں' اور مورتیاں بنائی گئی ہیں۔ اس بات کے شواہد بھی ملے ہیں کہ یہ لوگ سانپ یعنی ناگ دیوتا کو بھی متبرک مانتے تھے۔ ہڑپا میں سانپ کی ایک بہت واضح تصویر ملی ہے۔ اس کے علاوہ مہروں پر بھی سانپ کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ یہ لوک فاختہ کو بھی متبرک مانتے تھے۔

طرز تدفین : ہڑپہ میں کئی قبرستان بھی برآمد ہوئے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ لاشوں کے ہمراہ ظروف' منکے' سیپ کے چمچے' ہاتھی دانت کے ٹکڑے وغیرہ بھی زاد راہ کے طور پر دفن کئے گئے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق مذکورہ بالا مکمل تدفین کے علاوہ لاشوں کو فضا میں چھوڑ دیا جاتا تھا جہاں وہ سڑ گل کر خراب ہو جاتیں یا انھیں جلا دیا جاتا تھا اور ان کی راکھ کو کسی برتن میں رکھ کر دفن کر دیا جاتا تھا۔

یہ لوگ کون تھے؟ : ڈھانچوں کے باقیات نیز مجسموں کے سروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ

Marfat.com

ہڑپا اور موہن جو دارو کی آبادی ہر رنگ و نسل کے لوگوں پر مشتمل تھی جس میں چار مختلف اور واضح نسلیں پائی جاتی تھیں۔ یعنی اصلی آسٹرو لائڈ' بحر روم والے' لپی اور منگول۔ ان چاروں میں سے کون سے نسل وادی سندھ کی تہذیب کی واقعی بانی تھی؟ اس سوال کے متضاد جوابات دیئے گئے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ اہل سندھ ویدک دور سے قبل کی کسی نسل سے تعلق رکھتے تھے (غالبا دراوڑ) جن کی تہذیب کو آریوں نے تباہ کر دیا۔ بعض عالم خود آریوں کو اس تہذیب کا بانی سمجھتے ہیں اور آریوں کے ہندوستان میں اقتدار کی تاریخ کو کافی پیچھے لے جاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اہل سندھ سامری یا ان سے ملتی جلتی کسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اہل سندھ کی انفرادیت کے باوجود بعض ایسی خصوصیات وادی سندھ ایلم اور سمیری تہذیب میں مشترک ہیں جس سے بلا شبہ اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔ تمدنی شہادتیں اور دلائل جن کی نوعیت طبعی ہے وہ بہر حال بہت کمزور ہیں اس لئے تاوقتیکہ ہمیں کچھ اور محکم اشارے دستیاب نہ ہو جائیں ہم اس مسئلے میں کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے۔

حدود اور اصل : موہن جو دارو اور ہڑپا کے علاوہ جو دیگر اثری دریافتیں ہوئی ہیں۔ وہ ظاہر کرتی ہیں کہ شمالی اور جنوبی سندھ (مثلا جھوکر دارو' چھودارو) جنوبی پنجاب اور بلوچستان (مثلا ریاست قلات میں نال) وغیرہ کے دوسرے مقامات اسی تانبے کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ جس نے آگے چل کر برصغیر کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں اہم رول ادا کیا۔ تو پھر وادی سندھ کی تہذیب کی اصل کیا ہے؟ کیا سرزمین ہند پر یہ کوئی خود رو پیداوار تھی؟ یا ایلمی' عراقی یا دوسری قدیم مغربی تہذیبوں کے زیر اثر اس کا نشوونما ہوا؟ اس ناکافی معلومات کے پیش نظر ان سوالات کا کوئی مسکت جواب دینا آسان نہیں۔

تاریخ : ہم ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ یہ تہذیب وادی سندھ میں کتنے عرصے پھلی پھولی ان طبقات کو چھوڑ کر جو زمین کے اندر پانی کی تہ میں غرق ہو گئے موہن جو دارو کی عمارتوں میں سات طبقے زمین کے اندر برآمد ہوئے ہیں۔ ان طبقات میں ایک طبق عہد قدیم کا ہے' تین متوسط دور کے اور تین آخر کے زمانے کے۔ ان طبقات سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اگر ہر طبق کے لئے 500 سال کی مدت متعین کی جائے تو اس تہذیب کی مدت 3250 سے لے کر 2750 ق-م تک قرار دی جائے گی۔ چونکہ موہن جو دارو کی متنوع شہری زندگی صدیوں کے ارتقائی عمل کا نتیجہ تھی اس لئے اس کی ابتدا کی تاریخ کا تعین اس سے بھی پہلے کرنا پڑے گا۔ دوسرے وادی سندھ کی دریافتوں کا ایلم و عراق کی دریافتوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دونوں میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ محض اتفاقی نہیں ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے جیسا کہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ان ملکوں اور وادی سندھ کے درمیان آمدورفت اور روابط تھے تو یہ بات یقین کی حد تک طے ہو جائے گی کہ وادی سندھ کی تہذیب' قدیم سمیری تہذیب اور طوفان نوح سے پہلے کی عراق ایلم کے آخری دور کی تہذیب کی معاصر تھی۔

Marfat.com

باب 2

ابتدائی ویدک عہد میں تہذیب اور کلچر

(EARLY VIDIC CIVILIZATION AND CULTURE)

تہذیب کا جھٹ پٹا آہستہ آہستہ تہذیب کی صبح میں تبدیل ہو گیا اور ویدی کلچر کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ تاریخ برصغیر کے افق پر چمکنے لگا۔ آریائی کے مورث کون تھے۔ ہمارے تاریخی حدود میں وہ کہاں سے ابھر کر داخل ہوئے؟ اس قسم کے سوالات نے گمراہ کن تاریخی اختلافات پیدا کر دیئے۔ بعض پاک و ہند کے عالموں نے پرانوں کی شہادت پر یہ رائے قائم کی ہے کہ آریہ برصغیر کے اصلی اور سب سے قدیم باشندے ہیں لیکن ان کے دلائل کو عالموں کی عام تائید حاصل نہیں ہو سکی۔ دیگر علما اتنے ہی زور کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ آریوں کا اصلی وطن وادیٔ قطب شمالی تھا یا باختر تھا یا یورپ تھا۔ بہر حال عام خیال یہ ہے کہ آریہ نیز اوستا کے دور کے ایرانی' قدیم ہندی جرمنوں (ہندی یورپیوں) کی ایک شاخ ہیں یا دور ہیں۔ مشرق کی جانب انتقال آبادی سے قبل ان کا مسکن ایک طویل عرصے تک مشترک رہا جسے میکس مولر نے وسط ایشیاء کو' پنکے نے بحر اسود کے شمال میں روس اور سائبیریا کے شمالی میدانوں کو' گیلز نے مغربی اور وسطی جرمنی کو' پاپلی گاٹاٹن نے آسٹریا' ہنگری اور بوہیمیا کو قرار دیا ہے۔ انتقال آبادی کا باعث یا تو یہ ہوا کہ وہ گروہوں میں بٹ گئے' ان میں آپس میں چپقلش پیدا ہو گئی اور اختلافات شروع ہو گئے' یا ان کے مسکن کے محدود علاقے میں ان کی آبادی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ اس عقیدہ کی بنیاد ایک تو یہ ہے کہ رگ وید اور اوستا کی زبان میں اور ہندی جرمنی بولیوں میں جو یورپ کی بیشتر قومیں استعمال کرتی ہیں' قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کچھ بھی تھوڑا بہت ہمیں ان کے متعلق معلوم ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کلچر نیز ان کا نباتات و حیوانات کا علم یکساں تھا۔ لسانی مماثلت اور زندگی کی مشترک خصوصیات بہر حال ان کی خاندانی یگانگت کا کوئی محکم ثبوت نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ باتیں ایسی ہیں جنھیں ایک قوم دوسری قوم سے بھی حاصل کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں علم بشریات کی تحقیقات بھی ہمیں کوئی خاص مدد نہیں پہنچاتی۔ ان سے بس یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ برصغیر میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو جسمانی ساخت کے اعتبار سے یورپ کی بعض نسلوں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے' اس طرح حالانکہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ برصغیر کی رگوں میں یورپ کا خون موجزن ہے' پھر بھی یہ قابل قیاس ہے کہ برصغیر کے آریہ کسی نہ کسی منزل میں اہل مغرب کے اسلاف سے قطعی طور پر علیحدہ نہیں تھے۔

Marfat.com

رگ وید :

قدیم ترین کتاب جو آریوں نے آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑی ہے رگ وید ہے اس میں حمد ثنا کی 1017 نظمیں یا مناجاتیں ہیں۔ ان میں 11 نظموں کا بعد میں اضافہ کیا گیا ہے جنھیں دال کھبلیہ کہتے ہیں انھیں دس منڈیوں یا کتابوں میں باقاعدہ ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ نظمیں مختلف زبانوں کی تصنیف ہیں اور مختلف زبانوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کا ادبی معیار بھی مختلف ہے۔ انھیں مختلف خانداوں کے شاعر پنڈتوں نے تصنیف کیا ہے جن میں سے اکثر مرد ہیں اور دو یا تین عورتیں۔ سوائے چند نظموں کے باقی سب دیوتاؤں کے حضور مناجاتیں ہیں۔ جن میں قدرتی طاقتوں کو دیوتاؤں کو روحانی اور مادی برکتوں سے نوازیں۔ صرف وہ مناجاتیں جن میں دیوتا مخاطب نہیں ہیں ایسی ہیں جو راجاؤں کی فیاضی اور قبائلی خانہ جنگیوں' نیز عوام کی زندگی اور عادات پر تھوڑی بہت روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ معلومات بے شک ناکافی ہیں لیکن اس جہت سے بے حد قیمتی ہیں کہ معلومات کا کوئی اور ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے جو ہمیں اتنے قدیم زمانے کی ہلکی سی جھلک بھی دکھا سکے۔

رگ ویدی آریوں کا جغرافیائی پس منظر :

رگ وید میں کوئی اشارہ آریوں کے ابتدائی نقل و حرکت کی طرف نہیں ہے اور نہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برصغیر میں کیونکر داخل ہوئے۔ البتہ بعض تلمیحات سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا جغرافیائی حدود اربعہ اس علاقے تک محدود تھا جو افغانستان سے لے کر وادی گنگا تک پھیلا ہو تھا۔ بعض دریاؤں کے نام اس میں آتے ہیں مثلاً" کوبھا (کابل)' سواستو' (سوات)' کرومو' (کرم) اور گومتی (گومل)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان ان کے زیر اثر تھا اور یہی ان کا مسکن تھا۔ سندھو کا وسیع و عریض دھارا (دریائے سندھ) اس کے پانچ معاون دریا۔ وتستا (جہلم) اسکنی (چناب)' پردشنی' بعد ازاں ارادتی (راوی) وپاشا(بیاس) اور ستدری (ستلج) سے ہر شخص واقف ہے۔ اسی طرح درس دوتی (چوتنگ) کا ذکر آیا ہے۔ لیکن سرس وتی جو اب خشک ہو گئی ہے' بہت سے موثر گیتوں کی محرک ہے۔ ان حوالوں سے بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ آریہ ان دریاؤں سے سیراب ہونے والے تمام علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور اسی علاقے میں انھوں نے رگ وید کی بیشتر نظمیں تصنیف کیں۔ دریائے گنگا اور دریائے یمنا (جمنا) کا ذکر صرف دو یا تین جگہ آیا ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ حالانکہ آریوں کے جتھے گنگا کے دو آبے تک پہنچ گئے تھے پھر بھی یہ ان کے لئے اب تک ایک اجنبی علاقہ تھا۔ سمندر سے وہ لوگ بالکل ناواقف تھے۔ انھوں نے سمدر کا لفظ پانی سے ڈھکے ہوئے بڑے بڑے علاقوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ ہمالیہ یا ہموت پہاڑ کی طرف رگ وید میں اشارہ ہے لیکن وندھیا چل یا دریائے نربدا کا کوئی ذکر ان میں نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آریوں نے جنوب کی جانب

87050

Marfat.com

بستیاں بسانی نہیں شروع کی تھیں۔ مندرجہ بالا خیال کی تائید میں دیگر شہادتیں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر رگ وید میں شیر کا ذکر ہے لیکن چیتے کا کوئی ذکر نہیں ہے جو بنگال کے مرطوب جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ رگ وید میں چاول کا بھی ذکر نہیں ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آریہ مشرقی علاقوں کی طرف ابھی نہیں بڑھے تھے۔ لیکن اس قسم کے دلائل پر غیر معمولی زور دینا احتیاط کے خلاف ہے۔ اس میں خطرہ ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ شمالی پنجاب میں نمک کی بہتات ہے اور رگ وید میں نمک کا کسی ایک جگہ بھی ذکر نہیں ہے۔

قبائلی تقسیم اور لڑائیاں :

رگ ویدی آریہ سب کے سب ہم جنس و یک رنگ لوگ نہیں تھے۔ وہ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے اہم پانچ متحد قبیلے تھے۔ انو' دروہ یو' یادو' توردس' اور پورو' جو سرسوتی کے جانبین میں آباد تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور قبیلوں کا ذکر آتا ہے۔ بھرت (جو بعد میں کردوں میں ضم ہو گئے۔ ترت شو' سر کرئی دئی اور دوسرے چھوٹے چھوٹے قبیلے۔ اکثر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے رگ ویدی تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ پرشنی کے مقام پر گھسان کی لڑائی ہوئی جس میں بھرتوں کے راجہ سودا نے دس راجاؤں کے متحد قبیلوں کو وشوامتر کی رہنمائی میں زبردست شکست دی۔ ان کے خاندانی پروہت وششٹھ نے اس فتح کا جشن منایا' لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ سودا نے اپنی فتوحات کو متحد یا منظم کیا یا نہیں۔ ان پانچ متحدہ قبیلوں اور شمالی مغربی قبائل یعنی الین' پکتھ (موجودہ پختون یا پٹھان) سیو بھلانس اور وشانن کے حملے کے فورا بعد سودا کو اپنی سلطنت کے مشرقی گوشے سے ایک اور خطرہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سودا بہر حال' دریائے جمنا کے کنارے اپنے ان دشمنوں کو جو بھیدا کی قیادت میں لڑ رہے تھے شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ بھیدا کے ماتحت جو تین قبیلے تھے۔ آج' سگرو' اور یاک شو' ان کے عجیب و غریب ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر آریائی سردار تھا۔ اس طرح اپنی باہمی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ آریہ "داسیوں" یا "داسوں" سے بھی مصروف کار زار رہے۔ یہ لڑائیاں بڑے بہیمانہ انداز میں ایک عرصے تک جاری رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں قومیں بڑے اختلافات رکھتی تھیں جو سماجی بھی تھے اور نسلی بھی۔ آریہ لوگ لمبے اور گورے تھے' اور "دسیو" کالے اور پست قد۔ ان کے خدوخال بھدے تھے اور ناک چپٹی (انسہ) تھی۔ وہ دیوی دیوتاؤں پر ایمان نہیں رکھتے تھے (اری وایو) بلکہ ان پر سب و شتم کرتے تھے۔ (دیولی یو)' اور نہ قربانیاں کرتے تھے۔ (آ گیہ ون) اور نہ اور رسوم (آرمن) بجا لاتے تھے۔ اس کے برخلاف وہ لنگ پوجا کرتے تھے۔ (شیشن دواہ) کا قانون انوکھا تھا (الیہ ورتہ) اور ان کی بولی سمجھ میں نہ آتی تھی (مردھیرواک) ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ "داسیو" غالبا دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے اور اس علاقہ میں آباد تھے جس پر آریہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ "داسیو" لوگوں نے اپنے مکانات اور جانوروں کی حفاظت کے لئے مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا لیکن جب ان

Marfat.com

کے پور اور درگ (ان کے شہر اور قلعے) تباہ ہو گئے اور ان کی قوت مقاومت نے بالکل جواب دے دیا تو انھوں نے آریوں کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیئے۔ بہت سے داسیو فاتحین کے داس (غلام) بن گئے۔ جنہیں بعد میں سماج میں شودر کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا لیکن بہت سے جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔

سیاسی تنظیم :

کنبہ (گریہہ یا کل) ویدی ریاست کی اصلی بنیاد تھی۔ کئی کئی کنبوں سے جو برادری کے بندھنوں میں منسلک ہوتے تھے مل کر گرام بنتا تھا اور کئی کئی گراموں سے مل کر ایک وش (ضلع، جرگہ) بنتا تھا اور کئی وشوں سے مل کر جن یا قبیلہ کی تشکیل ہوتی تھی۔ پورا قبیلہ ایک سردار یا راجن کے ماتحت ہوتا تھا جو اکثر موروثی ہوتا تھا جیسا کہ رگ وید کے ان اشلوکوں سے ظاہر ہوتا ہے جن میں یکے بعد دیگرے کئی وارثوں کا ذکر آیا ہے۔ کبھی کبھی وش کے لوگ راجن کا انتخاب بھی کرتے تھے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ یہ انتخاب حکمراں خاندانوں تک محدود تھا یا دوسرے شریف خاندانوں میں سے بھی راجن کو چنا جا سکتا تھا۔ لڑائی میں فوج کی قیادت راجہ کرتا تھا وہ ان لوگوں کے جان و مال کا محافظ ہوتا تھا جس کے عوض لوگ اس کی اطاعت کرتے تھے اور تحفے تحائف اس کی نذر کرتے تھے۔ غالبا راجہ اس وقت ریاست کے اخراجات کے لئے کوئی مقررہ کریا ٹیکس باقاعدہ وصول نہیں کرتا تھا۔ جب جنگ سے فراغت پاتا تو امن کے زمانے میں وہ انصاف کرنا اور مادی خوشحالی کے لئے قربانیاں دیتا پروہت سینانی (فوج کا سردار) اور گرامنی راجہ کے حاشیہ نشینوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ پروہت کو بھی تحفے ملتے تھے اور وہ تمام مہموں میں راجہ کی کامیابی کے لئے منتر پڑھ کر اور افسوں پھونک کر دیوتاؤں سے دعا کرتا تھا۔ راجہ مکمل طور پر مطلق العنان نہیں ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات کا دار و مدار رعایا کی مرضی پر تھا۔ جس کا اظہار سبھا (بزرگوں کی کونسل) سمیتی (کل جنتا کی اسمبلی) میں ہو جاتا تھا۔ ریاستیں عام طور پر چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں۔ لیکن باہمی لڑائیوں اور "واسیوں" سے خطرے کے باعث اب رجحان بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک بڑے سردار یا مہاراجہ کے تحت سب ریاستیں آجائیں یا ریاستوں کے علاقے کو بڑھا کر وسیع کر لیا جائے۔

خانگی زندگی :

رگ ویدی آریوں کی خانگی زندگی کافی خوشگوار تھی۔ وہ ازدواجی زندگی کے لئے بندھنوں کو مضبوط رکھتے تھے اور انھیں مقدس سمجھتے تھے۔ عام طور پر ایک شادی کے اصول کی پابندی کی جاتی تھی۔ لیکن "بالائی درجہ" کے درمیان کثرت ازدواج بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ چند شوہری اور بچپن کی شادیوں کے آثار نہیں ملتے۔ عورتیں اپنے شوہروں کے انتخاب میں کافی حد تک آزاد تھیں۔ شادی کے بعد وہ شوہر کے زیر امن و عافیت کی زندگی گزارتی تھیں۔ ان کی

Marfat.com

عزت اور ان کے اختیارات اس زمانے میں آج کل کی عورتوں کے مقابلے میں شاید زیادہ تھے۔ وہ گھریلو رسموں میں شرکت کرتی تھیں۔ عورتوں کو علیحدہ رکھنے کا کوئی رواج اس زمانے میں نہیں تھا' اور نہ عورتوں کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی تھی۔ عورتیں تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور بعض مثلاً ایالا' وشوورا' گھوشا' رشیوں کی طرح منتر تصنیف کرتی تھیں۔ اخلاقی معیار نسبتاً بلند تھا۔ لیکن کہیں کہیں اخلاقی پستی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

زن وشو کے علاوہ کنبے میں اور افراد بھی شامل ہوتے تھے۔ والدین' بہن بھائی' اور بیٹے بیٹیاں وغیرہ۔ عام طور پر کنبے کے باہمی تعلقات میں خلوص' یگانگت اور تعاون کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ بعض اوقات' بہر حال مال' خاص کر زمین' جانور اور زیورات وغیرہ سے متعلق معاملات پر آپس میں نزاعات ہو جاتے تھے جس کے نتیجے میں رنجشیں پیدا ہو جاتی تھیں اور کنبہ ٹوٹ کر منتشر ہو جاتا تھا۔

پیشے :

آریہ ہمیشہ مسلسل جنگ وجدال میں مصروف رہتے تھے جنگ و جدال بھی در اصل ان کا ایک پیشہ ہی تھا۔ وہ پیدل لڑتے تھے یا رتھوں میں جنھیں گھوڑے کھینچتے تھے' لیکن گھوڑے کی سواری کے قطع نظر رگ وید میں سواروں کے رسالے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ دھات کے بنے ہوئے خود اور زرہ بکتر (ورم) وہ میدان جنگ میں اپنی حفاظت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ان کے خاص ہتھیار یہ تھے۔ کمان (دھنش) اور تیر (بانڑ) بھالہ' نیزہ' کھاڑی' تلوار (اسی) اور گوپھن۔ سپاہی جنگ کے نعروں اور ڈھولوں (ڈن ڈبھی) کے تال اور سر کے سہارے لڑتے تھے۔

رگ ویدی آریوں کی معاش کا ایک اہم ذریعہ جانور پالنا تھا وہ ایک بڑی تعداد میں گائیں پالتے تھے اور اسی پر ان کی دولت اور خوشحالی منحصر تھی اور اسی کو وہ اپنی "فلاح و بہبود کا حاصل" سمجھتے تھے۔ اس جہت سے ہم اس بات کا بڑی آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی گایوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے کتنے خواہشمند رہتے تھے۔ ان کے پالتو جانوروں میں گھوڑا' بھیڑ' بکری' کتا اور گدھا بھی شامل تھے۔

آریوں کا تیسرا پیشہ زراعت تھا۔ معلوم ہوتا ہے ہل چلانے کے وہ بہت پہلے سے عادی تھے۔ کرش کی جڑ ایک ہی معنی میں سنسکرت اور ایرانی دونوں زبانوں میں نمایاں طور پر استعمال ہوا ہے۔ ہل میں بیل جوتے جاتے تھے۔ ہل کی پھالی دھات کی بنی ہوئی تھی۔ جس سے کھیت (کشیتر) میں نلائی (سیتا) کا کام لیا جاتا تھا۔ کھیتوں میں نالیوں کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا تھا۔ یوا (غالباً جو) اور دھانیہ وہ اناج تھے جن کی وہ کاشت کرتے تھے جب اناج پک جاتا تو درانتی سے کاٹا جاتا' پھر گہائی ہوتی' پھر ہوا میں بھوسا اڑا کر غلے کو صاف کرنے کے بعد گوداموں میں اسے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔

رگ ویدی آریہ شکار سے بھی شغف رکھتے تھے۔ تفریح کی غرض سے بھی اور معاش کے

Marfat.com

لئے بھی پرند اور جنگلی جانوروں کو جال (پاشا) میں پھانستے تھے یا بعض اوقات تیر کمان سے ان کا شکار کر لیتے تھے۔ ہرن، شیر اور دوسرے درندوں کو پکڑنے کے لئے وہ گڑھے بھی کھودتے تھے۔

مچھلی کے شکار کا رگ وید میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ رگ ویدی آریہ دریاؤں میں تو کشتیاں چلاتے تھے جو بہت بھدی اور بھونڈی ہوتی تھیں لیکن رگ وید میں کہیں لنگر، بادبان یا جہازی بیڑے کا کہیں ذکر نہیں آتا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی کھلے سمندروں میں جہاز رانی کی کوشش نہیں کی۔

تجارت :

سکے کے استعمال سے بھی یہ لوگ نا واقف تھے۔ اس لئے تجارت مبادلے کے ذریعے ہوتی تھی۔ گائے کی قیمت معیار سمجھی جاتی تھی۔ ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چیزوں کا مول تول ہوتا تھا۔ لیکن سودا ایک بار طے ہو جاتا تو لوگ اس پر قائم رہتے تھے۔

زندگی چونکہ سادہ بالکل ابتدائی منزل میں تھی اس لئے لوگوں کی ضروریات بھی بہت مختصر تھیں اور بہ آسانی پوری ہو جاتی تھیں۔ لیکن یہ ثابت کرنے والی اسناد کم نہیں ہیں کہ خاص خاص پیشوں میں لوگ خصوصی مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ ویدی سماج میں لکڑی کا کام کرنے والا مزدور اہم مقام رکھتا تھا اس کے سبب یہ تھا کہ اسکی خدمات جنگ یا دوڑ میں کام آنے والے رتھ بنانے کے سلسلے میں زیادہ درکار ہوتی تھیں۔ ایک ہی آدمی بہ یک وقت بڑھئی بھی ہوتا تھا، متفرق چھوٹی موٹی مرمت کا کام بھی وہی کرتا تھا اور پہیے وہی بناتا تھا۔ اس کی ہنر مندی کا مقابلہ ویدی شعرا کی فنکاری سے کیا جاتا تھا۔ ویدوں میں ہم دھات کا کام کرنے والوں کا ذکر سنتے ہیں جو ہتھیار، ہل کے پھال، کیتلیاں اور دوسرے گھریلو برتن بناتے تھے۔ دھات کے لئے ویدوں میں ایس نام آیا ہے (لاطینی میں آئیس) جس سے مطلب تانبے، کانسے، یا لوہے سے ہو سکتا ہے۔ سنار خوشحالی اور امیر لوگوں کی خوشنودی کے لئے سونے کے زیورات تیار کرتے تھے۔ چمڑا کمانے کا ذکر بھی ویدوں میں آتا ہے۔ یہ لوگ چمڑا کماتے اور دوسری چیزیں مثلاً" کمان کے لئے تانت اور لکڑی کے پیپے بنتے تھے۔ سینے پرونے اور گھاس پھوس اور بینڈ کی چٹائیاں اور کپڑا بننے کا کام اکثر عورتیں انجام دیتی تھیں۔ سب سے زیادہ قابل ذکر بات ہے کہ رگ ویدی دور میں ان تمام کاموں میں سے کسی کو پست نہیں سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ بعد میں ہو گیا۔ اور یہ سب کام قبیلے کے تمام آزاد لوگ انجام دیتے تھے۔

لباس :

رگ وید میں لباس سے متعلق اتفاقیہ طور جو تلمیحات آ گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ایک اندر کا کپڑا (نی وی)، ایک دوسرا کپڑا اور لبادہ پہنتے تھے، کپڑا بننے کے لئے بھیڑ کی اون استعمال کی جاتی تھی۔ کپڑوں پر زردوزی کا کام ہوتا تھا اور امیر لوگ اسے رنگوا لیتے تھے اور

Marfat.com

دریاں' مالائیں' پچھیاں اور جوشن پہن کر اپنی آرائش کرتے تھے۔ بالوں میں تیل ڈالا جاتا اور کنگھی کی جاتی تھی۔ عورتیں چٹیاں گوندھتی تھیں۔ بعض مرد بھی بالوں کی کنڈلی سروں پر رکھتے تھے۔ داڑھی مونڈھنے کا رواج بھی تھا' لیکن عام طور پر لوگ داڑھیاں رکھتے تھے۔

غذا :

رگ ویدی آریہ غذا میں گوشت اور ترکاریاں دونوں استعمال کرتے تھے بھیڑ اور بکرے کا گوشت بے تکلفی سے کھایا جاتا تھا' اور دیوتاؤں کی نذر کیا جاتا تھا۔ تہواروں کے موقع پر یا دعوتوں میں چر بیلے بچھڑے کو بھی ذبح کیا جاتا تھا' لیکن گائے کو اس سے پہنچنے والے فوائد کے خیال سے "اگھنیا"۔ ناقابل ذبیحہ سمجھا جاتا تھا۔ دودھ ان کی خوراک کا خاص جزو تھا دودھ سے بننے والی چیزوں میں گھی اور دہی کا استعمال عام تھا۔ اناج کو پیسا جاتا تھا اور آٹے میں دودھ اور گھی ملا کر روٹیاں بنائی جاتی تھیں۔ خوراک میں ترکاریاں اور پھل بھی شامل ہوتے تھے۔

مشروبات :

محض پانی اور دودھ ان کے ذوق کی تسکین کے لئے کافی نہیں ہوتے تھے وہ جوشیدہ شرابوں کے بھی عادی تھے۔ مذہبی تقریبات میں سوم ان کا بڑا مرغوب مشروب تھا۔ لیکن سورا جسے ناج سے کشید کیا جاتا تھا معمولی شراب کی حیثیت رکھتی تھی۔ پروہت اور پجاری اس کے استعمال کو نشہ آور ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے۔ بعض اوقات شراب جرائم کا باعث ہوتی تھی جن کی اس عہد میں کوئی کمی نہیں تھی۔

تفریحات :

رگ ویدی بے کیف دبے رنگ زندگی نہیں گذراتے تھے وہ کھیل کود اور رنگ رلیوں کے شوقین تھے۔ خوشی کے موقعوں پر ناچ گانا ہوتا تھا۔ ناچ میں اکثر سادگی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے آلات موسیقی میں ڈھول (ڈن ڈبھی) جھانجھ' ستار (کرکری) اور بانسری شامل تھے یہ لوگ گانے کے بھی شوقین تھے کیونکہ آگے چل کر سامن گیتوں سے ہمیں اس فن کی آئندہ ترقی کے بارے میں کسی حد تک واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ گھوڑ دوڑ اور رتھوں کو دوڑ بھی ان کی تفریحات میں شامل تھیں لیکن پانسے کے ذریعہ جوا کھیلنا مقبول عام تفریح تھی۔ باوجود یہ کہ جوے میں لوگ اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے تھے اور انہیں تباہی و بربادی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا پھر بھی جوئے بازی کے اڈے پر لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور لوگ جوق جوق اس کی طرف کھنچکر آتے تھے۔

مذہب :

اگرچہ رگ وید کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں کا وجود پایا جاتا ہے پھر بھی وہ ایک بہت صاف اور سادہ مذہب ہے۔ یہ بات فطری ہے۔ کیونکہ رگ وید کی تمام مناجاتیں رشیوں کی طویل

Marfat.com

عرصے کی کوششوں کا نچوڑ ہیں اور مختلف قبیلوں کے دیوتاؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بیشتر چیزیں جن سے وہ عقیدت رکھتے تھے وہ ہیں جو قدرتی طاقتوں کے مادی جسم ہیں۔ حسب ذیل عنوان سے ان کے دیوتاؤں کی تقسیم کی جا سکتی ہے۔ (1) ارضی دیوتا' جیسے پرتھوی' سوم' اگنی' (2) فضائی دیوتا' جیسے اندر' وایو' ترت پرجینا (3) سماوی دیوتا' جیسے ورن' دیاؤس' اشون سوریہ' سوتری' متر' پشن اور وشنو۔ ان میں آخری پانچ سورج کی عظمت کے مختلف روپ ہیں ان سب دیوتاؤں میں ورن کا مقام سب سے بلند ہے اور اکثر مناجاتوں میں اس کی تعریف و توصیف کی گئی ہے وہ آسمان کا دیوتا ہے اور اسی کے ساتھ ریت کا تصور وابستہ ہے' جو نظام کائنات اور ضابطہ اخلاق کا مظہر ہے۔ اس کے بعد اندر شمار میں آتا ہے جو گرج اور چمک کا دیوتا ہے' جس کے رعب و جلال کی توصیف شعر کا دوسرا محبوب موضوع ہے۔ وہ بارش لاتا ہے اور زمین کی خشکی دور کرتا ہے' اس کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی جب آریہ ان علاقوں کی طرف بڑھ گئے جہاں بارشیں طوفانی اور موسمی ہوتی ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دیوتاؤں کی کوئی درجہ وار ترتیب وجود میں آرہی تھی۔ مختلف زمانوں میں شعرا نے مختلف دیوتاؤں کو فضیلت دی کیونکہ ان کا مقصد مختلف مالکوں کے منشا اور ضرورتوں کو پورا کرنا تھا۔ رگ وید میں مجرد دیوتاؤں کا بھی ہے۔ جیسے سردھا (عقیدہ) اور منیور (اشتعال) اور دیویوں میں اشاس (تڑکے کی دیوی) عمدہ شاعری کی محرک ہے۔ ان دیوتاؤں کو راضی رکھنے کے لئے دعائیں پڑھی جاتیں' قربانیاں کی جاتیں' اور دودھ گھی' ناج اور گوشت وغیرہ کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ آخر الذکر پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا تاکہ پجاریوں کو مسرت اور خوشحالی نصیب ہو۔ رگ وید کی بعض مناجاتوں میں ایک دیوتا کو دوسرے دیوتاؤں سے ممتاز کرنے یا دو دو کے جوڑوں میں (مثلاً" ریا واتر تھوی) پیش کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور آگے چل کر شعرا توحید کے اس عظیم الشان عقیدہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ "دانشوروں نے دیوتاؤں کو الگ الگ پیش کیا ہے' ورنہ سب کے سب دیوتا ایک ہی ذات ہیں۔

ویدی ادب کی ابتدا :

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ رگ وید کی مناجاتوں کی یا اس تہذیب کی جن کی وہ نمائندگی کرتی ہیں تاریخ کیا ہے۔ جیسکوبی اور تلک علم ہیئت کی مدد سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں' کہ رگ وید کی مناجاتیں حضرت عیسیٰ سے چار ہزار سال پیشتر تصنیف ہوئی تھیں۔ لیکن اس رائے کو عام طور پر قبول نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف میکس مولر نے بدھ کی مشہور تاریخ کی بنیاد پر حساب لگایا ہے۔ بدھ کا مذہب برہمن مت کا رد عمل تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ تمام ویدی ادب پہلے سے موجود تھا۔ میکس مولر نے ویدی ادب کو چار عصروں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر عصر کے ارتقاء کی مدت 200 سال قرار دی ہے۔ سوتر (600-200 ق-م) براہمن' آرنیک اور اپ نشد (600-800 ق-م) منتر (1000-800 ق-م) اور چھند (1200-1000 ق-م) اور اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ 1200 سے لے کر 1000 ق-م وہ عہد ہے جس میں ویدی نظموں کی

Marfat.com

تصنیف شروع ہو گئی تھی۔ میکس مولر کی اس دلیل میں خامی یہ ہے کہ انھوں نے ہر عصر کے ارتقا کے لئے 200 سال کی مدت قرار دی ہے۔ یہ مدت من مانی ہے۔ بغاز کوئی میں جو حالیہ دریافتیں ہوئی ہیں ان سے استدلال کی ایک نئی راہ نکل آئی ہے۔ یہاں کچھ کتبے دریافت ہوئے ہیں جن میں ہیٹوں اور متانی کے راجاؤں کے درمیان عہد ناموں کا ذکر ہے۔ ان کتبوں سے ظاہر ہے کہ ایشیائے کوچک میں ویدی دیوتاؤں کی پرستش کم از کم 1400 ق-م میں جاری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ہمیں ذرا مختلف نتائج برآمد کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ اس سے آریوں کی مشرق کی جانب نقل مکان کی نشان دہی ہوتی ہے۔ دوسرے ماہرین ویدی دیوتاؤں کی خصوصیات کے پیش نظر اس کے قائل ہیں کہ ان کتبوں سے برصغیر آریوں کی مغرب کی جانب ہجرت کا سراغ ملتا ہے حقیقت کچھ بھی ہو' یہ بات طے ہے کہ تل الامرنا میں جو کتبے دریافت ہوئے میں وہ بغاز کوئی کے کتبوں کے ہم عصر ہیں۔ ان کتبوں میں بھی سنسکرت کے نام جیسے ارت تا ماتس رتا متانی کے راج کماروں کے لئے آئے ہیں۔ بعض کسی راجہ بھی جو بابل میں 1746 سے 1180 ق-م تک حکمراں رہے اس قسم کے نام رکھتے تھے جیسے خوریہ (سنسکرت سوریہ) اور مبری تاس (سنسکرت مرتس) وغیرہ۔ ان تمام شواہد کے پیش نظر امکانی سہو کی چھوٹ دیتے ہوئے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ویدی شاعری اور تہذیب کی ابتداء سولھویں صدی ق-م میں ہو چکی تھی۔

رگ ویدی اور وادی سندھ کی تہذیبوں کا مقابلہ :

اس مقام پر رگ ویدی تہذیب اور وادی سندھ کی تہذیب میں جو فرق ہے اس کی وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہو گی۔ ہندی آریہ اب تک گاؤں میں رہتے تھے۔اور رہائش کے لئے بانس اور پھوس کی جھونپڑیاں بناتے تھے جن میں غسل خانے اور کنویں ہوتے تھے اور پانی کی نکاسی کا باقاعدہ انتظام ہوتا تھا۔ رگ ویدی آریوں کو سونا' تانبہ' کانسہ' اور غالباً لوہا وغیرہ دھاتیں معلوم تھیں۔ اہل سندھ نے لوہے کے کوئی آثار نہیں چھوڑے۔ وہ سونے سے زیادہ چاندی کا استعمال کرتے تھے اور ان کے برتن پتھر کے' جو عہد حجری کی یادگار ہے' نیز تانبے اور کانسے کے بنتے تھے۔ جنگ کے ہتھیار دونوں زمانوں میں یکساں تھے' لیکن دماغ کے لئے خود اور زرہ بکتر رگ ویدی لوگ استعمال کرتے تھے' وادی سندھ کے لوگ اس سے ناآشنا تھے۔ بے شمار مہریں جو موہن جو دارو سے دریافت ہوئی ہیں ظاہر کرتی ہیں کہ بیل ان کے نزدیک اہم ترین جانور تھا۔ رگ ویدی عہد میں بیل کی جگہ گائے نے لے لی۔ اہل سندھ گھوڑے سے ناواقف تھے۔ جبکہ رگ ویدی عہد میں گھوڑے کو پالتوں بنا لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وادی سندھ میں لنگ پرستی رائج تھی۔ رگ وید میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وادی سندھ کے لوگ لکھنے سے واقف تھے اور ان کا فن کافی ترقی یافتہ تھا۔ لیکن رگ ویدی عہد اس قسم کا کوئی واضح ثبوت بہم پہنچانے سے قاصر ہے کہ آریوں نے اس میدان میں بھی کوئی ترقی کی تھی۔ یہ مابہ الامتیاز نکات یہ ثابت

Marfat.com

کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ان دونوں تہذیبوں میں کس قدر وسیع خلیج حائل تھی۔ یہ بات صرف وقت کا تفاوت ہی ظاہر نہیں کرتی بلکہ دونوں فرقے ایک مورث تھے یا دوسرے ان کی اولاد جیسی مشکل میں ڈالنے والے ہیں۔ رگ ویدی اور سندھی تہذیبوں کی الگ الگ خصوصیات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے بس ایک ہی فرضیہ قرین قیاس ہے' اور وہ یہ کہ آریہ بعد میں آئے اور وہ اہل سندھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اصل جداگانہ تھی اور ان کا تہذیبی ارتقا بالکل علیحدہ اور آزادانہ طور پر ہوا۔

○باب 3

ویدک تہذیب و کلچر' آخری عہد میں

(LATER VEDIC CIVILIZATION AND CULTURE)

ویدی عہد کے آخری دور کے لئے جو انداز 600 ق-م تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں مذہبی کتب یعنی یجروید' سام وید' اتھروید' براہمنوں' آرن یکوں اور اپ نشدوں کے متن تھاؤں کا سہارا لینا ہو گا۔ اس عہد میں آریائی تہذیب رفتہ رفتہ مشرق اور جنوب کی طرف پھیل گئی۔ برصغیر کا شمالی مغربی علاقہ' جو رگ ویدی قبیلوں کا مسکن تھا اب غیر اہم ہو جاتا ہے۔' یہاں تک کہ وہاں بسنے والوں کے رسم و رواج بھی ناپسند کئے جانے لگتے ہیں' تہذیب کا مرکز اب کرک شیتر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور مدھیہ دیش یعنی گنگا اور جمنا کا علاقہ' اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ کوشل (اودھ) کاشی اور ودیہا (شمالی بہار) یعنی اب مشرق میں آریوں کے بڑے بڑے مرکزوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مگدھ (جنوبی بہار) اور آنگ (جنوبی مشرقی بہار) کا ذکر بھی ان کتابوں میں آتا ہے' باوجودیکہ ان علاقوں میں ابھی تک، آریائی تہذیب کے اثرات پوری طرح مرتب نہیں ہوئے تھے اور وہاں کے باشندوں کو اب تک اجنبی سمجھا جاتا تھا۔ اب ہم اہل آندھرا اور دوسرے خانہ بدوش قبیلوں مثلاً" بنگال کے پنڈ راوں' اڑیسہ اور سی-پی کے سبروں اور جنوبی مغربی برصغیر کے پلندوں کا حال پہلی بار سنتے ہیں۔ دور بھایا برار کا ذکرا تیریہ اور جیمنی براہمنوں کی آخری دو عبارتوں میں آتا ہے۔ اس طرح قریب قریب تمام شمالی برصغیر ہمالیہ پہاڑ سے لے کر وندھیا چل' بلکہ اس سے بھی آگے تک آریوں کے زیر اثر آگیا تھا۔

مسکونہ زندگی : یہ ثابت کرنے کے لئے کافی شہادتیں موجود ہیں کہ بڑے بڑے شہر اب وجود میں آگئے تھے۔ اور لوگ اب ایک جگہ رہ کر اطمینان و سکون کی زندگی گذرتے تھے۔ مثال کے طور پر ہم کام پیلیا اور آسندی ونت کا حال سنتے ہیں جو علی الترتیب پنچالوں اور کردوں کی راجدھانیاں تھیں۔ کوشاہی اور کاشی کے بھی جابجا حوالے آتے ہیں آخر الذکر آج بھی ایک بڑا شہر ہے۔

قبائلی جتھے : مندرجہ بالا تبدیلیوں کے علاوہ ہم ایک قابل ذکر تبدیلی مختلف قبیلوں کی نسبتی اہمیت میں پاتے ہیں۔ رگ وید کے بھرتوں کی حیثیت ایک طاقتور سیاسی اکائی کی اب نہیں رہتی۔ ان کی جگہ اب کرو اور ان کے ہمسایہ حلیف' پنچال لے لیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھرت اور پروکردوں میں ضم ہو گئے۔ پنچال بھی ایک مخلوط قبیلہ تھا۔ جیسا کہ اس کے نام پینچ بمعنی

Marfat.com

پانچ سے ظاہر ہے۔ ست پتھ براہمن کی سند سے' پنچال پہلے کری وی کہلاتے تھے جو ہو سکتا ہے ان جرگوں میں شامل ہوں جن پر پورا قبیلہ مشتمل تھا ان میں شاید سب سے قدیم' انو' دروہیو اور تروس تھے جو اب تاریخ میں معدوم ہو گئے ہیں۔ یہ تینوں بھی اس جتھے بندی میں شامل تھے۔ کروؤں اور پنچالوں کو ان کتابوں میں شائستگی اور خوش گفتاری کے لئے مثال میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے راجہ مثالی حکمراں اور ان کے برہمن اپنے علم و فضل کے لئے ممتاز تھے۔ وہ (کرد اور پنچال مل کر) مناسب موسم میں فوجی مہمیں سر کرتے اور اپنی قربانیاں تمام جزویات کا خیال رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے انجام دیتے تھے۔ ان کے قریب ترین پڑوسی مدھیہ پردیش میں جمنا کے کنارے والے سلو واش ٹی نر تھے۔ انھوں نے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ سرگیہ ایک اور قبیلہ کے لوگ تھے جو کروؤں میں شامل تھے کیونکہ ایک وقت میں ان دونوں کا پروہت ایک تھا۔ ان مذہبی کتابوں سے ہمیں متسیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جو موجودہ جے پور اور الور کے آس پاس بسے ہوئے تھے۔

طاقتور ریاستوں کا عروج :

قبیلوں کی آمیزش اور توسیع سلطنت کے لئے لڑائیوں کے نتیجے میں اس زمانے میں رگ ویدی عہد کے مقابلے میں زیادہ بڑی بڑی علاقائی اکائیوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ "اقتدار اعلیٰ یا عالمگیر حکومت" کا مثالی تصور سیاسی میدان میں ابھر کر سامنے آگیا؟ اور حکمران اپنے حوصلہ اور خواہش کے مطابق اپنی فتوحات کے مدارج متعین کرنے کے لئے "واج پیا" راج سویا "آشو میدھ" جیسی قربانیاں انجام دینے لگے۔ اتیریہ اورست پتھ برہمنوں میں ایسے راجاؤں کے نام آتے ہیں جنھوں نے "آیندبو ہنا بھیشک"۔ جیسے کوشل کے پار' ستانیک' ساتر جیت' اور پرو کتس ایکش ورک وغیرہ کے ساتھ "آشومیدھ" یگیہ کیا۔ جیسے جیسے حکمرانوں کے حدود سلطنت میں اضافہ ہوتا گیا' ان کے القاب بھی بدلتے رہے اس طرح معمولی حکمران کے لئے راجہ کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور ادھی راج' اج دھیراج' سمراٹ' وراٹ' ایک راٹ اور سارو بھوم وغیرہ اصطلاحیں حکمرانوں کے مختلف مدارج ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔

راجہ :

جب بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آگئیں تو شاہانہ شان و شوکت میں بھی اضافہ ہو گیا مذہبی کتابوں میں "پرتنھا" (نیاز نذر) کی رسم کو جو اہمیت دی گئی ہے اور اس کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس رسم میں حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدہ دار خصوصیت کے ساتھ شرکت کرتے تھے' جیسے پروہت' راجن (امرا) مہیش' (بڑی ملکہ)' سوت (رتھ بان یا گویا شاعر؟)' سیناپتی سپہ سالار) گرامنی (گاؤں کا مکھا)' بھاگ دکھا (ٹیکس وصول کرنے والا) سنگرہی (حاجب) (خزانچی) کش ورپ (جوئے کا نگراں) وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

راجہ جس کا عہد اب موروثی ہو گیا تھا اب بھی جنگ میں فوج کی سپہ سالاری کرتا تھا لیکن چھوٹی موٹی مہموں کی نگرانی سیناپتی کے سپرد کر دی جاتی تھی۔ راجہ بدمعاشوں کو سزائیں دیتا اور قانون اور دھرم کا بول بالا رکھتا۔ تمام زمین اس کی ملکیت تو نہ تھی البتہ اس کے اختیار میں ضرور تھی، اور وہ اپنے اختیار سے کسی بھی شخص کو زمین سے محروم کر سکتا تھا۔ اس اختیار کے استعمال میں ذرا سی بھی غلطی عام آدمی کو بڑی مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔ عوامی مجلسیں جیسے سبھا اور سمتی ابھی بالکل معدوم تو نہیں ہوئی تھیں البتہ ان کا ذکر اس عہد میں بہت کم سننے میں آتا ہے۔ حدود سلطنت میں وسعت کے باعث ان کے جلسے کم منعقد ہوتے ہوں گے اور اس لئے راجہ کی جو روک تھام یا مزاحمت وہ کرتی تھیں ان میں رفتہ رفتہ کمی آ گئی ہو گی۔ بہر حال رائے عامہ کبھی کبھی غالب رہتی تھی۔ اس طرح دشارتو' نامی راجہ کو اس کی غیر مطمئن رعایا نے برطرف کر دیا لیکن بعد میں وہ استھاپتی چکر کے ذریعے اپنی گدی پر بحال ہو گیا۔

سیاسی تقسیم اور واقعات :

بدقسمتی سے برہمنوں کے دور میں آریوں کی سیاسی تقسیم اور حالات کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناکافی ہے۔ پروہتی ادب میں جو اتفاقیہ طور پر لطیفے آ گئے ہیں اور رزمیہ نظموں اور پرانوں میں جو مبہم سے اشارے ادھر ادھر مل گئے ہیں ان سے ہم کچھ تاریخی معلومات اخذ کر سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کرو اب سے اہم قبیلہ تھا اور پنچال ان سے بہت قریبی وابستگی رکھے تھے۔ کروؤں کا پہلا راجہ جس کا ذکر اتھروید میں کیا گیا ہے پر یکشت نامی تھا اس کے عہد حکومت میں رعایا سکھ چین کی زندگی گزارتی تھی اور اس کی ریاست میں "دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں" اندازا یہ ریاست جدید تھانیسروی اور شمالی دو آبہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی راجدھانی آسنڈی وست تھی جو بعد میں ہستناپور کہلائی۔ دوسرا مشہور راجہ جن مے جے تھا جو براہمنوں کی سند سے ایک بڑا فاتح تھا اور اس کی ریاست شمال میں ٹیکسلا تک پھیل گئی تھی۔ مہا بھارت شہادت دیتی ہے کہ وہ کبھی کبھی وہیں دربار کیا کرتا تھا اور ویش پاین سے کرو اور پانڈو کی باہمی رقابت کا حال سنا کرتا تھا۔ اس نے ایک سرپ ستر (سانپ کی قربانی) اور دو گھوڑے کی قربانیاں (آشومیدھ یگیہ) انجام دیں۔ آگے چل کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جن مے جے کا برہمنوں سے کچھ مناقشہ ہو گیا اور اس کے تینوں بھائیوں' بھیم سین اگر سین اور سرت سین کو برہمنوں کو مار ڈالنے کے کفارہ کے طور پر آشومیدھ یگیہ کرنا پڑا۔ جن مے جے کے جانشینوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ حکومت کو بعض آفات ارضی و سماوی کا مقابلہ کرنا پڑا جیسے ژالہ باری ٹڈیوں کا حملہ وغیرہ اور آخر کار ہنچک شو' نے گنگا میں سیلاب آنے کی وجہ سے ہستناپور کو چھوڑ کر کوشامبی کو راجدھانی بنا لیا۔

پنچال کے بارے میں ہماری معلومات اس سے بھی کم ہے۔ اس کے بعض راجاؤں نے ضرور اہم فتوحات حاصل کیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آشومیدھ یگیہ کیا جو اس بات کا

Marfat.com

ثبوت ہے کہ ان کی سیاسی طاقت بڑھ گئی تھی۔ اپ شدوں میں پرواہن جے وی کا ذکر آتا ہے جو علوم کا سرپرست تھا اور اپنے دربار میں علمی اور عقلی مقابلے کرانے کا شوقین تھا ان علمی مجلسوں (پری شدوں) میں مباحثے اور مذاکرہ کے اصول پر عمل ہوتا تھا اور معاملے کے ہر پہلو پر غور و فکر کے بعد حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس قسم کے اجتماع لوگوں کو غور و فکر پر مجبور کرتے تھے اور علم و دانش کی توسیع و ترقی میں مدد دیتے تھے۔ پنچال کی راجدھانی کام پلیہ تھی اور ان کی ریاست اندازاً موجودہ ضلع فرخ آباد اور روہیلکھنڈے کے بعض حصوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

کروؤں کے زوال کے بعد ودیہہ کی اہمیت بڑھ گئی۔ ودیہہ موجودہ ترہت سے مطابقت رکھتی تھی۔ اس کی راجدھانی متھیلا کا کوئی ذکر ویدی ادب میں تو بالکل نہیں ہے' البتہ بعد کے ادب میں وہ ایک مشہور و معروف شہر نظر آتا ہے اس علاقے نے ویدی تہذیب کی روشنی کوشل کے بعد حاصل کی جیسا کہ ست پتھ براہمن میں ودیگہ ماتھو کے قصے سے ظاہر ہے۔ ودیہہ کا مشہور راجہ جنک تھا جسے اپ شدوں میں عالم و فلسفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس نے کروؤں کی راجدھانی کی تباہی کے تھوڑے عرصے بعد عروج حاصل کیا۔ اکبر کی طرح وہ فلسفیانہ مباحثوں کی ہمت افزائی کرتا تھا اور یاگتیہ و لکیہ جیسے نامور عالم و دانشور اس کے دربار کی زینت بنے ہوئے تھے۔ جنک کو سمراٹ کہا جاتا تھا اور اس کی طاقت اور شہرت کاشی کے اجات شترو کے لئے باعث حسد بن گئی تھی۔

آخر الذکر راجہ برہم دت سلسلے سے تعلق رکھتا تھا۔ برہم خاندان سے پہلے کاشی پر وہ خاندان حکومت کرتا تھا جس کا نسبی تعلق پرورد سے تھا جو بھرتوں کا مورث تھا۔

دوسری مشرقی ریاست کوشل تھی جو غالباً موجودہ اودھ سے مطابقت رکھتی تھی اور آلیس داکر خاندان کے زیر نگیں تھی۔ ایک طویل عرصے تک آریائی تہذیب کی مشرقی سرحدی ریاست رہی' سدانیرا (گندک) کو اس کے بعد یاد کیا گیا اس کی قدیم رجدھانی اجودھیاں تھا جو رزمیہ نظم کے ہیرو رام کا بھی صدر مقام تھا۔

دوسری ہم عصر طاقتیں جن کا ذکر براہمنوں اور اپ شدوں میں آتا ہے۔ حسب ذیل تھیں: گندھارا' جو دریائے سندھ کے دونوں جانب پھیلی ہوئی تھی' اس کے خاص خاص شہر ٹکسیلا (ضلع راولپنڈی) اور پشکراوتی (موجودہ چار سدہ' پشاور) تھے۔ کیکیا' یعنی گندھارا اور دریائے بیاس کا درمیانی علاقہ مدار خاندان' جن کا علاقہ وسط پنجاب میں موجودہ سیالکوٹ اور اس سے متصل علاقے سے مطابقت رکھتا تھا۔ متیہ جو الور کے کچھ قصبے اور جے پور اور بھرت پور پر مشتمل تھا اسی نروں کا علاقہ جو مدھیہ دیس میں واقع تھا۔ ان ریاستوں میں انتظام حکومت اچھا تھا۔ رعایا خوشحال تھی' اور آزادی کے ساتھ امن کے زمانے کے کاروبار اور فنون میں مصروف تھی اسی کے ساتھ' اس قسم کے لغو مبالغوں کو بھی اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ رشوپتی

Marfat.com

نے دعویٰ کیا جیسا کہ چھاند یوگ اپ شد میں درج ہے کہ اس نے تمام چوروں‘ شرابیوں‘ بدمعاشوں اور ان پڑھوں کو اپنی ریاست سے نکال باہر کر دیا تھا مگدھ اور انگ پر اب تک حقارت کی نظر پڑتی تھی۔ اتھر وید کی ایک عبارت میں اس علاقے کے لوگوں کو بخار کی بد دعا دی گئی ہے۔ اہل مگدھ کو نفرت کے ساتھ وراتیہ کہا گیا ہے یعنی وہ لوگ جو برہمنوں کے قدیم عقیدے کے دائرے سے باہر تھے اور عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی زبان بولتے تھے۔

معاشرتی تبدیلیاں :

سماج اس عہد میں ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس میں شک نہیں کہ چار طبقوں میں تقسیم کا ذکر رگ وید کے آخری دور کی ایک نظم میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے کہ یہ اشارہ آریہ اور داسیو کے واضح فرق کے علاوہ ذات پات کی باقاعدہ گروہ بندی سے کوئی مماثلت رکھتا ہے یا نہیں۔ اب یہ گورہ بندی زیادہ واضح ہو گئی اور ذات پات کی تقسیم کا باقاعدہ تصور نکھر کر سامنے آنے لگا۔ بدقسمتی سے اس تبدیلی کے اسباب تاریکی میں ہیں۔ ان امتیازات کی ابتدا دراصل گورے آریوں اور کالے داسیوں کے "رنگ کے فرق" سے ہوئی۔ لیکن آریوں کی مسلسل لڑائیوں‘ سیاسی ماحول اور زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور مختلف پیشوں میں مخصوص مہارت حاصل کرنے کے رجحان کے نتیجے میں پیشہ ور گروہ رفتہ رفتہ موروثی ہوتے چلے گئے۔ اس طرح وہ لوگ مقدس کتابوں کا علم رکھتے‘ قربانیوں (یگیوں) میں پروہت کے فرائض انجام دیتے تھے اور تحفے تحائف قبول کرتے تھے‘ برہمن کہلانے لگے۔ جو لوگ جنگ کرتے‘ زمینوں پر قبضہ رکھتے اور سیاسی طاقت کا استعمال کرتے‘ انھیں چھتری (کشاتریہ) کہا گیا۔ عوام‘ تجارت پیشہ لوگ‘ زراعت کرنے والوں او ر کاریگروں کی ویش کا نام دیا گیا۔ شودھن سے نیچ کام متعلق کر دیے گئے تھے۔ مفتوح و محکوم واسیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس عہد میں ذاتوں میں غیر فطری قسم کا کٹرپن نہیں پیدا ہوا تھا جو بعد میں آنے والے دور میں پیدا ہو گیا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ چیان ایک برہمن رشی نے ایک چھتری سریات کی لڑکی سکنیا سے شادی کی۔ چھتری حکمرانوں مثلاً ودیہہ کے جنک‘ کاشی کے اجات شترو اور پنچال کے پرواہن جیولی نے برہمنوں کے علم میں امتیاز حاصل کیا‘ اور راجکمار دیواپی نے اپنے بھائی سان تنو کے لئے یگیہ کی رسم ادا کی۔ جیسے جیسے برہمنوں کی مقامی تفریق پسندی اور اثرات بڑھتے گئے ذات پات میں جو لچک پائی جاتی تھی اس میں کمی آنے لگی اور پیشے میں تبدیلی یا پیشے کے معاملے میں تلون مزاجی کو ناپسند کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ مختلف ذاتوں میں ہونے والی شادیوں کی اولاد نے جسے ذلیل سمجھا جاتا تھا‘ علیحدہ گروہوں کی شکل اختیار کر لی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح کہ جو لوگ اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر کوئی نیا ذریعہ معاش یا پیشہ اختیار کر لیتے وہ بھی ایک علیحدہ گروہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ سماج الگ تھلگ ذاتوں کا ایک ایسا عجیب و غریب مجموعہ بن گیا جو از روئے قانون نہ آپس میں شادیوں کر سکتی تھیں نہ ایک دستر

Marfat.com

خوان پر بیٹھ کر کھا پی سکتی تھیں۔ ذاتوں کے بارے میں تفصیل آگے دی جا رہی ہے۔

شودروں اور عورتوں کا درجہ :

شودروں کی حیثیت آخری دور کے ویدی ادب میں بہت واضح دکھائی دیتی ہے لیکن انھیں ناپاک سمجھا جاتا تھا اور قربانیوں میں ان کی شرکت یا مقدس کتابوں کی تلاوت ان کے لئے قطعاً ممنوع تھی۔ آریہ شودروں سے شادی یا ناجائز تعلقات کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شودر اپنے نام سے کسی جائداد کے مالک نہیں ہو سکتے تھے۔ حقیقت یہ کہ اتیریہ براہمن میں ایک مقام پر شودروت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے وہ کسی کا ملازم ہے جسے جب جی چاہے نکال دو اور جب جی چاہے مار ڈالو۔"

عورتوں کا درجہ بھی سماج میں ہر حیثیت سے اونچا نہیں تھا۔ گارگی واچک لوی اور میتری کی مثالیں بے شک ثابت کرتی ہیں کہ عورتوں کو تعلیم دی جاتی تھی اور ان میں سے بعض علم و دانش کی بلند ترین منزلوں تک پہنچ گئی تھیں، لیکن عورت نہ باپ کی جائداد کی وارث ہو سکتی تھی، نہ اپنی کسی ذاتی جائداد کی مالک بن سکتی تھی۔ اگر وہ تھوڑا بہت کچھ کماتی تو وہ باپ یا شوہر کے حق میں واگذاشت ہو جاتا تھا۔ لڑکی "ولادت بد نصیبی کی علامت" سمجھی جاتی تھی۔ راجہ اور امرا کئی شادیاں کرتے تھے جو یقیناً کنبے کے لئے کافی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہوں گی۔

پیشے :

اس عہد میں زراعت میں بڑی ترقی ہوئی۔ ہل (سیرا) کی شکل و صورت اور جسامت میں اصلاح کی گئی اور پیداوار بڑھانے کے لئے کھاد کی اہمیت کو لوگ اچھی طرح سمجھنے لگے جو (یو) کے علاوہ کئی قسم کے اور اناج مثلاً چاول (وری ہی) گیہوں (گودھوم) سیم، بکلا، لوبیہ اور تل (تلا) وغیرہ کی کاشت مقررہ موسموں میں ہونے لگی۔ شمالی ہند کے زرخیز میدانوں نے آریوں کی مادی خوشحالی میں اضافہ کر دیا۔ لوگوں کی ضروریات زندگی بھی بڑھ گئیں جنھیں پورا کرنے کے لئے نئے نئے پیشے وجود میں آگئے۔ مثلاً رتھ بان، شکاری، گڈریے، مچھیرے، آتشباز، مالی، رتھ ساز، رنگریزا جولا ہے، قصاب، باورچی، کمہار، سنار، لوہار، نٹ گویے، فیل بان وغیر وغیرہ۔

جوتشیوں اور حجاموں کے پیشوں نے اہمیت حاصل کر لی۔ طبیب مریضوں کا علاج کرتے تھے لیکن اس پیشے کو نہ جانے کیوں گھٹیا سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں رنگائی زردوزی اور ٹوکر مال وغیرہ بنانے کے کام میں مصروف رہتی تھیں۔

ثقافتی ارتقاء :

(1) تہذیب کی مزید ترقی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ کئی اور دھاتیں دریافت کر لی گئیں۔ رگ وید میں سونے اور ایس (تانبا) کی اہمیت کچھ زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کی

Marfat.com

گئی۔ لیکن اس عہد میں لوگ سیسہ (سیسا) ٹین (ترپو) چاندی (رجت) سونا (برین) سرخ (لوہت) ایس (تابنا) اور کالا (سیام) ایس (لوہا) وغیرہ دھاتوں سے واقف دکھائی دیتے ہیں۔ زیورات پیالے اور ظروف زیادہ تر سونے اور چاندی کے بنتے تھے۔ سونا دریاؤں کی تہ سے یا زمین کے اندر سے یا کچی دھات کو پگھلا کر برآمد کیا جاتا تھا۔

(2) باقاعدہ سکہ کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا' حالانکہ شمان سے جو کرشنلا یا گنجہ (گونڈنی) کی برابر تھا سکے کی ابتدا ہو چکی تھی وہ اب گائے کی جگہ لیتا جا رہا تھا جسے قیمت کی اکائی کے طور پر اب تک استعمال کیا جا رہا تھا۔

(3) لباس' تفریحات اور غذا' قریب قریب وہی رہیں جو رگ وید کے زمانے میں تھیں۔ اتھر وید کی ایک مناجات میں گوشت کھانے اور سورا پینے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے انسا کے اصول کی وجہ سے ہو جس نے اب جنم لینا شروع کر دیا تھا۔

(4) ویدی دور کا آخری زمانہ فن تحریر سے واقفیت کے لئے بھی اہم ہے۔ بیوہلر اور دوسرے عالموں کی رائے ہے کہ برصغیر میں لکھنے کی ابتدا سامی ملکوں کے تاجروں نے نویں صدی ق۔م میں کی۔ اس کے برخلاف بعض عالم سختی سے اس کے قائل ہیں کہ لکھنے کی ابتدا یہیں برصغیر میں ہوئی جس کے لئے وہ اس سے پہلے کی تاریخ متعین کرتے ہیں۔ عالموں کے درمیان اس مسئلے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کا مناسب حل ان کی ذہانت کو اس وقت تک دعوت فکر دیتا رہے گا' جب تک کہ ہم کوئی نئی دریافت نہ کرلیں یا موہن جوڈارو کی لہروں کا مطلب سمجھنے کے بعد ان سے کوئی غیر متوقع روشنی نہ حاصل کریں۔

مذہب اور فلسفہ :

ویدی ادب کے آخری دور کی دینیات قدیم مناجاتوں کی دینیات سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہے۔ رگ وید کے دیوتا از سرنو ابھر آتے ہیں لیکن ان کی اہمیت بدل جاتی ہے۔ پرجاپتی "مخلوق کا مالک" جو برہمنوں کے غوروفکر کا خاص موضوع ہے' بہرحال' مقبول عام دیوتا کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ دو دیوتا جن کی تعظیم و تکریم عام ہو گئی وہ رودر اور وشنو تھے جو ہندو دھرم پر آج بھی چھائے ہوئے ہیں۔ رگ وید نے وشنو کو سورج دیوتا ہی کے ایک روپ میں پیش کیا ہے۔ وشنو کی پرستش کو اس دور میں بھی کوئی ترجیح نہیں دی گئی۔ یہی کیفیت رودر کی رہی۔ رودر نے ویدی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ مقام حاصل کر لیا۔ رودر کو شیو کے لقب سے تو پہلے ہی یاد کیا جاتا تھا اور آج تک "بخت آور" سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں رودر "عظیم دیوتا" مانے جانے لگے۔ اس فضیلت کا سبب کیا تھا؟ کیا تہذیبوں کی آمیزش اس کی ذمہ دار تھی؟ بہرنہج' موہنجوڈارو سے ایک مہر دریافت ہوئی ہے جس پر ایک دیوتا کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ سرجان مارشل کی رائے ہے کہ یہ "روایتی شیو کا ابتدائی نمونہ" ہے۔ یہ مہر اس نظریئے کے بارے میں ہمارے فرضے کو

Marfat.com

قوی کر دیتی ہے۔

حالانکہ مذہب میں کثرت اصنام کا عقیدہ رائج رہا، پھر بھی مذہبی مزاج میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی۔ قدیم مناجاتوں کو لوگ بھول گئے۔ اب ان کا سمجھنے والا کوئی نہ رہا۔ مظاہر قدرت کا احساس پجاری شاعروں میں روحانی تاثیر پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہو گیا۔ اس طرح مذہب ایک رسم اور ایک ضابطہ محض بن کر رہ گیا اور برہمنوں نے ایسی بالا دستی اختیار کر لی کہ انھیں "زمین [illegible]" سمجھا جانے لگا۔ انھوں نے سختی کے ساتھ رسموں کی پابندی پر زور دیا اور رسمیں ادا کرنے کا ایک بہت ہی پیچیدہ طریقہ کار وضع کیا۔ قربانیوں کو باطنی اہمیت دی جانے لگی۔ قربانی سے متعلق [illegible] ساحرانہ قوتوں کی حامل ہوتی تھی۔ واقعتاً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قربانی کرنے والے کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اسے بہت احتیاط سے انجام دے۔ اگر قربانی کے پیچیدہ [illegible] رسموں سے انحراف بھی کرتا تو اس کے نتائج اس کے حق میں مہلک ثابت ہو [illegible] قربانی نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ وہ مقصد حاصل کرنے کا [illegible] بن گئی۔

[illegible] یہ ایک ذہنی ہیجان کا دور تھا، ایک طرف پجاری اپنی قربانی [illegible] اپنی طاقت بڑھا رہے تھے، تو دوسری طرف برہمن اور چھتری دونوں [illegible] دماغ سے منحرف ہوتے جا رہے تھے اور گیان کے ذریعے سکون اور نجات کی راہ [illegible] ان کے بیان [illegible] فلسفیانہ نظریات اب [illegible] محفوظ ہیں۔ جیسے [illegible] گرہست و فلسفہ کے خاص خاص مدرسوں (درشنوں) کو [illegible] یونانی و [illegible] پورمی مانسہ اور اتری مانسہ کائنات کا معمہ حل کرنے اور [illegible] آریائی دماغ نے ایک عظیم عقیدہ پیش کیا۔ وہ [illegible] (برہما) ذات کی آتما (آتما روح) کو عالم کی آتما میں ضم [illegible] جس کے ذریعے انسان لامتناہی روحانی مسرت حاصل کر [illegible] تناسخ کا نظریہ تھا۔ اسی کے ساتھ یہ عقیدہ بھی رائج ہو گیا کہ [illegible] نجات حاصل نہ کر لی جائے اس وقت تک روح بار بار پیدا ہونے اور مرنے کے جنجال میں پھنسی رہتی ہے۔ اس کا دارو مدار انسان کے اپنے عمل پر ہے اور اسی سے کرم کے نظریہ کی ابتدا ہوتی ہے یعنی یہ کہ انسان کا کوئی عمل، نیک یا بد، کبھی رائیگاں نہیں جاتا [illegible] جزا یا سزا عالم وجود ہی میں مل جاتی ہے۔

علوم کی ترقی :

[illegible] جوش و خروش نے دوسرے میدانوں میں علم کی ترقی کی راہیں کھول دی۔ ویدوں [illegible] اور [illegible] کی عملی ضروریات نے نئے نئے علوم کو جنم دیا جیسے [illegible] شکشا (صوتیات) کلپ (مذہبی رسوم) نرکت (صرف) چھند (عروض) جیوتش (نجوم) ان

Marfat.com

ویدانگوں کا مقصد یہ ہے کہ ان کی مدد سے لوگ مقدس کتابوں کا مطلب سمجھ لیں انہیں محفوظ کر لیں اور ان کی تعلیمات کے مطابق عمل کریں ان کتابوں میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ ہیں جو قربانیوں، صوتیات اشتقاق' اور صرف و نحو سے بحث کرتی ہیں اس مقام پر یاسک کی نرکت کا ذکر مناسب ہے جس کی اہمیت تفسیر اور صرف و نحو کے لحاظ سے تو ہے ہی لیکن اس جہت سے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے کہ یہ کلاسیکی انداز کی سنسکرت نثر کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ اس عہد کا ایک اور اہم واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کی قدیم ویدی زبان سے جو بولیاں پیدا ہوئیں ان میں جو مدھ دیش میں رائج تھی اس نے امتیاز حاصل کر لیا اور اظہار خیال کا معیاری ذریعہ بن گئی۔ [illegible] بولیوں سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے جنہیں پراکرت کہا جاتا تھا اسے سنسکرت کا نام دیا گیا [illegible] [illegible] کی ہوئی [illegible] قواعد' خاص [illegible] لیکن رفتہ رفتہ سنسکرت خطہ علما میں محدود ہو گئی۔ اس [illegible] کے ساتھ [illegible] کی کوشش ہو گئی [illegible] ہوئی۔ نئے صحیفوں [illegible] تھی انھیں [illegible] مجموعوں کے ساتھ اس مقصد سے [illegible] "سوتروں" [illegible] اختصار پر اس قدر [illegible] سمجھی گئی جتنی فرزند کی ولادت۔

Marfat.com

باب 4

ذاتوں کا نظام

(CASTE SYSTEM)

معاشرے کا خاصا ہے کہ اس جمودی کیفیت کبھی طاری نہیں ہوتی۔ برصغیر کا قدیم معاشرہ بھی اس کلئے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ذاتوں کی تقسیم کسی "معاہدہ عمرانی" یا "سوشل کنٹریکٹ" کے نتیجے میں وجد میں نہیں آئی' بلکہ اس نے تدریجی اور ارتقائی منزلیں طے کیں۔ اور اس میں وقتاً فوقتاً اہم تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ذاتوں کا یہ نظام تمام دنیا کیسماج میں صرف برصغیر کے لئے مخصوص ہے۔ طبقات کا وجود دنیا میں ضرور ملتا ہے لیکن ذاتوں کی اس قسم کی تقسیم جو برصغیر کے تمام باشندوں کے رگ و پے میں' خواہ وہ کسی مذہب اور رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہوں' اتنی شدت کے ساتھ سرایت کر گئی ہو۔ دنیا کے کسی حصے میں کبھی نہیں پائی گئی۔

ذاتوں کی ابتداء :

ذاتوں کی ابتداء کچھ اس طرح ہوئی کہ آریہ جب فاتح کی حیثیت سے برصغیر میں آئے تو برصغیر کا سماج خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ فاتحین کا تھا جن کا رنگ اجلا' خدوخال تیکھے' اور مذہب' رسم و رواج اور طرز معاشرت سب کچھ مفتوحین سے مختلف تھا۔ دوسرا حصہ مفتوحین کا تھا جن کا رنگ کالا تھا اور آریوں کے برعکس وہ شہری زندگی گزارتے تھے اور فاتحین کے مقابلے میں زیادہ مہذب و متمدن تھے لیکن بہرحال مفتوح تھے۔ "گورے رنگ کی اس طاقت ور اقلیت نے اپنی نسل کا چوکھا پن قائم رکھنے اور کالے رنگ کی اکثریت پر اقتدار حاصل کرنے کی اسی طرح کوشش کی جس طرح جنوبی افریقہ میں آج کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس نسلی امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے دو اصطلاحیں وضع ہوئیں------ "آریہ ورن۔ اور "داس ورن" رگ وید میں ان اصطلاحوں کا ذکر موجود ہے۔

آریوں کا سماج پیشوں کے اعتبار سے تین طبقوں میں خود ہی منقسم تھا۔ ایک طبقہ حکمرانوں اور جنگ جو لوگوں کا تھا' دوسرا پروہتوں' عابدوں اور زاہدوں کا تھا اور تیسرا کاشت کاروں اور تجارت پیشہ لوگوں کا۔ لیکن رگ وید کے دور میں ان سماجی طبقوں کے امتیازات میں شدت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس دور میں یہ ضروری نہیں تھا کہ صرف برہمن کا بیٹا ہی برہمن کہلائے گا بلکہ جس کسی کو ویدوں کے منتر یاد ہوتے' جو ویدوں کے علم سے واقف ہوتا "برہمن" کہلانے لگتا تھا۔ اصل معیار گویا ویدک علوم سے واقفیت تھا اور وراثت یا نسل کو اس وقت تک اس میں

Marfat.com

کوئی دخل نہیں تھا۔ ویدک دور کا ایک شاعر مناجات میں کہتا ہے۔

"میں شاعر ہوں' میرا باپ طبیب ہے' اور میری ماں آٹا پیستی ہے۔ ہم سب اپنی خواہش کے مطابق روزی کمانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں اور جانوروں کی طرح مساوی طور پر جدوجہد کرتے ہیں۔"

رگ وید کی ایک مناجات میں جو "پرش سوکت" کے نام سے موسوم ہے ان چاروں ورنوں کے وجود میں آنے کا ذکر کیا گیا ہے لیکن عالموں نے اس مناجات کو غیر معتبر اور محرف قرار دیا ہے۔ بہر حال یہی مناجات متاخرین قانون دانوں کے نظریات کی بنیاد ہے۔ اس مناجات کا مطلب یہ ہے کہ جب دیوتاؤں نے "پرش سنگھ" (آدم) کو حصوں میں بانٹا تو برہمن اس کا منہ بن گئے' چھتری جوان چاروں ذاتوں کے سپرد کیے گئے کاموں کی وضاحت کرتی ہے۔ اس کے تحت برہمن اپنے منہ سے مقدس کتابوں کی تعلیم دیتے' چھتری اپنے ہاتھوں کے ذریعہ جنگ کرتے' ویش اپنی ٹانگوں کے زور سے ہل چلاتے کھیتی کرتے اور اناج اگاتے اور شودر ان سب کے قدموں میں رہ کر ان کی خدمت کرتے اور پست کام انجام دیتے تھے۔

سوتروں کے دور میں اصول میں ذرا تبدیلی ہو گئی' اور وہ یہ کہ "پروہت" کے فرائض کوئی ایسا شخص انجام نہیں دے گا جو اپنا سلسلہ نسب تین پشتوں تک کسی رشی سے ثابت نہ کرے اور اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ذاتوں کی تفریق میں شدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ شدت اس دور میں بھی عام نہیں ہوئی۔ جن ذاتوں کے لئے جو پیشے مقرر تھے ان میں سختی نہیں برتی جاتی تھی اور لوگ عام طور پر اپنی پسند کا پیشہ اختیار کر سکتے تھے' ایک ذات کے لوگ دوسری ذات کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے' اور آپس میں شادیاں کر سکتے تھے۔ اتنا ضرور تھا کہ تینوں اونچی ذاتوں ----- برہمن' چھتری اور ویش ----- کے لوگ شودروں کے ساتھ شادی بیاہ کو معیوب خیال کرتے تھے لیکن اس کی باقاعدہ ممانعت نہیں تھی۔ برہمنوں کی انفرادیت بھی اس وقت تک مسلم نہیں ہوئی تھی اور چھتری بھی ان کے دوش بدوش اس سماجی درجے کے دعوے دار تھے۔ برہمن اپنے روحانی تفوق اور چھتری اپنے سیاسی اقتدار کی بدولت' اپنی اپنی فضیلت کے دعوے دار تھے اور اپنے مخصوص حلقوں میں دونوں کی سماجی حیثیت مسلم ہو گئی تھی۔

برہمنوں کا تشخص :

لیکن جیسے جیسے برہمنی رسوم میں باقاعدگی اور ان کے وقوع میں زیادتی اور کثرت ہوتی گئی' مذہبی معاملات میں برہمنوں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ برہمنوں کو علوم مخفیہ اور اسرار و رموز باطنیہ کا حامل سمجھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ برہمنوں نے سماج میں اپنے لئے مختلف مراعات حاصل کر لیں۔ مثلاً" وہی جرم برہمن سے سرزد ہو تو اسے نرم سزا دی جائے گی۔ برہمن اپنے کو "بھودیو" یا زمین کا دیوتا کہنے لگے اور یہ اصول ----- برہمن چھتری' ویش یا شودر اپنی ذات سے پہچانا

Marfat.com

جاتا ہے۔ بدی کرنے والا اپنی ذات سے گر جاتا ہے۔ برہمن بدی کرے گا تو نیچ ہو کر شودر بن جائے گا' اور شودر نیکی کرے گا تو بلند ہو کر برہمن کا درجہ حاصل کر لے گا"۔۔۔۔۔۔ فراموش کیا جانے لگا' اور یہ اصول مرتب ہو گیا کہ۔۔۔۔۔۔ "برہمن بھڑکتی ہوئی آگ ہیں' انہیں حقارت سے نہ دیکھو' چاہے وہ ویدوں کے عالم ہوں یا نہ ہوں۔ برہمن ہر صورت میں "دیوتا" ہے' عالم ہو یا جاہل۔ پہاڑ' دریا' بلکہ تمام کائنات برہمنوں کی بدولت وجود میں آئی برہمنوں ہی کے سبب آسمانوں میں دیوتاؤں کا وجود ہے۔ برہمن کو روئے زمین پر کوئی طاقت تسخیر نہیں کر سکتی۔

چھتری اور ویش :

برہمنوں کے سماجی تفوق کو چھتریوں نے بہرحال تسلیم نہیں کیا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا' وہ برہمنوں سے سماجی برتری یا کم از کم برابری کا دعویٰ کرتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں ذاتوں کو دوسری ذاتوں کے لوگ اپنے سے افضل و برتر مانتے تھے' لیکن ان دونوں میں کون فضل تھا یہ بات اب تک مکمل طور پر تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ اور برہمن چھتری کی اس سماجی کش مکش میں ویش اور شودر طبقہ بہت نقصان میں رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ویش ان دونوں سے پست اور شودر طبقہ سب سے پست مانا جانے لگا۔

شودر :

ویدک دور کے اواخر میں "آریہ" اور شودر کا فرق زیادہ نمایاں ہو چکا تھا۔ شودر کے لئے مقدس آگ کی قربت' قربانی کی رسموں میں شرکت اور ویدوں کی تلاوت ممنوع قرار دے دی گئی۔ شودر کے لئے اپنے مردوں کو جلانے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ ان سے شادیاں کرنا معیوب سمجھا جانے لگا۔ ان کے ساتھ کھانا' پینا' اٹھنا' یہاں تک کہ ان کا بنایا ہوا کھانا لوگوں نے ترک کر دیا۔ چنڈالوں کی حیثیت سماج میں سب سے پست ہو گئی۔ وہ بے چارے شہر سے باہر رہتے اور انہیں اتنا حقیر و ذلیل سمجھا جانے لگا کہ ان کے چھونے ہی سے نہیں بلکہ ان کے سائے سے چیزیں ناپاک ہو جاتی تھیں۔

ذات پات میں شدت :

چنانچہ سمرتیوں یا قانونی کتابوں کے دور میں ایسا معاشرہ مرتب ہو چکا تھا جس میں ذات پات کی تمام تر خصوصیات رچی ہوئی تھیں۔ سماجی طبقات و درجات میں شدت پیدا ہو گئی تھی اور ذاتیں اور پیشے نسل بہ نسل چلنے لگے تھے اور یہ بات طے ہو گئی تھی کہ برہمن اور صرف برہمن کا بیٹا "برہمن" کہلائے گا۔ برہمن کا فرض تعلیم دینا اور قربانی کی رسمیں وغیرہ ادا کرنا ہے۔ چھتری کا کام جنگ کرنا اور ملک کی حفاظت کرنا ہے۔ ویش کے ذمہ مویشیوں کی دیکھ ریکھ' کھیتی باڑی اور روپے پیسے کا لین دین ہے' اور شودروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پست کام انجام دیں اور

Marfat.com

(دوِج) ذاتوں یعنی برہمن چھتری اور دیش کی خدمت کریں۔

ذات پات میں جمودی کیفیت :

پانچویں چھٹی ق-م میں بدھ اور جین مت کی انقلابی تحریکوں نے [illegible] کے بانی چھتری گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، برہمنوں کی سماجی اجارے داری پر کاری ضرب لگائی [illegible] مذہبوں نے مساوات کا سبق دیا اور برہمنوں کے خلاف روحانی بغاوت کا علم بلند کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ذات پات کا بڑھتا ہوا زور [illegible] عرصے کے لئے [illegible] لیکن ایک ٹھہراؤ اور جمودی کیفیت پیدا [illegible] آگئی لیکن اس دوران میں بھی ذات پات کی [illegible] پیدا [illegible] کے نتیجے میں ذات پات کا [illegible] مختلف ذاتوں [illegible] آپس میں شادیوں کرنا سب [illegible] مقاومت کے باوجود برہمن ہی کامیاب ہوئے اور [illegible] پر مہر لگا دی۔

قانون میں ذات پات :

ذات پات کے ارتقاء کے ذیل میں دو باتیں خاص طور پر [illegible] اولاً یہ کہ یہ تفریق جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں دیکھا، برصغیر دیوانی اور فوجداری [illegible] پر اثر انداز ہوئی۔ دیوانی اور فوجداری کے قانون کی ترتیب و تشکیل [illegible] مطابق عمل میں آئی جس [illegible] ذاتوں کو نقصان پہنچانے [illegible] سب سے کم [illegible] زیادہ ویشوں کے لئے [illegible] زیادہ [illegible] کے لئے سب سے زیادہ [illegible] اسی طرح [illegible] برہمنوں کے لئے سب سے [illegible] کے لئے [illegible] لئے اس سے زیادہ سخت [illegible] سے زیادہ سخت [illegible]

[illegible] :

[illegible] اہم بات یہ تھی کہ ان چار بنیادی ذاتوں کے علاوہ "مرکب" [illegible] وجود میں آگئیں جن کی ابتدا اور ان کے سپرد کئے گئے [illegible] کا مسئلہ بڑا [illegible] اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ [illegible] اور دوسرے قانون دانوں کے یہاں ان چار کے علاوہ بہت سی اور ذاتوں کا تذکرہ [illegible] آتا ہے۔ یہ مرکب ذاتیں آپس میں شادیوں کے نتیجے میں وجود میں آئیں اور یہ چاروں [illegible] نئی نئی جماعتوں اور نئے نئے گروہوں میں تقسیم ہو گئیں۔ مثلاً اگر کسی ویش عورت کی شادی کسی شودر مرد سے ہوتی تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد "[illegible]" کہلاتی تھی اور اس کا کام [illegible] اور [illegible] کے

Marfat.com

عوامی مظاہروں میں حصہ لینا قرار پایا۔ اگر کوئی شودر چھتری عورت سے شادی کرتا تو ان کی اولاد کو ناگدھ کہتے تھے اور اس کا پیشہ یہ تھا کہ بازار میں فروخت ہونے والی اشیا کی آواز لگائے (جسے آج کل کی اصطلاح میں "ایڈورٹائزنگ" کہہ سکتے ہیں)۔ "ناگدھ" مگدھ یعنی جنوبی بہار کے رہنے والے کو بھی کہتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح "ناگدھ" ایک خاص علاقے کے ساکن کو بھی کہنے لگے اور اس علاقے کے رہنے والوں کی ایک علیحدہ ذات وجود میں آگئی۔ ان مرکب ذاتوں میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ چھتریوں، ویشوں او شودروں کی ہم جنسی ویک رنگی یکسر ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ برہمن بھی آگے چل کر مختلف نئی برادریوں میں تقسیم ہو گئے اور اس کی تقلید دوسری ذاتوں نے بھی کی جو آج تک باقی ہے۔

غیرملکیوں کے بیانات

میگستھنیز :

ذاتوں کی کثرت کا مشاہدہ باہر سے آنے والے مختلف سیاحوں نے بھی کیا جو مختلف اوقات میں برصغیر آئے۔ یونانی سفیر میگستھنیز نے (چوتھی صدی ق-م) سات ذاتوں کا ذکر کیا ہے جو شادیاں اپنے قبیلے یا ذات کے اندر کرتی تھیں۔ ان میں سب سے پہلا طبقہ خاسیوں کا تھا جس سے میگستھنیز کا مطلب برہمنوں سے ہے۔ یہ طبقہ تعداد میں سب سے کم لیکن عزت میں سب بلند و بالا خیال کیا جاتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ قربانی کی رسمیں ادا کرے، مذہبی علوم حاصل کرے اور دوسروں کو ان کی تعلیم دے۔ نئے سال کے جشن میں تمام عالم اور حکیم راجا کے دربار میں طلب کئے جاتے اور پیش گوئیاں کرتے جن کے مطابق اہم فیصلے کئے جاتے تھے۔ جنھیں سیاسی اور زراعتی کاموں میں مشعل ہدایت مانا جاتا تھا۔

دوسرا طبقہ کاشتکاروں کا تھا جو اکثریت میں تھا۔ یہ لوگ بڑے خوش مزاج اور نرم دل ہوتے تھے اور فوجی خدمات سے انھیں مستثنٰی سمجھا جاتا تھا۔ شہر کی ہنگامہ آرائیوں سے دور یہ لوگ سکون کے ساتھ کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے۔ تیسرا طبقہ گوالوں اور شکاریوں کا تھا۔ چوتھا دست کاروں، کشتی بانوں اور تجارت پیشہ لوگوں کا تھا۔ پانچویں طبقے میں فوجی لوگ تھے اور کسانوں کے بعد ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی طبقے میں پولیس کے لوگ تھے جو راجا کو خبریں دیتے تھے اور ساتواں طبقہ راجا کے وزیروں اور مشیروں پر مشتمل تھا۔

یہ ہے ذاتوں کی وہ تفصیل جو یونانی سفیر میگستھنیز نے چوتھی صدی ق-م میں بیان کی۔ اگرچہ اس کی صحت پر تاریخ کے اکثر عالم بھروسہ نہیں کرتے، لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ان چار بنیادی "ورنوں" کے علاوہ برصغیر میں اور بہت سی ذاتیں ابھر آئی تھیں۔ سمرتیوں یا قانون کتابوں سے بھی میگستھنیز کے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

Marfat.com

فاہیان :

فائیان (405ء تا 411ء) میگستھنیز کی طرح تمام ذاتوں کی تفصیل بیان نہیں کرتا بلکہ برہمنوں کی سماجی برتری اور چنڈالوں کی سماجی پستی کا ذکر کرتا ہے جو اس لئے اہم ہے کہ اس سے برصغیر کے بلند ترین اور پست ترین طبقے کی سماجی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پاٹلی پتر کے رے دت نامی ایک برتن عالم کا ذکر کرتے ہوئے فاہیان لکھتا ہے------ "وہ ایک پاک و صاف اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتا ہے۔ راجہ اس کی بے پناہ عزت کرتا ہے اور اسے اپنا گرو سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب راجہ اس سے ملنے جاتا ہے تو اس کے قریب بیٹھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اگر راجہ کبھی فرط خلوص یا جوش عقیدت میں اس کے ہاتھ چھو لیتا ہے تو یہ برہمن عالم فوراً اسے دھو ڈالتا ہے۔" ایک دوسرے مقام پر فائیان نے لکھا ہے کہ "راجہ برہمنوں کی خدمت میں جب کوئی نذر پیش کرتا ہے تو تاج سر سے اتار لیتا ہے۔" چنڈالوں کے بارے میں فاہیان لکھتا ہے----- "گندے لوگوں' کوڑھیوں' اور اچھوتوں کو چنڈال' کہتے ہیں۔ یہ لوگ سب سے الگ تھلگ شہر کے باہر رہتے ہیں یا بازار میں داخل ہوتے ہیں تو اپنی آمد کا اعلان کرتے جاتے ہیں تاکہ لوگ راستے سے ہٹ جائیں اور ان کے نزدیک نہ آنے پائیں۔ گوشت کا کاروبار صرف چنڈال لوگ کرتے ہیں اور وہ بھی شہر سے باہر۔

ہیون سانگ :

ہیون سانگ (ساتویں ص-ع) نے چاروں ورنوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے------ "پہلا طبقہ برہمنوں کا ہے جو نیک لوگ ہوتے ہیں اور مذہبی اور اصولی زندگی گزارتے ہیں۔ دوسرا طبقہ چھتریوں کا ہے یعنی حکمرانوں کا' جو برسوں سے حکمرانی کر رہا ہے۔ یہ لوگ بھی نیک' ایمان دار اور رحمدل ہوتے ہیں۔ تیسرا طبقہ ویشوں یا تجارت پیشہ لوگوں کا ہے۔ یہ لوگ کاروبار کرتے ہیں اور ملکی اور غیر ملکی تجارت سے نفع کماتے ہیں۔ چوتھا طبقہ شودروں یعنی زراعت پیشہ لوگوں کا ہے۔ یہ ہل چلاتے ہیں اور زمین بوتے ہیں۔" آخری فقرے سے ظاہر ہے کہ زراعت ویشوں کے لئے مخصوص نہیں رہا تھا جیسا کہ اگلے وقتوں میں ہو کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ویش لوگ جب آسودہ حال ہو گئے تو انھوں نے کھیتی باڑی کا کام اجرت پر مزدوروں سے لینا شروع کر دیا' جو عام طور پر شودر طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔

ابن خرداذبہ :

میگستھنیز کی طرح ابنؒ خرداذبہ (نویں ص-ع) نے بھی برصغیر کے معاشرے کو سات طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے---- "ہندوؤں میں سات طبقے پائے جاتے ہیں : پہلا طبقہ سب کفریہ (□) کا ہے جو اونچے طبقے کے لوگ ہیں جس میں سے بادشاہ چنے جاتے ہیں۔ باقی

Marfat.com

چھ ذاتوں کے لوگ ان کی اور صرف ان کی عزت کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ برہمنوں کا ہے جو شراب سے اجتناب کرتے ہیں۔ تیسرے کتاریہ (کشتری، کھتری) ہیں جو تین پیالوں سے زیادہ شراب نہیں پیتے۔ برہمنوں کی لڑکیاں ان سے نہیں بیاہی جا سکتیں، البتہ برہمن ان کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ چوتھا سودریہ (شودر) کا ہے جو زراعت پیشہ لوگ ہیں۔ پانچواں طبقہ بے سودہ، (ویشوں) کا ہے جو دست کاری اور خدمت گاری کرتے ہیں۔ چھٹا طبقہ، سندالیہ، (چنڈالوں) کا ہے جو پست کام انجام دیتے ہیں۔ ساتواں طبقہ لاہود، کا ہے جن کی عورتیں آرائش اور بناؤ سنگار اور مرد ایسی تفریحات اور کھیلوں کے شوقین ہیں جن میں بڑی مشق اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

سلیمان :

سلیمان (نویں ص-ع) لکھتا ہے------ "امراء سب ایک خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ راجا اپنے جانشین خود مقرر کرتا ہے۔ اسی طرح علماء اور طبیب بھی اپنے جانشین خود مقرر کرتے ہیں۔ وہ ایک واضح ذات میں اور ان کا پیشہ ذات کے باہر نہیں نکل سکتا۔"

ابوزید :

ابو زید (دسویں ص-ع) لکھتا ہے------ "برصغیر میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے پیشے کے مطابق جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتے پھرتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے مشکل سے ملتے جلتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کچھ کھا پی بھی نہیں سکتے سوائے ان جڑی بوٹیاں اور پھلوں کے جو انھیں جنگل میں مل جاتے ہیں اور ان سے بعض بالکل برہنہ رہتے ہیں---- وہ لوگ جو علم سے شغف رکھتے ہیں انھیں برہمن کہتے ہیں۔"

البیرونی :

البیرونی (گیارھویں ص-ع) نے چاروں ورنوں اور اس کے علاوہ اور بہت سی ذاتوں کی تفصیل درج کی ہے اور اپنے مشاہدات کی روشنی میں برصغیر کی ذات پات پر عالمانہ انداز میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ البیرونی لکھتا ہے----- کے اجارے دار صرف برہمن ہیں۔ برہمن ویدوں کی تلاوت بغیر معنی سمجھے کرتے ہیں اور انھیں زبانی یاد کر لیتے ہیں۔ بہت کم لوگ ان کے معنی سمجھتے ہیں۔" البیرونی کے نذدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، کیوں کہ گیر عرب ممالک کے مسلمان بھی قرآن مجید کو بغیر مطلب سمجھے پڑھتے تھے اور اس کا ترجمہ کرنا عام طور پر معیوب خیال کرتے تھے۔ "برہمن اپنی بسر اوقات ان چیزوں پر کرتے ہیں جو انھیں زمین پر یا درختوں سے مل جاتی ہیں۔ برہمنوں کو بہت سی مراعات حاصل ہیں جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں ہیں۔ مثلاً" وہ سرکاری محصول سے مستثنٰی ہیں اور نہ انھیں کوئی سرکاری خدمات انجام دینی پڑتی ہیں۔

Marfat.com

برہمن اگر چاہیں تو کپڑے اور چھالی کی تجارت کر سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ وہ خود تجارت نہ کریں بلکہ کوئی ویش ان کے واسطے کوئی کاروبار چلائے۔ وہ جانوروں کی پرورش کا کام بھی نہیں کرتے اور نہ سود پر روپیہ چلانے کا۔ کھانے پینے کے معاملے میں وہ بہت محتاط ہیں۔ ہر برہمن کے کھانے کے برتن علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا انہیں استعمال کر لیتا ہے تو انہیں توڑ دیا جاتا ہے۔ کسی دوسری ذات کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے کھانے پینے کا کوئی سوال ہی نہیں' جب برہمن خود ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں تو ہر ایک کے لئے پانی چھڑک کر گوبری کی جاتی ہے اور چوکھونٹا دستر خوان چنا جاتا ہے۔ گوشت' پیاز' لہسن وغیرہ برہمنوں کے لئے ممنوع ہے۔" برہمن دوسری ذات کی لڑکیوں سے شادی کر سکتے تھے' لیکن البیرونی کہتا ہے۔ اس مراعات سے فائدہ بہت کم اٹھایا جاتا تھا اور برہمن عام طور پر شادی اپنی ہی ذات میں کرتے تھے۔

چھتریوں یا کشتریوں کے بارے میں البیرونی کہتا ہے کہ ان کا درجہ "برہمنوں سے کچھ ہی کم ہے چھتری حکومت کرتے ہیں اور ملک کی حفاظت کا کام ان کے سپرد ہے کیوں کہ وہ اسی کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں پہلے حکومت کا کام بھی برہمن ہی انجام دیتے تھے' لیکن بعد میں حکومت اور جنگ کا کام خدا نے چھتریوں کے سپرد کر دیا۔ یہ دونوں ذاتیں---- برہمن اور چھتری "دوبج" ذاتیں خیال کی جاتی ہیں۔ ان ذاتوں اور باقی دو ذاتوں---- ویش اور شودر میں بڑا فرق ہے' جب کہ ویش اور شودر ایک دوسرے سے قریب ہیں۔" کھیتی باڑی' جانوروں کی پرورش اور تجارت خواہ اپنے لئے خواہ برہمنوں کے لئے ویشوں کی ذمہ تھی۔ شودروں کو برہمنوں کا خدمت کار سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے معاملات کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے اور برہمنوں کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔

پست ذاتوں کے بارے میں البیرونی کہتا ہے کہ ویش اور شودر حسب ذیل آٹھ طبقوں میں منقسم تھے---- "دھوبی' موچی' شعبدہ باز' ٹوکریاں اور ڈھالیں بنانے والے' ملاح' مچھیرے' شکاری' چڑی مار اور جولا ہے۔" یہ سب آپس میں شادیاں کرتے تھے لیکن دھوبی' موچی اور جولاہے سے کوئی شادی بھی نہیں کرتا تھا۔ پست ذات کے لوگ سب شہر کے باہر رہتے تھے اور گندے کام انجام دیتے تھے۔ مثلاً" شہر یا گاؤں کی صفائی یا اسی قسم کی دوسری خدمات ان میں امتیاز پیشوں کے اعتبار سے کیا جاتا تھا' حالانکہ ویسے وہ سب ایک ہی ذات کے لوگ تھے۔

نئی ذاتیں :

برصغیر میں باہر سے وقتاً فوقتاً جو قومیں آئیں وہ سب اگرچہ اس سماج میں گھل مل گئیں' لیکن ایک طرف آپس میں شادیوں اور دوسری طرف نئے نئے پیشوں کے باعث سیکڑوں نئی نئی ذاتیں وجود میں آ گئیں۔ یہاں تک کہ گیارھویں صدی عیسوی تک ہماری موجودہ دور کی قریب قریب تمام ذاتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ خود برہمن "گوت بیاہ" کے نتیجے میں برادریوں میں تقسیم ہو گئے تھے جو اپنی علیحدہ روایات رکھتی تھیں۔ اس طرح راجپوت مختلف جرگوں میں اور ویش'

Marfat.com

شودر اور اچھوت سیکڑوں چھوٹی چھوٹی برادریوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ اے۔ایل۔ وشیم لکھتا ہے ---- یہی تفریق و تقسیم آج تک باقی ہے لیکن آج کا "ورن" کی بہ نسبت "ذات" پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مثلاً" کسی کے ویش یا شودر ہونے کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اہیر' کالستھ یا سنار ہونے کی' اور انہیں کے اجتماعی تصور کو اہمیت حاصل ہے' چاہے اس کی بنیاد مذہب ہو' چاہے علاقہ' نسل یا پیشہ۔

ذات پات کا اثر دوسری قوموں پر :

ذات پات کی تفریق ہندو قوموں پر ہی اثر انداز نہیں ہوئی بلکہ اس نے اپنے دامن میں ان مذہبوں کو بھی سمیٹ لیا جن کے نزدیک ذات پات کی تفریق ممنوع ہے۔ مثلاً" مسلمانوں اور سکھوں نے جو مساوات کے قائل ہیں' نسلی امتیاز یا پیشوں کی بنیاد پر اپنے بہت سے گروہ یا برادریاں بنا لیں جو شادیاں صرف اپنی ذات یا برادری میں کرتی ہیں اور غیر برادری میں شادی بیاہ کو معیوب خیال کرتی ہیں۔

ذاتوں کی تنظیم :

ان تمام ذاتوں یا برادریوں کے افراد ایک تنظیم میں منسلک ہو جاتے تھے اور ہر برادری کا اپنا ایک علیحدہ نظام ہوتا تھا' جو اگرچہ نجی ہوتا تھا مگر اس کی پابندی برادری کے تمام افراد کے لئے ضروری ہوتی تھی۔ برادری میں سب سے بزرگ ہستی "سرپنچ" کی ہوتی تھی جس کے فیصلے قانون کا حکم رکھتے تھے۔ برادری کے اراکین سے پنچائت کے قوانین کی پابندی کرنا اسی کا فرض تھا۔ قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر یہی سرپنچ برادری کے افراد کو برادری سے باہر نکال سکتا تھا۔ یہ نظام ارتھ شاستر سے لے کر صدیوں آگے تک جاری رہا اور بعض علاقوں میں آج تک رائج ہے۔

مضر اثرات :

یورپ کے مورخین نے ذاتوں کی تقسیم کی بڑے مبالغے کے ساتھ تعریفیں لکھی ہیں۔ اور بلا شبہ اس سے کچھ فائدے بھی ہوئے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ برصغیر کے معاشرتی نظام کو جتنا نقصان ذاتوں کی تقسیم نے پہنچایا ہے اتنا کسی دوسری چیز نے نہیں پہنچایا بلکہ برصغیر میں جتنی سماجی خرابیاں پیدا ہوئیں ان کی بنیاد ذاتوں کی تقسیم میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

ذاتوں کی تقسیم کے مضر اثرات نتیجے میں تمام برصغیر کے لئے مہلک ثابت ہوئے۔ ملک کی تمام تر ترقیاں ذات پات کی تفریق کی بدولت مسدود ہو کر رہ گئیں۔ جس طرح روم اور یونان کا اقتدار قرون اولیٰ میں بحر روم پر رہا' اس طرح برصغیر کا اقتدار تمام بحر ہند پر رہنا چاہئے تھا لیکن یہ نہ ہو سکا اور اس کی اصل وجہ بھی ذات پات کی تفریق اور اس میں شدت پسندی۔ برصغیر کے

Marfat.com

لوگ چھوت چھات کے باعث بحری سفر کو معیوب سمجھتے تھے۔ ذات پات کی تفریق سے قومیت کے تصور کا نشوونما نہیں ہو سکا اور اس کی وجہ سے تمام برصغیر اتحاد و اتفاق کو صدمہ پہنچا۔ اسی سبب سے بیرونی حملہ آوروں کو فتوحات کا موقع مل گیا۔ یہاں فن کاروں کی ناقدری کی گئی محض اس لئے کہ ذاتوں کی تفریق میں ان کا درجہ پست تھا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ تمام فنون لطیفہ زوال پذیر ہو گئے۔ ذاتوں کی تفریق نے علم و حکمت کو برہمنوں یا زیادہ سے زیادہ چھتریوں تک محدود رکھا۔ اس طرح آبادی کا ایک بڑا حصہ عالم و حکمت کی دولت سے محروم رہ گیا۔ذات پات کی تفریق کے باعث اہل ہند نے باہر کے لوگوں کو "ملچھ" سمجھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے غیر ملکی علوم و فنون سے محروم رہا اور اس کی وجہ سے علوم و فنون کی ترقی مسدود ہو گئی۔

مختصر یہ کہ ذات پات کی تاریکی برصغیر کے شفاف چہرے پر پھیلتی چلی گئی اور ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ اس تاریکی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شروع میں سیاہ بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا آریوں کے تابناک تہذیب و تمدن پر سایہ ڈال رہا تھا۔ اس وقت یہ ٹکڑا انسان کے ہاتھ سے زیادہ بڑا نہ تھا لیکن بہت جلد اس نے خوفناک حدود اختیار کر لیں اور تمام فضا پر محیط ہو گیا اور مقررہ وقت سے پہلے گھپ اندھیرے میں تبدیل ہو گیا۔

Marfat.com

○ باب 5

جین مت

(JAINISM)

چھٹی صدی ق-م بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک عصر آفرین دور تھا۔ دنیا کے مختلف خطوں میں جو ایک دوسرے سے کافی دوری پر واقع تھے اس زمانے میں غیر معمولی ذہنی اور روحانی ہیجان پایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر فارس میں زرتشت اور چین میں کنفیوشس اسی زمانے میں اپنی تعلیمات کی اشاعت کر رہے تھے۔ جو شیلی طبیعتیں میں بھی تلاش حق میں سرگرم عمل تھیں اور اس تمام جوش و خروش کا مرکز مگدھ تھا جہاں برہمنی اثرات نہ کبھی اتنے گہرے ہوئے تھے نہ قوی۔ اپ شدوں نے بے تکی رسموں اور خونی قربانیوں کے خلاف پہلے ہی سے بغاوت شروع کر دی تھی۔ برہمنوں کی ریاکاری اور تفریق پسندی نے جو عام لوگوں کے لئے عذاب بنی ہوئی تھی نئے نئے نظریات کے لئے پہلے ہی سے میدان تیار کر رکھا تھا۔ کافی تعداد میں معلمین ملک میں گھوم رہے تھے اور یہ سمجھا رہے تھے کہ علم و آگہی یا نفس کشی کے ذریعے پیدائش اور موت کی لامتناہی تکلیف سے کس طرح چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بے شمار اصلاحی مکاتب فکر ابھرے جن میں سے بعض بہت جلد معدوم ہو گئے اور بعض کچھ دنوں کے بعد اپنی افادیت کھو بیٹھے۔ بہر حال ان میں دو۔ یعنی جین مت اور بدھ مت' اتنے توانا ثابت ہوئے کہ زندہ رہ گئے اور آج بھی بنی نوع انسان کے فکر و عمل پر بڑی حد تک اثر انداز ہیں۔

مہاویر کی زندگی :

جینیوں کا کہنا ہے کہ ان کا مذہب بعید ترین ماضی میں وجود میں آیا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے آخری تیر تھنکر مہاویر تھے۔ لیکن ان سے پہلے ان کے 23 تیر تھنکر اور گذرے ہیں۔ ان سے پہلے ان کے آخری تیر تھنکر مہاویر تھے۔ ان کے پہلے کے تیر تھنکروں میں پارشوناتھ تاریخی شخصیت معلوم ہوتے ہیں لیکن باقی سب ہستیاں دھندلی اور دیومالا کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہیں۔ پارشوناتھ بنارس کے راجا آشوسین کے لڑکے تھے' لیکن پارشوناتھ نے راج پاٹ چھوڑ کر روحانی زندگی اختیار کر لی۔ ان کی ہدایات یہ تھیں۔ (1) کسی کو گزند مت پہنچاؤ۔ (2) جھوٹ مت بولو۔ (3) چوری مت کرو (4) کسی چیز کے مالک مت بنو۔ ہمیں نہیں معلوم وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ لیکن اگلے تیر تھنکر' مہاویر نے' جو پارشوناتھ کے 250 سال بعد پیدا ہوئے اس مذہب کو یقیناً چار چاند لگا دیے۔ بچپن میں مہاویر کو ان کے گھر والے وردھمان کہتے تھے۔ ویشالی

Marfat.com

کے قریب کنڈاگرام نامی گانو میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کے باپ سدھارتھ چھتریوں کے گیامنترک نامی گروہ کے سردار تھے۔ ان کی ماں کا نام ترشالا تھا۔ وہ مچھوی سردار چیتک کی بہن تھیں، وہی چیتک جس کی بیٹی کی شادی ممبسار سے ہوئی تھی۔ اس طرح وردھمان ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی امارت نے ضرور انھیں تبلیغی کام میں سہارا دیا ہو گا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تیس سال کی عمر تک گرہستی زندگی گزارنے کے بعد ہو گھر سے نکل گئے اور تارک الدنیا ہو گئے۔ انھوں نے بارہ سال غورو فکر میں گزارے اور سخت تپ کیا۔ آخر کار انھیں معرفت حاصل ہو گئی (کیوپ) اور انھیں "نرگرنتھ" (آزاد) یا "جن" (فاتح) کا لقب دیا گیا اور اسی پر ان کے پیروؤں کا نام بھی پڑا۔ اس وقت سے لے کر مرتے دم تک، جبکہ ان کی عمر بہتر 72 سال تھی گویا تیس سال انھوں نے مگدھ، انگ، متھلا، اور کوشل میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی۔ پارشو کی بتائی ہوئی چار نیکیوں میں انھوں نے ایک نیکی کا اضافہ کیا، یعنی پاکبازی۔ انھوں نے لباس ترک کر دیا۔ اور برہنہ رہنے لگے۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ جین دھرم کی سوتام برادرڈگم بر فرقوں میں تقسیم کی ابتدا مہاویر کے اسی عمل سے ہوئی لیکن یہ رائے قرین عقل نہیں ہے کیونکہ بھدربا کے زمانے میں قحط پڑا اور جینی برصغیر کے جنوب میں چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر یہ فرقہ بندی عمل میں آئی۔ مہاویر کی وفات تقریبا 527 ق-م میں پاوا پری کے مقام پر (ضلع پٹنہ) میں ہوئی اس تاریخ سے بعض عالم بہر حال متفق نہیں ہیں۔

جین مت کے خاص عقائد :

جین مذہب والے ویدوں کو الہامی نہیں مانتے اور نہ قربانی کی رسموں کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے چھوٹے چھوٹے ذرے میں بھی روح (جیو) ہوتی ہے۔ جس میں قدرت نے شعور بھی ودیعت کیا ہے۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جینیوں نے اہنسا یا تمام جانداروں پر رحم کرنے کے اصول کی پابندی انتہائی احتیاط سے کی۔ جب اس پر سختی سے عمل درآمد کیا گیا تو عجیب متضاد صورتیں رونما ہوئیں۔ یعنی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جین راجا نے جانوروں کے جان سے مارڈالنے والوں کو پھانسی کی سزا دے دی۔ جینی کسی عالمگیر روح یا قدرت مطلقہ کا قائل نہیں جو دنیا کی خالق ہو جس کے وجود کے باعث نظام کائنات قائم و برقرار ہو۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ "انسان کی روح میں جو طاقتیں مخفی ہیں پر ماتما ان کا بہترین بلند ترین، اور مکمل ترین مظہر ہے۔ جینیوں کے نزدیک زندگی کی منزل مقصود یہ ہے کہ انسان مادی وجود کے بندھن توڑ کر نجات حاصل کرے۔ روح کے جسمانی شکل اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ جسم میں "کرم" (عمل) کا مادہ موجود ہے، اس لئے اگر جین کرم سے چھٹکارا حاصل کرے جو اسے گذشتہ زندگیوں سے ورثے میں نہیں ملا اور جب بھی حاصل کرے، تو اسے "موکش" (نجات) مل جائے گا اور نئی زندگی نہیں ملے گی۔ اس منزل تک پہنچنا تین ہیروں (تری رتن) پر منحصر ہے۔ راسخ اعتقاد، حقیقی علم اور نیک چلن۔ جینی تپ، یوگی مشقوں اور فاقے پر بہت زور

Marfat.com

دیتے ہیں، یہاں تک کہ جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں کرتے۔ خیال یہ ہے کہ زندگی میں نظم و ضبط روح کو طاقت پہنچاتا ہے اور مادہ اسفل کو تسخیر کر لیتا ہے۔

Marfat.com

○ باب 6

بدھ مت

(BUDDHISM)

ہندوستان بدھ مذہب کے عروج سے پہلے :

بدھ اور جین مذہب کی مقدس کتابوں کا بنیادی مقصد مذہب کی تعلیم و اشاعت تھا' نہ کہ سیاسی حالات پر روشنی ڈالنا۔ لیکن ان کتابوں میں جو روائتیں اور حکائتیں محفوظ ہیں ان سے ہمیں تاریخی روشنی کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں سولہ بڑی حکومتوں (سوئس مہاجن پدوں) کا حال بالکل ضمنی طور پر معلوم ہو جاتا ہے یہ حکومتیں (جن پد) ساتویں صدی ق-م یا چھٹی صدی ق-م کے اوائل میں ضرور موجود تھیں۔ کیونکہ بدھ مذہب کی قدیم ترین تحریروں میں ان کا ذکر آیا ہے اور خود بدھ (یا مروجہ تلفظ بدھا) کے زمانے میں جو حالات تھے ان سے یہ فہرست بالکل مطابقت نہیں کرتی۔ وہ ریاستیں حسب ذیل تھیں۔

(1) **کاشی** : جس کی راجدانی کا نام بھی یہی تھا۔ اسے وارانسی بھی کہا گیا ہے۔ برہم دت خاندان کے دور حکومت میں یہ ریاست سب سے زیادہ خوش حال تھی۔ تیر تھنکر پارشوا کے باپ آسوسین کاشی کے قدیم ترین راجاؤں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(2) **کوشل** : بدھی دور میں اس کا دارالسلطنت ضلع گونڈا میں ساو تھی (شرادستی) یا میٹ میٹھ تھا۔ اس سے پہلے ساکیت اور اجودھیا اس کے دارلسلطنت تھے۔ کاشی اور کوشل کے راجہ اکثر نبرد آزما رہتے تھے۔ کوشل کا کنس نامی راجہ جسے پالی ادب میں تو اتر کے ساتھ "باران سگ گا ہو" کہا گیا ہے' آخر کار کاشی کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بہر نہج اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ پسے ندی کا باپ مہا کوشل کاشی پر پورا پورا اقتدار رکھتا تھا۔

(3) **انگ** : یہ مگدھ کے مشرق میں واقع تھی اور بھاگلپور کے قریب چمپا اس کی راجدھانی تھی۔ معلوم ہوتا ہے بعض انگ راجاؤں نے مگدھ کے معاصر راجاؤں کو شکستیں دی' لیکن آخر میں مگدھ کو بہر حال فتح نصیب ہوئی۔

(4) **مگدھ** : اس میں موجود پٹنہ اور گیا کے ضلع شامل تھے اور گریوراج اس کی راجدھانی تھی۔ بدھا سے پہلے مگدھ کے حکمرانوں میں برہ درتھ اور اسکاٹر کا جرا سندھ قابل ذکر

Marfat.com

ہیں۔

(5) **وجی** : یہ آٹھ قبیلوں کی متحدہ ریاستوں کا ایک طاقتور جتھا تھا اور ان میں سے ہر ایک پر اس کا نام رکھا گیا تھا۔ دوسرے اہم قبیلے جو اس میں شامل تھے وہ یہ تھے۔ لچھوی' ودیہہ' اور گیاترک۔ بدھی ادب میں اس کا محل وقوع ویشالی بتایا گیا ہے اور یہی متحدہ ریاستوں کا صدر مقام بھی تھا۔

(6) **ملا** : ان کا علاقہ پہاڑ کے نشیب میں غالبا وجیان کی متحدہ ریاستوں کے شمال میں واقع تھا۔ ان کی دو شاخیں تھیں جن کی راجدھانیاں' کشی نارا اور پاوا تھیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملاؤں کی ریاست بدھی دور سے پہلے ایک شخصی حکومت تھی۔

(7) **چیٹی یا چیدی** : چٹیوں کا علاقہ جسے قدم دستاویزات میں چیدی کہا گیا ہے جمنا کے قریب تقریبا وہاں واقع تھا جہاں آج بند-یلکھنڈ اور اس کے قریب و جوار کا علاقہ واقع ہے۔ اس کا سب سے بڑا شہر سکتی متی یا سو تھی نگر تھا۔

(8) **ونش یا وتس** : وچھوں کا ملک جمنا کے کنارے اونتی کے شمال و مشرق میں واقع تھا اور کوشامبی یا کوسمبی (الہ آباد سے تیس میل دور موجود کوسم) اس کی راجدھانی تھی۔ جس راجا نے ہستناپور کی تباہی کے بعد یہاں پہلی بار سکونت اختیار کی وہ نی چک شو تھا۔ بدھا کے معاصرا دین کا باپ پرن تپ اسی بھرت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

(9) **کورو** : کوروؤں کی مملکت دلی سے متصل تھی۔ اس کے شہروں میں اند پتہ (اندر پرستھ) اور ہت تھنی پور (ہستناپور) کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ کوروؤں نے اپنی سیاسی طاقت اب کھو دی تھی۔

(10) **پنچال** : یہ علاقہ اندازا موجودہ روہیلکھنڈ اور وسطی دوآب کے کچھ حصے سے مطابقت رکھتا تھا اس کے دو حصے تھے۔ شمالی اور جنوبی۔ گنگا ان دونوں کی حد فاصل تھی۔ ان دونوں کی راجدھانیاں' علی الترتیب اہچ چھتر اور کام پلیہ تھیں۔ پنچال کا ایک قدیم راجا دم مکھ (درمکھ) ہر میدان میں کامیابی اور کامرانی کے لئے ممتاز ہے۔

(11) **مچھ یا متسیہ** : متسیہ خاندان جمنا کے مغرب اور کوروؤں کی ریاست کے جنوب میں حکومت کرتا تھا۔ وراٹ نگران کی راجدھانی تھی (موجودہ بیراٹ' ریاست جے پور)

(12) **سورسین** : سورسین اس ریاست کے مالک تھے جس کی راجدھانی تھراتی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں یادو گھرانے نے بڑی قابلیت سے حکومت کی۔

(13) **اس سک** : بدھا کے زمانے میں اس سک خاندان کے لوگ دریائے گوداوری پر

Marfat.com

سکونت پذیر تھے۔ اور ان کا خاص شہر پوتلی یا پوتن تھا، لیکن جب فہرست مرتب کی گئی تو معلوم ہوا ان کا علاقہ اونتی اور متھرا کے درمیان میں پھیلا ہوا تھا۔

(14) **اونتی یا مغربی مالوہ** : اس کا دارلسلطنت اجین تھا۔ اس کے جنوبی حصے کا بڑا شہر ماہتی یا ماہشمتی (موجودہ مان دھاتا) تھا، جہاں قدیم زمانے میں ہے ہیہ خاندان حکومت کرتا تھا۔

(15) **گندھار** : اس کا دارالسلطنت ٹکشیلا تھا (موجودہ ٹکسیلا ضلع راولپنڈی) اس ریاست میں غالباً کشمیر بھی شامل تھا۔

(16) **کمبوج** : یہ خاندان شمال مغرب میں بھی اقتدار رکھتا تھا۔ لوحی دستاویزات اور ادب میں انھیں گندھارا سے متعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہم راج پور اور دوارکا کا حال بھی سنتے ہیں جو اس کے اہم شہر تھے۔

یہ فہرست کئی جہتوں سے بہت عجیب ہے۔ اس میں انگ اور کاشی کا ذکر خود مختار ریاستوں کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور اڑیسہ، بنگال یا اونتی سے جنوب کے کسی ایک مقام کا اس میں ذکر تک نہیں کیا گیا ہے۔

ہندستان بدھا کے زمانے میں

(1) جمہوری یا خود مختار قبیلے :

پالی ادب سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بدھا کے زمانے میں شخصی حکومتوں کے علاوہ بہت سی جمہوری یا خود مختار ریاستیں بھی پائی جاتی تھیں جن میں سے بعض معمولی حیثیت رکھتی تھیں، لیکن بعض کافی طاقت ور تھیں۔ ان قبیلوں میں سے حسب ذیل کا حال ہمیں معلوم ہے۔

(1) کپل وتھو، یا کپل وستو کے شاک قبیلے کے لوگ یہ قبیلہ نیپال اور برطانوی علاقہ (اب آزاد برصغیر) کی سرحد پر آباد تھا۔ ان کی راجدھانی کو موجودہ تلورا کوٹ کے مماثل بتایا گیا ہے۔ یہ اپنا سلسلہ، نسب سورج ونشی نسل کے اکش واکو سے ملاتے تھے۔

(2) **سن سوگمری کے بھگ** : یہ ایک قدیم قبیلہ تھا جو ایتر یہ براہمن کے بھرگ قبیلے سے مماثل تھا۔ ڈاکٹر جیسوال کی رائے ہے کہ ان کا صدر مقام مرزا پور کے ضلع میں کہیں واقع تھا۔

(3) **الاکپ کے بلی** : ان کے متعلق ہمیں زیادہ معلوم نہیں۔ یہ **وتھ** دیپ کی ریاست کے قرب و جوار میں، غالباً موجودہ شاہ آباد اور مظفر پور کے درمیانی علاقے میں آباد تھے۔

(4) **کیس پت کے کالم** : ان کی راجدھانی کا تعین مشتبہ ہے۔ کیا ان کا تعلق کیشنوں سے ہے، جن کا ذکر ست پتھ، براہمن میں پنچالوں کے ذیل میں کیا گیا ہے؟ بدھا کے عظیم استاد

Marfat.com

آکر اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

(5) **رام گام کے کولیہ** : یہ شاکیوں سے مشرق میں آباد تھے اور دریائے روہنی ان دونوں علاقوں کی حد فاصل تھی۔ ان کے باہمی تعلقات عام طور پر خوش گوار رہتے تھے' لیکن ایک مرتبہ روہنی کے پانی پر ان میں آپس میں جھگڑا ہو گیا۔

(6) **پاوا کے ملا** : کننگھم نے انھیں گورکھ پور کے ضلع میں پڈرونا کے مماثل قرار دیا ہے۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ فاضل پور قدیم پاوا کی جگہ آباد ہوا ہے۔

(7) **کشی نارا کے ملا** : یہ موجودہ کسیا کے مماثل تھے۔ جہاں ایک چھوٹا سا مندر دریافت کیا گیا ہے۔ اس میں بدھا کا ایک عظیم الجثہ مجسمہ ہے جس میں انہیں پری بتان (پری نروان) آسن میں پیش کیا گیا ہے۔

(8) **پپ پھلی بن کے موریہ** : ان کی راجدھانی کا تعین مشتبہ ہے۔ انھیں شاکیوں ہی کی ایک شاخ بتایا جاتا ہے یہ نام ان کا اس لئے پڑا کہ یہ مقام ہمیشہ موروں (مور) کی آواز سے گونجتا تھا۔

(9) **متھلا (نیپال کی سرحد کے اندر موجودہ جنک پور) کے ودیہہ** : ودیہہ میں کبھی مشہور و معروف راجا جنک حکومت کیا کرتا تھا جس کا ذکر اپ شدوں میں آیا ہے۔ لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اب اس میں شخصی حکومت نہیں رہی تھی۔

(10) **ویشالی یا ضلع مظفر پور میں موجودہ بساڑ کے لچھوی** : اس وقت یہ ایک اہم قبیلہ تھا۔ یہ چھتری تھے اور اسی نسبت سے انھیں بدھا کے تبرکات کا حصہ ملا۔ انھوں نے مہاویر اور بدھا دونوں سے رابطہ قائم کیا اور ان کے خطبوں اور تعلیمات سے کما حقہ' فائدہ اٹھایا۔ اس کی شہادت بھی ملتی ہے کہ لچھوی ریاست کی حکمراں مجلس میں 7707 راجا شامل تھے۔ لچھوی قبیلے کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کی اس حکمراں مجلس کی نشستیں اکثر ہوتی تھیں اور حاضری مکمل ہوتی تھی۔ ان مجلسوں میں بحث و مباحثہ ہوتا تھا' مگر ہمیشہ اتحاد و اتفاق کا ماحول طاری رہتا تھا۔

شاکیوں کی تفصیلات :

چونکہ بدھا خود شاکیہ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے' اس لئے بدھ مذہب کی کتابوں میں ظاہر ہے شاکیوں کی تفصیلات زیادہ ملتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے ارباب حل و عقد میں سب سے اہم صدر ہوتا تھا' جو راجا کہلاتا تھا۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ وہ شرفا کے کسی مخصوص خاندان سے چنا جاتا تھا یا کسی خاص مدت کے لئے اس کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ چنانچہ بدھا کے باپ سدودھن راجا تھے اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے چچیرے بھائی بھدریہ بھی اسی عہدے پر فائز رہے۔ قبیلے کا سار کام کھلی سبھا میں ہوتا تھا جو سنتھا گار (یا ہال)

Marfat.com

میں منعقد ہوتی تھی۔ اس میں جوان بوڑھے' امیر' غریب سب شریک ہوتے تھے۔ بدھ مذہب کی کتابوں سے ہمیں یہ اندازہ بھی پوری طرح ہو جاتا ہے کہ سبھا میں جو بدھ سنگھ کے نمونے پر تشکیل کی گئی تھی معاملات پر کس طرح غور کیا جاتا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ سبھا کے جلسے پابندی سے ہوتے تھے اور ان میں نشست کا انتظام بہت باقاعدہ کیا جاتا تھا۔ یہ کام ایک خاص افسر پناپک یا آسن پر گیاپک کے سپرد تھا۔ ہر جلسے میں مقررہ تعداد کی حاضری ضروری تھی' لیکن سبھا کے صدر (ونے دھر) کا شمار کورم کے لئے نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک خاص افسر کی حاضری کا بندوبست کرے۔ سبھا کی کاروائی کی تجویز (نتی یا گیاپتی) کی پیشی (استھاپنا) سے شروع ہوتی تھی جس کے فوراً بعد اعلان (انسادنم) کر دیا جاتا تھا۔ بحث و مباحثہ صرف زیر غور تجویز تک محدود رہتا تھا۔ بے مطلب باتوں سے پرہیز کیا جاتا تھا اور کوشش یہ کی جاتی تھی کہ کوئی جھگڑا درمیان میں نہ ہو۔ منظور شدہ تجویز (پرتگیہ) ایک بار رگیاپتی دو ہتیہ کم اور بعض اوقات تین بار (گیاپتی چتتھ کم) پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ تجویز پر اراکین کی خاموشی منظوری کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب اختلاف رائے پایا جاتا تھا تو اس کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جاتا تھا۔ مثلاً" معاملہ غور و خوض کے لئے کسی چھوٹی سی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا تھا تاکہ تجویز بہ اتفاق آرا منظور ہو۔ اگر اتفاق آرا ممکن نہ ہوتا تو رائیں (چھند) کر لی جاتی تھیں۔ رائے شماری ٹکٹوں (سلاکار) کے ذریعے ہوتی تھی۔ عام طور پر مختلف رنگ کی لکڑی کی پٹیاں مختلف رائیں ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ رائے شماری کرنے والے افسر کو سلاکا گاھاپک کہتے تھے۔ اس سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ کسی قسم کے تعصب' عناد' یا خوف کا مظاہرہ نہ کرے۔ رائے دینے میں ہر شخص کلیتاً آزادی رکھتا تھا اور کسی پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اکثریت کی رائے (لئے بھیہ سکم) فیصلہ کن مانی جاتی تھی کسی مسئلے میں جب ایک بار فیصلہ ہو جاتا تو اسے دوبارہ نہیں چھیڑا جا سکتا تھا۔ منشی یا کلرک تمام کاروائی کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ اس طرح تمام طریقہ کار صحیح معنوں میں جمہوری طرز کا تھا۔ کئی جہتوں سے اسے جدید پارلیمانی طریقہ کار کا ابتدائی نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

قبیلے کی گذر بسر کا دارومدار چاول کی پیداوار پر تھا۔ ان کے مویشی گاؤں کی مشترکہ زمینوں یا بنوں میں چرتے تھے۔ کئی کئی گاؤں مل کر ایک جتھا بنا لیتے تھے گاؤں میں زیادہ تر ایک ہی پیشہ کرنے والے آباد ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر کمہار' لہار' سنار' بڑھی' یا پوجا پاٹ کرنے والے سب اپنی اپنی جداگانہ بستیاں بسا لیتے تھے۔ شاکیہ قبیلے کے لوگ عام طور پر پر امن تھے اور چوری یا دیگر جرائم ان کے علاقے میں کمیاب تھے۔ غالباً ان کے یہاں کولیوں کی طرح پولیس کا باقاعدہ انتظام تھا ان کے پولیس کے افسر ایک خاص قسم کی ٹوپی سے پہچانے جاتے تھے اور اپنے جبر و تشدد کے لئے بدنام تھے۔ مجرم جب گرفتار کر لیا جاتا تھا تو اسے عدالت میں پیش کیا جاتا جہاں بڑی احتیاط کے ساتھ اس پر مقدمہ چلایا جاتا تھا۔ بدھ گھوش نے مہا پری نبان سوت کی جو تفسیر "اٹھ کتھا" لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجی قبیلے کے لوگ عدالت کا ایک بہت پیچیدہ نظام

Marfat.com

رکھتے تھے۔ وہ سزائیں اپنی کتاب "نظائر" (پونیو پوتھک) قانون کے پنڈت (سوتر دھر) آٹھ اراکین پر مشتمل مجلس (آٹھ کل)' سپہ سالار (سیناپتی)' نائب کار پرواز (اپ راجہ)' اور کارپرداز (راجہ)' سب یکے بعد دیگرے اور پے در پے کسی شخص کو مجرم قرار دیتے تب اسے سزا دی جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی عدالت اگر ملزم کو بے گناہ پاتی تو اسے بری کر سکتی تھی۔

شخصی حکومتیں :

بدھا کی زندگی میں ملک کی سیاسیات میں جو اہم ترین واقعہ رونما ہو وہ تھا کوشامبی (وتس)' انتی' کوشل اور مگدھ وغیرہ ریاستوں کا عروج۔ ان پر اب طاقتور حکمران حکومت کر رہے تھے۔ جنھوں نے توسیع سلطنت اور پڑوسی ریاستوں کو ضم کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں آپس میں اختلافات و نزاعات پیدا ہو گئے اور آخر میں وہ سب کے سب ایک زبردست سلطنت میں ضم ہو گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ (1) وتس : اس ریاست کی راجدھانی کوشامبی یا کوسمبی الہ آباد کے جنوب میں جمنا کے کنارے واقع تھی۔ اس علاقے کا حکمران بھرت خاندان کے ستانیک پرن تپ کا لڑکا ادین یا ادین بدھا کا معاصر تھا۔ روایت میں اس کی محبت اور جنگ کے کارناموں کی بے شمار داستانیں محفوظ ہیں۔ مثال کے طور پر ادین دتھو سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ انتی کے راجا پچوت (پردیوت) نے اسے غالبا جنگ میں گرفتار کر لیا' لیکن اس نے بڑی چالاکی سے اپنے حریف کی لڑکی واسل دتا ا واسودتا کو اغوا کر لیا اور اپنی راجدھانی میں لا کر اس کے ساتھ شادی کر لی۔ اسی طرح دوسری داستانوں میں ادین کی رانیوں کا ذکر آتا ہے جن میں سے ایک دھردھ ورمن کی لڑکی تھی جسے اس نے انگ کی راج گدی دلوائی اور دوسری مگدھ کے راجا ورشک کی بہن پدماوتی تھی۔ اس کے علاوہ سنسکرت کی بعد کی کتابوں کتھا سرت ساگر اور پریہ درشکا سے ہمیں اس کی دگ وجے اور دور دراز کلنگ میں فتوحات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روائتوں کے ان مضمرات پر اعتماد کرنا مشکل ہے' لیکن یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ ادین ایک طاقتور حکمران تھا اور وہ اپنے معاصرین سے برسرپیکار رہتا تھا' نیز اس نے اونتی مگدھ اور انگ کی ریاستوں سے ازدواجی رشتے قائم کئے۔

ہم نہیں جانتے کہ اس کے بعد اس کا لڑکا لودھی کمار گدی نشین ہوا یا نہیں' البتہ کتھا سرت ساگر ہمیں پتہ دیتی ہے کہ پردیوت کے لڑکے پالک نے کوسمبی کی ریاست کو اونتی میں شامل کر لیا۔

آخر میں بدھا کے زمانے سے کوسمبی بدھوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ادین شروع شروع میں نئی تعلیمات سے متاثر نہیں ہوا' لیکن بعد میں پنڈول نامی بدھ بھکشو کی گفتگو سے وہ مطمئن ہو گیا۔

(2) اونتی : اس عہد میں اونتی پرچنڈ پچوت (پردیوت) حکومت کرتا تھا۔ اجیانی اس کی

Marfat.com

راجدھانی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا' اس نے کوشامبی کے راجہ اوین اور شاید متھرا کے شورسین راجہ سے جو رونتی چو' بھی کہلاتا تھا' ازدواجی رشتے قائم کئے۔ پکوت فطرتاً ظالم اور ہوس پرست آدمی تھا پر ان مشاہد میں کہ اس نے "پڑوسی راجاؤں کو اپنا مطیع بنا لیا"۔ ہم نے متذکرہ بالا سطور میں اوین سے اس کی جنگ کا حال بھی پڑھا۔ اس کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ اجات شترو کو اپنی راجدھانی میں بچوت (پرديوت) کے حملے سے تحفظ کے لئے قلعہ بندی کرنی پڑی۔ اس کے جانشین سب کمزور تھے۔ تاریخ میں ان کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ البتہ ان سے پالک نامی راجہ نے کوسمبی کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا' لیکن گوپال کے لڑکے اجسک یا آریک نے جو اپنے بھائی پالک کے حق میں تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا تھا اسے شکست دے دی۔ اس کے برخلاف پرانوں میں ان دونوں کے درمیان ایک اور نام وشاکھ یوپ کا ملتا ہے اور اس کے بعد اونتی وردھن کا نام آتا ہے۔

اونتی بدھ مت کا دوسرا اہم مرکز تھا۔ بدھا کے کئی معتقدین مثلاً "مہاکچھان' سون' ابھے کمار' وغیرہ کا یہ مسکن تھا۔ ربس ڈے وڈس کا یہ خیال واقعی درست ہے کہ بدھ مت نے مگدھ نے جنم لیا اور اونتی میں لباس پہنا' یعنی پالی کی شرح اس زبان میں تصنیف ہوئی جو اس وقت وہاں رائج تھی۔

(3) **کوشل** : شمال ہند کے وسط میں کوشل کا عروج چھٹی صدی ق-م کے سیاسی ماحول کی اہم خصوصیت تھی۔ راجہ کنس' بدھا کے کوشل معاصر' پسے ندی (پرسین جت) کے مورثوں میں سے تھا۔ اس کے زمانے میں کوشل اور کاشی کی پرانی دشمنی ختم ہو گئی تھی اور کاشی کی ریاست کوشل میں ضم کر لی گئی تھی۔ کوشل کی قیادت تسلیم کر لی تھی۔ پسے ندی کو اکثر مقامات پر "پانچ راجاؤں کے جتھے کا سردار" ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مگدھ کے راجا بمبسار سے اس کی بہن کی شادی نے اس کی طاقت کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ لیکن یہی شادی کے بعد تو بمبسار کی بیوی کوشل دیوی بھی اس غم میں مر گئی۔ اس کے بعد پسے ندی نے شہر کاشی کو ضبط کر لیا جو کوشل دیوی کو "پاندان کے خرچ" (نہان چنا مول) کے بطور دیا گیا تھا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ کوشل اور مگدھ میں جنگ چھڑ گئی جو کچھ عرصے بڑے بیمانہ انداز میں جاری رہی۔ اس میں کبھی فتح ایک کی ہوئی کبھی دوسرے کی۔ آخر کار فریقین صلح پر مجبور ہو گئے۔ صلحنامہ کی رو سے پسے ندی نے اپنی لڑکی وجرا کی شادی اجات شترو کے ساتھ کر دی اور کاشی کی زمینداری جس میں نزاع تھا اس کے حق میں واگذاشت کر دی۔

پسے ندی کی تعلیم ٹکشیلا میں ہوئی تھی۔ وہ ایک وسیع القلب حکمران تھا۔ اس نے برہمنوں کو جاگیریں دی اور بدھ بھکشوؤں کو باغات سے نوازا اور ان کے لئے خانقاہیں بنوائیں۔ بدھا سے اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور وہ ان سے اکثر ملاقات کرتا اور مشکلات میں ان سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ پسے ندی نے ایک دفعہ اس پر اظہار تعجب کیا کہ یہ عظیم مصلح اپنے سنگھ

Marfat.com

(جماعت) میں اس قدر اتفاق و اتحاد کس طرح قائم رکھتا ہے جبکہ وہ خود انگلی مالا جیسے ڈاکوؤں کی لوٹ مار اور اپنے اہل خاندان اور وزرا کی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ پریشان رہتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ پسے ندی کے وزیر ڈگھ چار این نے اس کے بیٹے وڈوڈابھ (ورودھک) کو اکسا دیا اور اس نے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ جس کے نتیجے میں پسے ندی سے راج گدھی چھین گئی۔ پسے ندی نے اجات شترو سے مدد مانگی، لیکن راج گریہہ پہنچنے سے پہلے کوشل کے راجا نے تھکن اور فکرو پریشانی سے تنگ آکر کوشل کے شہر پناہ پر پہنچ کر دم توڑ دیا۔ اجات شترو نے اس کا جنازہ شاہانہ شان شوکت سے نکالا اور بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے وڈوڈابھ سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی۔

وڈوڈابھہ :

وڈوڈابھہ نے شاکیوں پر جو مظالم کیے ان کی وجہ سے اس کا دور حکومت بدنام رہا۔ بظاہر اس کا سبب یہ تھا کہ شاکیوں نے ایک غلام لڑکی واسبھ کھتیا کی شادی دھوکے سے اس کے باپ کے ساتھ کرا دی تھی۔ اس دھوکے بازی کا بدلہ لینے کے لئے اس نے یہ سب کچھ کیا۔ شاکیہ ریاست پر اس کے حملے کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ان آزادی کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتا تھا۔ ہم وڈوڈابھہ اور اس کے جانشینوں کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ پردہ جب پھر اٹھتا ہے تو کوشل مگدھ کے جزو کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

مگدھ :

ویدی ادب میں مگدھ کے علاقے سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کی سیاسی اہمیت اس خاندان کے وقت سے شروع ہوئی جس کا بانی برہ درتھ تھا۔ اس کا لڑکا جراسندھ جو بہت سی مبالغہ آمیز داستانوں کا ہیرو ہے، معلوم ہوتا ہے طاقتور حکمران تھا۔ چھٹی صدی ق-م میں اس خاندان کا زوال ہو گیا، کیونکہ پر بمبسار حکومت کر رہا تھا۔ اس کا تعلق ہریانک کل (ہریانک خاندان) سے تھا۔ وہ ایک معمولی سردار بھٹیہ کا لڑکا تھا۔ اسے سینیا یا سینکا بھی کہتے تھے۔ شروع شروع میں اس کا دربار گریوراج میں لگتا تھا، لیکن بعد میں اس کی راجدھانی اس کے محل کے اردگرد ایک دوسرے مقام پر بن گئی جس کا نام بجا طور پر لوگوں نے راج گریہہ رکھ دیا۔

شروع شروع میں بمبسار نے ازدواجی تعلقات کے ذریعے اپنے اثرات بڑھانے کی کوشش کی۔ اس کی خاص خاص رانیاں یہ تھیں۔ پسے ندی کی بہن کوشل دیوی، مجوی راجکمار چیٹیک کی لڑکی چیلنا، اور وسطی پنجاب کی راجکماری کشیما ندر۔ ان شادیوں سے نہ صرف بمبسار کی بزرگی و برتری معاصرین میں ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادیاں ہی مگدھ کے عروج کا سبب بن گئیں۔ مثال کے طور پر تنہا کوشل دیوی نے اپنے ساتھ کاشی جہیز میں لائی جس کی مال گذاری ایک لاکھ تھی۔

Marfat.com

بمبسار نے فوجی قابلیت سے بھی اپنی ریاست میں توسیع کی۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ برہم دت کو شکست دینے کے بعد اس نے بڑی دلیری سے انگ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جو موجودہ منگھیر اور بھاگپور کے ضلعوں سے مطابقت رکھتی تھی۔ پالی زبان میں بدھ گھوش کی تفسیر سے مگدھ کے حدود کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بمبسار کے عہد حکومت میں کئی دوسرے علاقے مگدھ میں ضم کر لئے گئے تھے۔ بدھ گوش کہتا ہے کہ بدھا کے زمانے سے بمبسار کے جانشین تک کے درمیانی وقفے میں مگدھ کے حدود سلطنت تقریبا دوگنے ہو گئے تھے۔ حکومت بہت منظم تھی اور مملکت کے بڑے بڑے عہدہ داروں کے کام کی جنھیں مہامتہ (مہاماتر) کہتے تھے سختی کے ساتھ نگرانی اور جانچ کی جاتی تھی قانون فوجداری کا نفاذ بھی بہت سختی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

بمبسار نے دور دراز کی ریاستوں سے بھی تعلقات قائم کئے' کیونکہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں گندھار کے پکوساتی نامی راجا نے سفارت بھیجی۔ ضمنی طور پر اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ گندھار تقریبا 516 ق۔م میں آکمینی فتح سے قبل ایک خود مختار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ حقیقت سے تقریبا نزدیک پہنچنے کے لئے ہم ایک اور طریقہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ لنکا کی تاریخیں شہادت دیتی ہیں کہ بمبسار کا دور حکومت 52 سال رہا اور بدھا کی وفات کے وقت اجات شترو 8 سال حکومت کر چکا تھا۔ گیگر اور دوسرے عالموں نے بدھا کی وفات 483 ق۔م قرار دی ہے۔ اس میں ساٹھ سال جمع کر دیئے جائیں (52+8) تو ہمیں بمبسار کی تخت نشینی کی تاریخ یعنی 543- (نفی) 44 دستیاب ہو جائے گی بمبسار بدھا کا شروع ہی سے مربی و محسن تھا اور اس نے بانسوں کے مشہور و معروف باغ (کرندونواں) بدھا کی طیب خاطر کے لئے ان کی نذر کیا۔ وہ بھکشوؤں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ اس نے بھکشوؤں کو بھی عطیات سے نوازا اور ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس راستے پر کہاں تک کامیابی کے ساتھ چل سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتراج ہین (اتراد ھین) سوتر اور دوسری جین مذہب کی کتابیں بمبسار کو مہاویر کا معتقد اور جین دھرم کا پیرو ظاہر کرتی ہیں۔

اجات شترو :

بمبسار کے بعد تقریبا 1' 4 ق۔م میں اجات شترو کو جسے کنک بھی کہتے ہیں مگدھ کی راج گدی ملی۔ باپ کی زندگی میں اجات شترو انگ کی راجدھانی چمپا کا وائسرائے تھا جہاں اس نے فن حکمرانی میں مہارت حاصل کی۔ روایت میں ہے کہ اجات شترو نے بدھا کے چچا زاد بھائی دیودت کے اکسانے سے جو سنگھ کی قیادت کا امیدوار تھا اپنے باپ کو قید کر دیا اور بھوکا مار ڈالا۔ اس داستان کو حرف بہ حرف تسلیم کرنا مشکل ہے' البتہ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ بمبسار کا انجام المناک ہوا اور اس میں مکرو فریب کو بھی شاید کافی دخل رہا۔ اس کے بعد سامن پھل سوت اجات شترو کو بدھا کے سامنے اس بہیمانہ جرم پر اظہار تاسف کرتے ہوئے ظاہر کرتا ہے اور

Marfat.com

یہ عظیم مصلح اس کی توبہ قبول کر لے اسے گھر "جانے اور آئندہ پاپ نہ کرنے" کی ہدایت کر دیتا ہے۔ بھاڑوت کی سنگ تراشی کا ایک نمونہ جو دوسری صدی ق-م کی یادگار ہے' اجات شترو کی بدھا سے ملاقات کی تصویر پیش کرتا ہے:

شوہر کی اس طرح دردناک موت سے کوشل دیوی کو صدمہ پہنچا اور فرط غم سے وہ بھی مر گئی۔ پسے ندی نے کاشی کی مالگذاری جو اس کے حق میں "پاندان کے خرچ" کے بطور واگذاشت کی گئی تھی ضبط کر لی۔ یہ واقعہ اجات شترو اور پسے ندی کی باہمی دشمنی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ دونوں میں ایک طویل عرصے تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا' جس میں پلہ کبھی ایک کا بھاری رہتا کبھی دوسرے کا۔ آخر کار دونوں میں صلح ہو گئی۔ صلحنامہ کی رو سے مگدھ کے راجا کو نہ صرف متنازعہ کاشی حاصل ہوا' بلکہ پسے ندی کی لڑکی وجرا سے اس کی شادی بھی ہو گئی اور اس کے بعد کاشی مستقل طور سے مگدھ کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

اجات شترو کے دور حکومت کا اگلا اہم واقعہ یہ ہے کہ اس کے اور لچھوی خاندان کے درمیان مجادلہ ہوا۔ اس مجادلہ کے اسباب کیا تھے' اس پر روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب یہ ہو کہ چیٹک نے اجات شترو کے سوتیلے بھائیوں کو جو اپنی بعض بیش قیمت اشیاء کے ساتھ ویشالی میں پناہ گزیں تھے' اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ لچھویوں نے ہیرے جواہرات کی ایک کان کے سلسلے میں اسے فریب دیا تھا۔ لیکن اصل سبب اس کا یہ تھا کہ وہ ہمسایہ لچھوی ریاست کو جس میں چند سردار مل کر حکومت کرتے تھے تباہ کرنا چاہتا تھا۔ اجات شترو جیسے جاہ پرست راجا کی نظروں میں ایک عرصے سے یہ ریاست کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اس نے یقینی طور پر فتح حاصل کرنے کے لئے تمام ضروری پیش بندیاں کر لیں۔ اس نے اپنے دو معتمد وزیروں۔ سنیدھ اور ساکر کو لچھوی سرداروں کے پاس گفت و شنید کے لئے بھیجا۔ بڑی احتیاط سے اس نے اپنی فوج کی تنظیم کی اور طاقتور اور مہلک ہتھیاروں سے اسے آراستہ کیا۔ جنگ اگرچہ طوفانی اور خوں آشام تھی لیکن اجات شترو کے حق میں فیصلہ کن ثابت ہوئی لچھوی علاقے پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ غالبا وشالی کی فتح کے بعد وہ فتوحات کرتا ہوا شمال میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہاڑ کے دامن میں تمام علاقوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ چنانچہ انگ' کاشی' ویشالی اور دیگر اردگرد کے علاقوں کے شامل ہو جانے سے مگدھ شمالی ہند کی سب سے طاقتور سلطنت بن گئی۔ ظاہر ہے اس سے اونتی کی آتش حسد بھڑک اٹھی' اور حالانکہ پردوتہ کے حملے سے تحفظ کے لئے اجات شترو نے اپنی راجدھانی میں قلع بندی کی' لیکن روایات سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اسے اس مہم میں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ پالی کتب میں اس کے عہد حکومت کی مدت 32 سال مندرج ہے۔ لیکن پرانوں میں یہ مدت 27 سال ظاہر کی گئی ہے۔ جین مذہب کی کتابوں میں اجات شترو کو جین مت کا پیرو بتایا گیا ہے' لیکن بدھ مذہب کی کتابیں ہمیں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ اجات شترو آخر عمر میں بدھا کے عظمت و جلال کا

Marfat.com

قائل ہو گیا تھا اور بدھا کی اخلاقی تعلیم ہی نے اسے دائمی سکون بخشا۔ اسی بنیاد پر اجات شترو بدھا کے تبرکات میں حصے کا دعوے دار ہوا ایک استوپ میں ان تبرکات کو اس نے محفوظ کر دیا۔

بدھا کی زندگی :

جین مت کی طرح، بدھ مت کے بانی بھی ایک ممتاز چھتری تھے ان کا گھریلو نام گوتم تھا۔ لیکن زیادہ تر انہیں ان کے روحانی لقب "بدھا" سے یاد کیا جاتا ہے وہ کپل دستو کے قریب لمبنی کے باغ (موجودہ رمندی یا روپن دہی) میں ماما کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کے باپ سدھودن ایک مشہور معروف شاکیہ قبیلے کے "راجا" تھے۔ بیٹے کی مفکرانہ طبیعت سے گھبرا کر انھوں نے کم سنی ہی میں ان کی شادی گوپا، یا یشودھرا کے ساتھ کر دی اور ہر قسم کا سامان عیش و عشرت ان کے لئے فراہم کر دیا۔ لیکن بیماری اور تکلیف سے بھری دنیا میں غور و فکر میں محو رہنے والے گوتم کو ان رنگینوں سے تسکین نہ ہوئی۔ چنانچہ جب وہ عمر کے انتیسویں 29 سال میں تھے تو ایک رات کو اپنی بیوی اور نوزائدہ بچے راہلا کو سوتا ہوا چھوڑ کر گوشہ نشینی کی زندگی میں سکون تلاش کرنے وہ محل سے نکل کھڑے ہوئے۔ اول انھوں نے اس زمانے کے دو ممتاز استادوں آلار کالام اور اوک رام پت سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن جب یہاں بھی انھیں دماغی سکون میسر نہ آیا تو گوتم موجودہ بودھ گیا کے قریب اوریلا کے جنگل کی تنہائیوں میں جا کر جسم کو سخت سے سخت تکلیف پہنچانے کی مشقیں کرنے لگے۔ انھوں نے ایسی زبردست ریاضت کی کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے۔ لیکن چونکہ وہ اپنی منزل سے ابھی کوسوں دور تھے اس لئے انھوں نے تزکیہ نفس کے اس تکلیف دہ طریقہ کو جو عام مگر عبث تھا، ترک کر دیا اور سلجاتا کے کہنے سے جو پیڑ پوجا کے لئے گئے ہوئے تھے دودھ پینا شروع کر دیا۔ آخر کار ایک دن، رات کے وقت جب وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے گھاس کی گدی پر بیٹھے ہوئے تھے تو انھیں نور نظر آیا اور وہ "بدھا" ہو گئے یعنی مکمل طور پر رمزیت کو سمجھ سکیں گے یا نہیں۔ اس لئے قدرے تامل کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام موجودہ سارناتھ میں شروع کیا۔ سب سے پہلے جنھوں نے ان کا مذہب قبول کیا وہ وہی پانچ بھکشو تھے جنھوں نے اوریلا کے جنگلوں میں یہ سمجھ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا کہ شرامن بدھا الذات دنیا کی خاطر ریاضت و نفس کشی کے راستے سے ہٹ گئے۔ ان کی زندگی کے اگلے 45 سال کا عرصہ سخت حرکت و عمل کا زمانہ تھا۔ انھوں نے لوگوں پر ان کی دیسی زبان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اور اپنی عمدہ تعلیم، بے پناہ مہربانی، اخلاقی بلندی اور سچی ہمدردی سے لوگوں کے دل و دماغ کو جیت لیا۔ راجا پرجا سب نے ان کی مدد کی اور بہت جلد ان کے "سنگھ" نے ایک طاقت ور تنظیم کی صورت اختیار کر لی۔ برصغیر میں اگرچہ بدھ مذہب کی رفتار کو ثبات و استقلال میسر نہ ہو سکا اور آج وہ اپنی جائے پیدائش میں بالکل مفقود و معدوم ہو گیا ہے لیکن مشرق اور مشرق بعید میں وہ آج بھی ایک طاقت ور مذہب ہے اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دل و دماغ پر مختلف عنوان سے حکمرانی کر رہا ہے۔

Marfat.com

بدھا کی تاریخ وفات :

ایک طویل عرصے تک کامیابی کے ساتھ تبلیغ و اشاعت کے بعد بدھا نے کوشی نگر (ضلع گورکھپور میں موجود کاشی) کے مقام پر اسی 80 سال کی عمر میں وفات پائی۔ کچھ سال ہوئے یہاں ان کا ایک عظیم الشان مجسمہ دستیاب ہوا ہے جس میں انھیں تکئے کے سہارے بیٹھے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تاریخ وفات کا تعین ایک مشکل کام ہے۔ اور سانحہ وفات ہی ہماری ترتیب وار تاریخ کے سلسلے کی سب سے اہم کڑی ہے۔ ونسنٹ اسمتھ نے تاریخ وفات 486-487 ق-م متعین کی ہے، لیکن 483 ق-م جو تمام واقعات اور حالات جانچنے کے بعد فلیٹ اور گیگر نے قائم کی ہے، حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔

بدھا کی تعلیمات :

بدھا کی تعلیمات بہت سادہ اور قابل عمل تھیں۔ انھوں نے آتما اور پرماتما سے متعلق مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بحث انسان کی اخلاقی ترقی میں مدد نہیں دے سکتی۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا کی ہر شے عارضی اور ناپیدار ہے (مردن اچن یا انت ین) اپنے وقت کے دوسرے معلموں کی طرح وہ سمجھتے تھے کہ انسان کا وجود ایک معصیت ہے، لیکن انسانی رنج و محن ایک بھیانک حقیقت ہے اور اس کے باعث وہ بے چین و متردو رہتے تھے" اس لئے انھوں نے تکلیف و غم کے اسباب کا تجزیہ کرنے اور اس کے خاتمے کا طریقہ دیافت کرنے پر پوری توجہ صرف کی۔ انھوں نے چار اعلیٰ حقیقتوں (چتاری آریہ سچالی کا اعلان بڑی شدود کے ساتھ کیا۔ یعنی تکلیف (دکھ) تکلیف کا سبب (دکھ سمودائے) تکلیف ختم کرنے کا راستہ (دکھ نرودھ گامنی پرتی پد)۔ ان کا قول تھا کہ تکلیف کی جڑ انسان کی "خواہش" (تنھا) ہے اس کا فنا کر دینا تکلیف کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ وہ اس کے قائل تھے کہ موت بھی اس سے چھٹکارا نہیں دلا سکتی، کیوں کہ مرنے کے بعد انسان دوسرا جنم لے لیتا ہے اور مزید تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس پیاس (تنھا) کو بجھانا صرف اس طرح ممکن ہے کہ لوگ آٹھ بہترین اصولوں کے راستے پر چلنے لگیں۔ وہ آٹھ اصول یہ ہیں: (1) راسخ عقیدہ (2) صاف خیالات (3) راست گفتار (4) نیک عمل (5) پاک روزی (6) صحیح کوشش (7) مناسب یاد داشت اور موزوں مراقبہ اسے درمیانی راستہ (مجھم مگا) کہتے تھے کیوں کہ اس کے ذریعے شدت کے ساتھ عیش پرستی اور ضرورت سے زیادہ زہد دونوں حدوں سے بچ کر نکلنا ممکن تھا۔ جو لوگ دنیا داری کو ترک نہیں کرنا چاہتے تھے وہ اس راستے پر چل کر کامیابی حاصل کر سکتے تھے جو لوگ سنگھ میں داخل ہو جاتے تھے وہ نبھان' یا نروان' یا "شخصیت کی فنا" کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ بدھا فکر، قول اور عمل کی پاکیزگی پر زور دیتے تھے۔ اسے تقویت پہنچانے کے لئے انھوں نے دس احکامات صادر کئے تھے۔ پہلے دس احکام پر عمل کرنا دنیا داروں کے لئے بھی ضروری تھا۔ وہ احکام یہ تھے

Marfat.com

(1) دوسروں کے مال پر لالچ کی نظر نہ ڈالو (2) کسی کی جان نہ لو (3) نشیلی چیزیں استعمال نہ کرو (4) جھوٹ نہ بولو (5) زنا نہ کرو (6) ناچ گانے میں شرکت نہ کرو (7) مالش کی چیزیں' پھول' عطریات استعمال نہ کرو۔ (8) نا وقت کھانا نہ کھاؤ (9) آرام دہ بچھونے پر نہ سوؤ اور (10) کسی سے روپیہ پیسہ نہ لو۔ نہ اپنے پاس رکھو۔ اس طرح بدھا نے اپنے چیلوں کے لئے خالص عملی زندگی کے اصول مرتب کر دیئے تھے۔ فلسفیانہ بحث و مباحثے کو وہ روحانی ترقی کے منافی سمجھتے تھے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی' جس سے سب مطمئن اور خوش تھے کہ ان کے پیغام کو مرد عورت' بوڑھے' بچے' امیر' غریب' برہمن شودر سب یکساں طور پر قبول کر سکتے تھے۔

جین مت اور بدھ کا باہمی تعلق :

ایک عرصہ تک عام خیال یہ رہا کہ جین مت بدھ مت کی ایک شاخ ہے یا اس کے برعکس بدھ مت جین مت کی شاخ ہے۔ اگرچہ دونوں مذہبوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں لیکن کسی ایک کا دوسرے کی شاخ ہونے کا تصور اب بالکل فرسودہ ہو گیا ہے۔ دونوں ویدوں پر ایمان نہیں رکھتے' رسموں کی افادیت کے دونوں منکر ہیں۔ پرماتما کے سوال کو دونوں نے نظرانداز کیا ہے۔ پیدائش کی بنیاد پر امتیازات کی دونوں نے مذمت کی ہے۔ اہنسا کے اصول اور آئندہ زندگی میں کرم (اعمال) کے اثرات پر دونوں نے زور دیا ہے۔ دونوں مذہبوں نے رائج الوقت عقائد اور توہمات کے ساتھ رواداری برتی ہے۔ بے شک دونوں مذہبوں میں بڑی واضح مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن بعض بنیادی مسائل میں ان کا نقطہ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مثال کے طور پر----- بدھ مت کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے "انا" سے عاری (اناتم داری) ہے۔ جبکہ جین مت سکھاتا ہے کہ کائنات کا ہر درہ ذی روح (جیو) ہے۔ جین مت ریاضت اور نفس کشی کی تقدیس کا قائل ہے۔ اس کے برعکس' بدھا نے درمیانی راستہ اختیار کرنے اور زاہد زندگی اور نفس پرستی کی حدوں سے بچ نکلنے کی تلقین کی ہے۔ نجات پا سکنے سے متعلق بھی ان کے نظریات بالکل یکساں نہیں ہیں۔ چونکہ دونوں مذہب ایک ہی ملک اور ایک ہی عہد میں پیدا ہوئے اس لئے ان میں یکساں خصوصیات کا پایا جانا غیر متوقع نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اختلافات بھی اس قدر نمایاں ہیں کہ ان میں رقابت کا سلسلہ بھی کافی عرصے تک جاری رہا۔

بدھا عہد کے اقتصادی حالت

(1) دیہاتی تنظیم :

جاتک کہانیوں' سُتّوں اور پالی زبان کی دیگر کتب سے ہمیں بدھ مذہب کے عروج کے وقت برصغیر کے اقتصادی حالات کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔ آجکل کی

Marfat.com

طرح اس زمانے میں بھی زیادہ تر لوگ گانوں میں رہتے تھے۔ گانو (گرام) کی آبادی نسبتاً بہت مختصر رقبے میں مرکوز ہوتی تھی اور تحفظ کے خیال سے جھونپڑیاں (گریہہ) بہت قریب قریب اور گھٹی ہوئی بنائی جاتی تھیں۔ گانو کے ارد گرد کھیت (گرام کشیتر) ہوتے تھے۔ جن میں کاشت کی جاتی تھی۔ کھیتوں کو پانی کی نالیوں کے ذریعے قطعوں میں تقسیم کر دیا جاتا یا مشترکہ مینڈوں کے ذریعہ ان کی حد بندی کر دی جاتی تھی۔ مقبوضہ حقیقتیں عام طور پر مختصر ہوتی تھیں' لیکن بڑی بڑی حقیقتوں کا وجود بھی معدوم نہ تھا۔ گانو سے متصل جو بن (ون ماداؤ پادائے) ہوتا' یا چراگاہیں ہوتیں' ان پر تمام گانو والوں کا مشترکہ حق ملکیت ہوتا تھا۔ ایک چرواہے (گوپالک) کی نگرانی میں جس کی مزدوری کا خرچ تمام گھر والے مجموعی طور پر برداشت کرتے تھے مویشیوں کو ان چراگاہوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔

گانو کی اقتصادیات کا دارومدار "دیہی حقیت داری" پر تھا۔ لیکن کوئی شخص گرام سبھا کی اجازت کے بغیر اپنے حصے کی زمین فروخت کر سکتا تھا نہ رہن رکھ سکتا تھا مالک اپنے کھیتوں کو خود جوتتا بوتا تھا' لیکن اکثر مزدوروں یا غلاموں سے بھی یہ کام لیا جاتا تھا۔ بڑی بڑی زمینداریاں یا بڑے بڑے زمیندار نہیں ہوتے تھے راجا گانو کے کھیا (گام بھوجک) کے ذریعے پیداوار کے چھٹے حصے تک بطور محصول وصول کرتا تھا۔ کھیا گانو کی اہم شخصیت ہوتا تھا۔ گانو میں حکومت کا کاروبار وہی چلاتا تھا۔ اس وقت یا تو اس کا عہدہ موروثی ہوتا تھا' یا گرام سبھا اسے منتخب کرتی تھی۔ گرام سبھا اسے گانو میں امن و امان قائم کرنے اور گانو کے تحفظ میں بھی مدد دیتی تھی۔ گانو والے پختہ مدنی شعور کے حامل ہوتے تھے۔ جب کبھی آبپاشی کے لئے نالیاں بنانی ہوتیں' یا کچے ہال اور قیام گاہیں تعمیر کرنی ہوتیں تو گانو کے تمام باشندے مل کر ان کاموں کو انجام دیتے تھے۔ اس قسم کے مفاد عامہ کا کاموں میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ بھرپور تعاون کرتی تھیں۔ مجموعی طور پر' ہر گانو خود کفیل ہوتا تھا اور لوگ سادہ اور تصنع سے پاک زندگی گذارتے تھے۔ کھاتے پیتے لوگوں کی تعداد اگرچہ کم تھی' لیکن نادار محتاج کوئی نہیں ہوتا تھا۔ جرائم کمیاب تھے۔ البتہ خشک سالی یا سیلاب کے باعث لوگوں کو بعض اوقات قحط کی تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

(2) شہر :

بدھ مذہب کی کتابوں میں بہت کم شہروں (نگروں یا نگموں) کا ذکر آیا ہے۔ ان میں خاص خاص کے نام یہ ہیں۔ بارنسی (بنارس)' راج گہہ (راج گریہہ)' کوشامبی وساونتھی (شراوستی)' وشالی (ویشالی)' چمپا' ٹکسیلا' ایوجھایا اجودھیا' اجینی (اجین)' متھر وغیرہ۔ پاٹلی پتر کی راجدھانی اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھی۔ شہروں کو قلعے بنا کر مستحکم کیا جاتا تھا اور مکانات کی تعمیر میں لکڑی اور اینٹ رہتے ہیں۔ امیر لوگ عالی شان مکانوں میں رہتے تھے جن کی دیواروں پر استر کاری ہوتی تھی اور اندر اور باہر ان پر رنگ و روغن کیا جاتا تھا۔ شہروں میں آرام و آسائش کا سامان زیادہ مہیا رہتا تھا اور لوگ مسرت و اطمینان کی زندگی گذارتے تھے۔

Marfat.com

(3) صنعت و حرفت :

لوگوں کا خاص پیشہ تو زراعت ہی تھا' لیکن دوسرے حرفوں میں بھی لوگوں نے کافی ترقی کر لی تھی' مثلاً" بڑھئی کا کام جس میں بیل گاڑیاں اور کشتیاں بنانا بھی شامل تھا۔ تعمیر' چمڑے کا لباس تیار کرنا' مٹی کے برتن بنانا' ہار گوندھنا' کپڑا بننا' ہاتھی دانت کا کام' مٹھائیاں بنانا اور زیورات اور قیمتی دھاتوں کا کام۔ دوسرے پیشے (بین سب) بھی پائے جاتے تھے۔ مثلاً" چمڑا کمانا' مچھلی پکڑنا' شکار کھیلنا' ناچنا' اداکاری' سپیرے کا کام اور کپڑا بننا وغیرہ ان پیشوں کے ساتھ سماجی پستی کا تصور وابستہ تھا۔ عام طور سے نوجوان اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس مثالیں بھی ملتی ہیں' کیونکہ ہمیشہ پیشے سے کسی کی ذات طے نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جولاہا تیر انداز بن جاتا' چھتری کھیتی باڑی کرنے لگتا اور برہمن تجارت کا پیشہ اختیار کر لیتا' یا بڑھئی کا کام کرنے لگتا' یا مویشیوں کی دیکھ ریکھ شروع کر دیتا۔

(4) ہم پیشہ لوگوں کی انجمنیں :

ایک ہی پیشہ اختیار کرنے والے اپنے اپنے پیشوں کی انجمنیں (شیرینی) بنا لیتے اور کسی ایک مقام' محلہ' یا کوچہ (وٹھی) میں رہنے سہنے لگتے یا اپنے پیشے کا علیحدہ مرکز بنا لیتے تھے۔ جاتکوں میں اس قسم کے کم از کم اٹھارہ گروہوں کا ذکر موجود ہے۔ ہر انجمن کا ایک صدر (پرمکھ) یا "میر بلدہ" (جیشٹھک) ہوتا تھا۔ یہ ایک بہت ذمہ دار اور باعزت عہدہ دار ہوتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ قرابت' یک رنگی اور اتصال پیدا کرنے کے لئے کئی کئی انجمنیں (یاورگ) متحد ہو کر ایک مشترک مکھیا یا چودھری کے ماتحت کام کرتی تھیں۔

(5) تجارت اور تجارتی راستے :

اس زمانے میں تجارت' اندرونی اور بیرونی دونوں سطحوں پر کافی چست تھی۔ بیوپاری ریشمین کپڑا' تن زیب' چاقو' زرہ بکتر' زر بفت' زردوزی' نمدا' عطریات' مشروبات ہاتھی دانت کی چیزیں اور زیورات وغیرہ کی تجارت میں خوب نفع کماتے تھے۔ ملک کے بڑے بڑے دریاؤں پر وہ لمبے لمبے سفر کرتے اور مشرق میں تامر لپتی (تملوک) سے اور مغرب میں بھاردکچھ (بھڑوچ) سے ساحلی سفر بھی اختیار کرتے تھے۔ باویرو' (بابل) تک بحری سفر کے حوالے بھی ملتے ہیں' ملک کے اندر بیوپاری مقررہ شاہراہوں پر جو ملک کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے ملاتی تھیں آمدورفت رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک ساو تھی (شراوستی) سے پٹشان یا پرشٹھان (نظام کی ریاست میں موجود پیٹھان) تک جاتی تھی۔ دوسری ساو تھی کو راج گرہ سے ملاتی تھی۔ تیسری پہاڑ کے دامن میں کنارے کنارے سراوستی سے ٹکسیلا کو جاتی تھی اور چوتھی کاشی کو مغربی ساحل کے بندر گاہوں سے ملاتی تھی۔ ریگستان کی ٹھنڈی راتوں میں کارواں ستاروں کے سہارے

Marfat.com

یا "خشکی کے راہنما" کی مدد سے ریگستان پار کرتے تھے۔ ان راستوں میں خاص کر جن میں آمدورفت کم رہتی تھی، رہزنوں کی کثرت تھی جو تجارت کا سامان جب موقع ملتا لوٹ لیتے تھے۔ بیوپاری اس قسم کے خطرات سے زیر بار ہوتے تھے، اس کے علاوہ جس ریاست سے وہ گذرتے تھے وہاں انھیں محصول یا چنگی ادا کرنی ہوتی تھی۔ اس صورت میں ظاہر ہے تجارتی اشیا کافی مہنگی رہتی ہوں گی۔

(6) روپیہ پیسہ :

مبادلے کا دور اب ختم ہو رہا تھا۔ اب لین دین میں آسانی کے لئے ایک سکہ چل پڑا تھا۔ جسے کہاپن (کارشاپن) کہتے تھے۔ یہ تانبے کا ہوتا تھا اور اس کا وزن 146 گرین تھا۔ اس کا معیار قائم کرنے اور کھرے کھوٹے کی پہچان کے لئے بیوپاری یا شرِنبان (ہم پیشہ لوگوں کی انجمنیں) اپنا ٹھپا اور پر لگا دیتی تھیں۔ پالی کتب میں دوسرے سکوں کا نام بھی آتا ہے مثلاً سونے کے نکھ اور سون تانبے کے چھوٹے چھوٹ نقلی سکے بھی چلتے تھے جنھیں ماشک اور کاک نکا کہتے تھے۔ قرضوں اور سود (ودھی) کی دستاویزات کا ذکر بھی سننے میں آتا ہے لیکن بینکوں کا کوئی سوال اس وقت نہیں تھا اور پس انداز کئے ہوئے روپے کا زیور بنوا لیا جاتا تھا، یا گھڑے میں بند کر کے اسے زمین میں دفن کر دیا جاتا یا کسی دوست کی امانت میں اسے رکھ دیا جاتا تھا اور اس کا تحریری ثبوت اپنے پاس محفوظ کر لیا جاتا تھا۔

Marfat.com

باب 7

برصغیر میں یونانی آرٹ و کلچر

(GREEK ART AND CULTURE)

کنشک کو چینی بدھ کتابوں میں چندن کنی کا (CHANDAN KANIKA) یعنی گندھارا کا (شاہ) کنشکا لکھا ہے۔ چندن اور گندھ مترادف اور متبادل الفاظ ہیں اور ان کا یہ استعمال عام ہے۔ کنشکا کا خطاب اس کے سکون پر شاؤنانوشاؤ (SHAONANOSHAO) یا خالی (SHAO) ہے۔

شاؤیا شاہ کا یہ خطاب بعد میں کدارا شاہی 390ء تا 460ء پھر ترکی شاہی نے جو اپنے آپ کو کنشک کی نسل سے منسوب کرتے تھے اور جن کا دارلسلطنت اول کابل تھا۔ مگر 870ء میں جب انہیں یعقوب بن لیث صفاری نے شکست دی تو انہوں نے اپنا دارالسلطنت کابل سے ادھند (UDABHANDAPURA) یعنی موجودہ ہنڈ (HUND) جو دریائے سندھ پر ایک جائے عبور ہے بدل لیا۔ اس کے بعد ہندو شاہی حکمران (999 تا 1014ء) نے کشان خاندان کی تقلید میں یہی لقب استعمال کیا۔ اس میں کدارا کشان اور ترکی شاہی تو تھے ہی کشان قوم سے مگر بعض مورخین نے ہندو شاہی کو بھی کشان لکھا ہے۔

پشاور کے نواح میں اس ڈھیری کا نام جہاں سے کنشک کا تبرکدان (KNISHKA CASKET) کھدائی میں دستیاب ہوا تھا' غالبا اسی مناسبت سے شاہ کی ڈھیری اور بعد میں شاہ جی کی ڈھری پڑا ہو گا یہ کھدائی ڈاکٹر ڈی بی اسپونر (DR. D.B. SPOONER) نے 1908ء میں کی تھی۔

لفظ شا سب سے اول ایران کے ہخا منشی شہنشاہ خشیار شا (KHSHAY ARSHA) نے اپنے نام کے ساتھ استعمال کیا۔ خشیار شا کو یونانی مورخوں نے (XEXES) لکھا ہے اور اس کا دور عہد 486 تا 465 ق۔م ہے۔

سنسکرت میں چندن صندل کو کہتے ہیں جو ایک خوشبو دار لکڑی ہوتی ہے اور گندھ سار بھی صندل کی لکڑی کو سنسکرت میں کو کہتے ہیں۔ اس لئے گندھ اور چندن مترادف الفاظ ہیں۔

چنگ یوہ (CHNG YUEH) جنہوں نے (BUDDHIST RECORDS OF THE WESTERN WORLD) کا دیباچہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ گندھارا کے پہاڑ خوشبو کے پہاڑ (PERFUME MOUNTAIN) کہلاتے ہیں۔ اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نام گندھارا یا گندھاری کی وجہ تسمیہ یہ لفظ گندھ معنی

Marfat.com

خوشبو ہے یعنی خوشبو کا ملک۔ دریائے سندھ سے مشرق کا علاقہ اپنے سدا بہار سبزے کی وجہ سے پٹھوار (پوٹھوہار) کہلاتا ہے بالکل اسی ردیف اور خوشبو کی خصوصیت کی بنا پر یہ علاقہ گندھار کہلایا ہو گا۔

سردی کی بارش کو آج بھی اس علاقے میں گندھار کہتے ہیں ممکن ہے کہ اس لحاظ سے گندھ سے گندھارا کا نام پڑا ہو۔ گندھارا میں آج بھی سردی میں بہت بارش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ گندھار ایک راگ کا بھی نام ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں کے لوگ ایک خاص سر اور لہجے میں گاتے ہیں۔ گندھاروا (GANDHARVA) یا گندھرب آفاقی مطرب گانے والے کو بھی کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں کے لوگ گندھار۔ راگ میں اکثر گاتے ہیں اس لئے ملک کا نام گندھارا ہو گیا ہو۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ ایک ارین (ARIAN) سردار جس کا نام گنڈرے (GANDARAE) تھا اور جس نے اس علاقے میں ایک نو آبادی ترتیب دی تھی اس کے نام پر اس ملک کا نام گنڈارا پڑ گیا۔ یہاں لفظ ارین (ARYAN) کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا چونکہ ارین (ARIAN) نام کا کوئی قبیلہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ اگر یہ لفظ آرین (ARIAN) ہے تو اس کا ذکر رگ یا دوسری ویدوں میں ہوتا۔ راوی نے بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

ان تمام وجوہ میں سب سے اول وجہ خوشبو کا ملک گندھارا کی اصل وجہ تسمیہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رو کی ماں شاہزادی گندھاری گندھارا کی رہنے والی تھی۔

گندھارا آرٹ (GANDHARA ART) :

جس چیز کو آج کل گندھارا آرٹ کا نام دیا جاتا ہے وہ دراصل آرین' یونانی' ساکا' پارتھی اور کشن تہذیبوں کا نچوڑ ہے۔ گندھارا آرٹ کو ہماری تہذیب میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ اس لئے عربوں کی آمد سے پیشتر کی تہذیب کا سب سے حسین مرقع گندھارا آرٹ ہی ہے۔ گندھارا آرٹ کا مرکزیوں تو ٹیکسلا تھا لیکن اس کی جڑیں پشاور' مردان' سوات' افغانستان حتی کہ وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ٹیکسلا' پشاور۔ اور سیدو شریف کے عجائب گھر گندھارا آرٹ کے شاہکاروں سے بھرے ہوئے ہیں۔

(الف) گندھارا آرٹ پر یونانی چھاپ :

(1) ٹیکسلا کی بستی مہا بھارت سے بھی قدیم ہے لیکن آبادی کے جو آثار اب تک دریافت ہوئے ہیں وہ ہخا منشی اور موریہ دور سے پرانے نہیں ہیں۔ موریوں کے عہد تک جس بستی کو ٹیکسلا کہتے تھے اس کے کھنڈر عجائب گھر اور ریلوے اسٹیشن کے درمیانی رقبے میں بھیر کے مقام پر ملے ہیں۔ بھیر کی کھدائی میں موئن جو دڑو' ہڑپہ کی مانند عمارتوں کے کھنڈر تو نہیں ملے البتہ سب سے نچلی تہہ میں نیو کے نشانوں سے پتہ

Marfat.com

چلتا ہے کہ بعض مکانات خوش حال لوگوں کے تھے اور بعض غریبوں کے اور دونوں طبقے الگ الگ حصوں میں رہتے تھے۔ البتہ ہر گھر میں پچیس تیس فیٹ گہرا ایک چہبچہ ہوتا تھا جس میں غلاظت پھینک دی جاتی تھی۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جو ٹیکسلا کی بعد کی بستیوں میں نہیں ملتی اور نہ موئن جو دڑو' ہڑپہ یا مصر و عراق کے قدیم شہروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شہر میں بھنگیوں یا اچھوتوں کا کوئی طبقہ نہ تھا جس سے غلاظت کی صفائی کا کام لیا جاتا۔ البتہ شہر میں کنواں ایک بھی نہ تھا بلکہ لوگ قریب کے نالوں سے پانی بھر لاتے تھے۔ بستی میں ایک بہت بڑا کمرہ (ہال) تھا جس کی چھت ستونوں پر کھڑی تھی۔ اس جگہ سے مٹی کی بہت سی ابھرواں مورتیاں ملی ہیں۔ ہرا بھرواں تختی پر ایک عورت اور مرد ہاتھ میں ہاتھ دئے کھڑے ہیں۔ شاید ہندوؤں کی عبادت گاہ رہی ہو۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو پھر تاریخ میں ہندوؤں کا سب سے پرانا مندر یہی قرار پائے گا۔

(2) دوسری اور تیسری تہیں سکندر اور موریہ عہد کی ہیں۔ اس وقت تک لوہے کا استعمال بہت عام ہو چکا تھا۔ چنانچہ گھریلو استعمال کے برتن۔ کھیتی باڑی کے آلات و اوزار اور اسلحے سب لوہے کے بنے ملے ہیں۔ ان کے علاوہ چڑھاوے کی بکثرت ایسی تختیاں نکلی ہیں جن میں عورت مرد ساتھ کھڑے ہیں۔ باختر سے تجارت کے آثار بھی ملے ہیں۔ چوتھی یعنی سب سے بالائی سطح پر چاندی کے 166 ٹھپہ دار سکے اور یونانی طلائی سکے' چاندی سونے کے زیور' ایک یونانی بادیہ اور سکندر اعظم کے سرکی مورت ملی ہے۔

(3) ٹیکسلا کی دوسری بستی سرکپ کہلاتی ہے۔ اس کو دوسری صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے آباد کیا تھا۔ یہ شہر تقریباً تین صدی تک یونانیوں' ساکاؤں' پارتھیوں اور ابتدائی کشنوں کی راجدھانی رہا تھا۔ سرکپ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ سیالکوٹ کے راجہ سالی وان کا بیٹا رسالو ایک دن شہر کے باہر ہوا خوری کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک جھونپڑی کے سامنے سے گذرا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑھیا چولھے کے پاس بیٹھی گاہ ہنستی گاتی ہے اور گاہ رونے لگتی ہے۔ رسالو کو بڑھیا کی اس حرکت پر بڑی حیرت ہوئی اور وہ بڑھیا کے پاس جا کر پوچھنے لگا کہ مائی کیا بات ہے جو تو کبھی گاتی اور ہنستی ہے اور کبھی رونے لگتی ہے۔ بڑھیا نے کہا کہ یہاں آدم خور راکششوں کا ایک گھرانا رہتا ہے۔ وہ سات بھائی بہن ہیں۔ بھائیوں کے نام سرکپ' سرسکھ اور امبہ ہیں اور بہنوں کے نام کاپی' کالپی' منڈا اور منڈہی ہیں۔ ہم کو ہر سال ایک جان ان کو بھینٹ دینا پڑتی ہے۔ میں ہنستی اور گاتی اس لئے ہوں کہ آج میرے بیٹے کا بیاہ ہے اور روتی اس لئے ہوں کہ کل راکشش اسے کھا جائیں گے۔ رسالو نے بڑھیا کو دلاسا دیا

Marfat.com

اور جب دوسرے دن راکشش اس کے بیٹے کو کھانے آئے تو رسالو نے ان کو قتل کر دیا۔

(4) عجیب بات ہے کہ یونانیوں نے وادی سندھ میں دوڈھائی سو برس تک حکومت کی لیکن ان کے عہد کی ایک تحریر بھی اب تک دریافت نہیں ہوئی ہے۔ بھیر اور سرکپ کی کھدائی سے سینکڑوں یونانی سکے' زیورات' آلات و اوزار' عمارتوں کے کھنڈر سب کچھ برآمد ہوا لیکن کوئی نوشتہ آج تک نہ ملا اور نہ آئندہ ملنے کی امید ہے۔ انہوں نے سرکپ کا نیا شہر یونانی شہروں کے نمونے پر بنایا تھا۔ لیکن بھیر کی مانند کنواں اس شہر میں بھی نہ تھا۔ ساکاؤں کے عہد کی عمارتوں میں ایک تو شاہی محل قابل ذکر ہے اور دوسرے دو منہ والے شاہین کی عبادت گاہ۔ برصغیر میں شاہی محل کے سب سے پرانے آثار سرکپ ہی کے ہیں۔ البتہ محل کی دیواریں بالکل سپاٹ ہیں۔ ان پر کوئی نقش و نگار نہیں ہے۔ اور وہ ساخت میں عراق کے اشوری محلوں سے مشابہ ہیں۔

(5) دو منہا شاہین یوں تو بابل' ایشیاء کوچک اور اسپارٹا میں بھی شاہی اقتدار کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں علامت ساکاؤں سے مخصوص ہو گئی۔ چنانچہ انقلاب روس سے پہلے تک زار روس کا شاہی نشان دہی اور جرمنی میں یہ علامت دوسری جنگ عظیم تک رائج رہی۔ سرکپ کی کھدائی میں ایک سونار کے گھر سے سکے ڈھالنے کے مٹی کے 28 سانچے ملے ہیں۔ ان میں آٹھ صحیح سالم اور بیس ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جعلی سکے اس زمانے میں بھی ڈھالے جاتے تھے۔ آٹھ سالم سانچوں کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جعل ساز سونار قانون کی گرفت میں کبھی نہیں آیا۔ سرکپ میں سنگ مرمر کا ایک ستون ملا ہے جس میں آرامی زبان میں لکھا ہوا ہے کہ یہ ستون ٹیکسلا کے صوبے دار اور پاٹلی پتر کے ولی عہد اشوک کے زمانے میں سرکاری افسر امودت کے اعزاز میں نصب کیا جا رہا ہے (سرکپ اس زمانے میں غالباً بھیر کی مضافاتی بستی تھا۔) اس آرامی نوشتے سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ خروشتی رسم الخط آرامی ہی سے ماخوذ ہے۔

(6) سرکپ اور اس کے مضافات کی کھدائی میں سونے چاندی کے نہایت خوبصورت زیور اور سنگار کے سامان ملے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑھیوں' لوہاروں' سوناروں اور جراحوں کے اوزار' پتھر کے اوزان' کھیتی باڑی اور باغبانی کے آلات' بچوں کے کھلونے' اسلحے' مورتیاں اور ابھرواں چونہ کاری کی شبیہیں' گنڈے تعویز اور مالائیں' مہریں سانچے اور دھات کے ٹھپے بڑی تعداد میں برآمد ہوئے ہیں۔ ان چیزوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سونے چاندی کے زیور اور ظروف تو یونانی طرز کے ہیں البتہ لوہے' پتھر اور مٹی کے سامانوں کی طرز خالص مقامی ہے۔ اس تفریق سے پتہ چلتا ہے کہ یونانیوں اور ساکاؤں

Marfat.com

کے عہد میں ملک کے بالائی طبقے پر تو یونانی تہذیب کی چھاپ تھی لیکن عام ہنر مند بدستور پرانی ڈگر پر چلتے رہتے تھے۔

(7) سرکپ سے ملی ہوئی جانڈیاں کے مقام پر یونانی عہد کی ایک یادگار عمارت ایسی ہے جس کی نظیر پورے برصغیر میں نہیں ملتی۔ یہ ایک عبادت گاہ ہے جو یونان کے خالص کلاسیکی انداز میں بنائی گئی تھی اور ایتھنز کی مشہور عبادت گاہ ----- پارتھینان ----- کا ہو بہو چربہ ہے۔ اس جگہ سے بدھ مت سے متعلق کوئی شے برآمد نہیں ہوئی ہے۔ البتہ عمارت میں ایک مینار ضرور تھا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یونانیوں نے جو باختر سے آئے تھے اپنی زردشتی رعایا کی تالیف قلب کی خاطر یہ آتشکدہ معہ مینار خاموش تعمیر کیا تھا۔

(ب) گندھارا آرٹ اور بدھ مت :

اشوک اعظم سے کنشک تک وادی سندھ کی تہذیب نے بدھ مت کے سائے میں فروغ پایا تھا چنانچہ اس دور کی فنی تخلیقات کی محرک بھی وہ گہری عقیدت تھی جو ہر طبقے کے لوگوں کو گوتم بدھ کی ذات اور تعلیمات سے تھی۔ گوتم بدھ کے زمانے میں تو بدھ مذہب کا اثر مظلوم اور مفلس طبقوں تک محدود رہا۔ بھکشو بھی عوام کی سی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کا نہ گھربار ہوتا تھا نہ کوئی اثاثہ۔ وہ گاؤں گاؤں تبلیغ کرتے پھرتے۔ بھیک سے پیٹ بھرتے اور رات ہوتی تو کسی باغ میں درخت کے نیچے سو رہتے۔ لیکن دھیرے دھیرے جب بودھ مت کی رسائی راج درباروں تک ہونے لگی اور اشوک نے بھی اس قبول کر لیا تو بدھ مت میں امیری کی شان جھلکنے لگی۔ اشوک نے اپنی سلطنت میں آٹھ مقامات پر اسٹوپا بنوائے اور ہر اسٹوپا میں گوتم بدھ کے تھوڑے تھوڑے تبرکات محفوظ کر دیئے۔ ٹیکسلا کا اسٹوپا (دھرم راجیکا) ان میں سب سے بڑا تھا۔ شاہی اسٹوپاؤں کی دیکھ بھال کے لئے بھکشو مقرر ہوئے۔ ان کے رہنے کے لئے وہار بنائے گئے اور آس پاس کی زمین ان کے مصارف کے لئے وقف کر دی گئی۔ تب یاتریوں کی آمدورفت شروع ہوئی۔ ساکیہ منی کی پیدائش سے نروان تک کی سچی جھوٹی داستانیں لکھی جانے لگیں۔ طرح طرح کی رسموں نے رواج پایا۔ بھکشوؤں نے جاترا کے ضابطے اور رسموں کی ادائیگی کے قاعدے وضع کئے۔ اب وہ جاتریوں کی پرر تھنا مہاتما بدھ کے حضور میں پہنچانے کا واحد وسیلہ تھے۔ گوتم اور اس کے چیلوں کی مورتیاں بننے لگیں۔ منت کے چڑھاوؤں اور نذرانوں کے انبار لگنے لگے۔ اور جس طرح آج کل زیارت گاہوں کے اردگرد مناسک و رسوم سے متعلق اشیاء کی دکانیں لگتی ہیں اسی طرح اسٹوپاؤں کے چاروں طرف صنم تراشوں، زرگروں، کمہاروں، ساہو کاروں، گنڈے، تعویذ ملا اور پھول بیچنے والوں کے بھی بازار کھل گئے۔

وہار ابتدا میں کھلے کھلے حجرے ہوتے تھے لیکن جب دولت کی ریل پیل ہوئی تو حجروں میں دروازے لگے اور وہاروں کے گرد دیواریں کھنچ گئیں۔ لطف یہ ہے کہ بھکشو جن پر ذاتی ملکیت

Marfat.com

حرام تھی دولت ذخیرہ اندوزی کرنے لگے۔ عقیدت مند تو ان کی چوریاں نہ پکڑ سکے۔ البتہ آثار قدیمہ کے ماہر ان کا راز افشا کر دیا۔ چنانچہ دھرم راجیکا کے وہاروں میں ایک حجرے کے نیچے سے 355 سکے اور دوسرے حجرے کے نیچے سے 305 سکے زمین میں چھپے ہوئے ملے ہیں۔ بھکشوؤں کی آرام طلبی رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ وہاروں میں ان کے لئے آرام گاہیں' عبادت کے کمرے' باورچی خانے' اور غسل خانے' غرضیکہ آسائش کی تمام ضرورتیں فراہم کر دی گئیں۔ وہ جو دکھی انسانیت کو خواہشوں کے مایا جال سے آزاد کروانے نکلے تھے خود مایا جال میں پھنس گئے۔ بھکشو مہنت بن گئے۔

(ج) گندھارا آرٹ کی روایت :

گندھارا آرٹ کو تاریخی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور جس کی خصوصیت یونانی آرٹ کی نقالی ہے پہلی صدی عیسوی کے آغاز تک جاری رہا۔ البتہ پارتھیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد گندھارا آرٹ میں مقامی کردار ابھرنے لگا۔ یونانی آرٹ میں بدھ مت کے عقائد و احساسات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع ہوئیں۔ مے کے پیالوں کی جگہ کنول کے پھول تراشے جانے لگے۔ یونانی دیوتاؤں کی جگہ گوتم بدھ کی مورتیاں بننے لگیں اور ابھی پہلی صدی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ گندھارا کے فن کاروں نے یونانیوں کے سکھائے ہوئے فن کو مقامی مزاج اور ضرورتوں کے تابع کر لیا۔ ان کی تخلیقات میں مقامی روح کی تڑپ آگئی۔ گندھارا کا یہ پہلا خود مختار دبستان فن ساسانیوں کے حملے (230ء) تک برقرار رہا۔

اس دور کے فن کار مجسموں اور گل کاریوں کے لئے پتھر استعمال کرتے تھے۔ (ابھروان چونہ کاری کا ابھی رواج نہیں ہوا تھا۔) چنانچہ گندھارا' سرحد' سوات' اور افغانستان میں پتھر کے مجسمے اس کثرت سے برآمد ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا ان علاقوں میں صنم تراشی کی فیکٹریاں کھلی ہوئی تھیں یا قوم کی گوتم بدھ کی پوجا کارنے کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مجسموں میں عموماً گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات کی منظر کشی کی جاتی تھی۔ مثلاً" پتھر کی ایک سل پر گوتم بدھ کی کپل وستو سے اپنے خادم کے ہمراہ روانگی کا منظر ابھارا گیا ہے۔ دوسرے منظر میں گوتم بدھ کا گھوڑا کن تھیکا آقا سے رخصت ہوتے وقت جھک کر ان کے قدم چوم رہا ہے اور بدھ کے تین چیلے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ اس قسم کی منظر تراشی دوسرے دور میں نہیں ملتی۔

پہلے دبستان کا تاریخی اعتبار سے ایک نہایت بیش قیمت نوشتہ کالوان اسٹوپا سے برآمد ہوا ہے۔ یہ نوشتہ تانبے کی تختی پر خروشتی رسم الخط میں کندہ ہے۔ اس نوشتے میں ایک عورت چندرا بھی نے گوتم بدھ سے اپنی عقیدت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

سن 134 اجاسا (76ء) میں ساون کی 23 تاریخ کو چندرا بھی پجارن (اپاسکا) جو دھرما گھر دار (گرہاپتی) کی بیٹی اور بھدرپال کی بیوی ہے چدسیلا کے اسٹوپا میں یہ تبرکات رکھتی ہے۔ اس ثواب

Marfat.com

میں اس کا بھائی نندی وردھن گرہاپتی' بیٹے ساما اور پچیتا اور بیٹی دھرما بھی شامل ہیں اور اس کی بہوئیں راجا اوا اندرا اور ساما کا بیٹا جیونندن اور اس کا گرو بھی۔ سرواستی وارس کی منظوری سے۔ دیہات شہر کے اعزاز میں۔ سب جیووں کے اعزاز میں۔ نروان حاصل کرنے کی خاطر۔ (منقول از رہنمائے ٹیکسیلا از سرجان مارشل ص 134) اس تختی سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ چندرا بھی پچارن کہاں کی رہنے والی تھی۔ البتہ 78ء کے ایک خریطے میں جو دھرم راجیکا کا اسٹوپا سے نکلا ہے سکونت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ مخروطہ چاندی کے پتر پر خروشتی میں کندہ ہے۔ اور ایک طلائی صندوقچی میں ہڈی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے ساتھ رکھا ہوا ملا تھا۔ ہڈی کے یہ ٹکڑے شائد گوتم بدھ کے تبرکات تھے۔

"سن 136 اجاسا۔ اساڑھ کی پندرہویں تاریخ کو بھگوت بدھا کی یہ نشانیاں ارساکا نے چڑھائیں جو امتا وھیرا کے خاندان کا چراغ ہے۔ اور واہیکا (بلخ) اور باختری ہے اور قصبہ نواچا کا باشندہ۔ اس بھگوت کا یہ مقدس تبرک اپنی بودھی ستوا عبادت گاہ میں دھرم راجیکا اسٹوپا میں ٹکشاشیلا میں واقع ہے محفوظ کیا۔ راجہ' راجاؤں کے راجا' آکاش پتر' کشن کی صحت کے لئے۔ تمام بدھوں کے اعزاز میں' فردا فردا ہر بدھ کے اعزاز میں' ارہاتوں کے اعزاز میں تمام ذی حس اشیاءکے اعزاز میں' اپنے والدین کے اعزاز میں' اپنے دوستوں' مشیروں' عزیزوں اور خونی رشتہ داروں کے اعزاز میں اپنی صحت کی بقا کے لئے تیرا سچا اور فیاضانہ نروان کی راہ دکھلائے۔(ایضا ص 114)

گوتم بدھ کہتا تھا کہ اگر نروان چاہت ہو تو دکھ کے اسباب معلوم کرو اور ان کو دور کرنے کے لئے اپنے فکر و عمل کو سچائی کے آٹھ ارکان کے تابع کرو۔ کیونکہ کوئی آسمانی طاقت نروان حاصل کرنے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ لیکن بھکشوؤں نے گوتم بدھ کو بھی دیوتا بنا دیا۔ اور نروان سونے چاندی کے چڑھاوؤں سے خریدا جانے لگا۔

ان نوشتوں کا ایک دلچسپ پہلو خروشتی رسم الخط میں ہندسوں کے لکھنے کا انداز ہے۔ مثلاً" ایک سو چونتیس 134 لکھنا ہوتا تھا تو پہلے 100 لکھتے تھے اس کے آگے 20 اس کے آگے 10 اور پھر 4__23 لکھنا ہوتا تھا تو اسی طرح پہلے 20 لکھتے اور پھر تین بار 1۔

گندھارا آرٹ کو کشنوں کے زمانے میں بہت ترقی ہوئی۔ ملک میں جگہ جگہ اسٹوپا اور وہار قائم ہو گئے۔ چنانچہ پشاور کا مشہور اسٹوپا کشنوں ہی نے بنوایا تھا۔ اور موئن جو دڑو میں بھی اتفاق سے سب سے اونچا کھنڈر اسٹوپا ہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں موئن جو دڑو کے آس پاس بدھوں کی بستیاں ضرور موجود تھیں۔ میرپور خاص (کہو جودڑو) مورو' دیہہ ٹھنگرو' سدربجودڑو' اور جھرک میں بھی اسٹوپوں کے آثار ملے ہیں۔ ان میں میرپور خاص کا اسٹوپا سب سے بڑا تھا۔ اور مسٹر کزنس کا قیاس ہے کہ اس اسٹوپا کو اشوک نے بنوایا تھا' البتہ بعد میں اس میں اضافے ہوتے رہے۔ سندھی اسٹوپاؤں کی مورتیاں ابھرواں شبیہیں اور گل

Marfat.com

کاریاں سب پکی ہوئی مٹی کی ہیں۔ دیواروں میں جو اینٹیں چنی ہیں ان میں طرح طرح کے نہایت حسین نقش و نگار ابھارے گئے ہیں۔ گوتم بدھ کی مورتیاں رنگین ہیں۔ لباس کیسری' چہرہ سنہرا' آنکھیں اور بال سیاہ' آنکھوں کے بیچ میں حلقے کا نشان (ارنا) جو بودھی کی علامت تھا۔

گندھارا کا دوسرا دبستان فن چوتھی اور پانچویں صدی پر محیط ہے۔ تب وحشی ہنوں کی آتش فشاں آندھی آئی اور گندھارا کا علاقہ جلتی ہوئی چتا بن گیا۔ ہنوں نے شہروں اور بستیوں کو مسمار کر دیا۔ اسٹوپاؤں اور وہاروں میں آگ لگا دی۔ ہزاروں لاکھوں بے گناہ جان سے مارے گئے۔ اور گندھارا کا فن ایسا مٹا کہ پھر کبھی زندہ نہ ہو سکا۔

اس دور کی یادگار وہ اسٹوپا اور وہار ہیں جو ٹیکسلا کے نواح میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسرے دبستان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فن کاروں نے سنگ تراشی ترک کر دی اور مٹی اور چونے کی ابھرواں مورتیاں اور نقش و نگار بنانے لگے۔ چونے کی مورتیاں اور ہلکاریاں عمارت کی بیرونی سمت پر ابھاری جاتی تھیں جہاں ان کے بارش سے خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ البتہ بھیتری حصے میں کچی مٹی استعمال ہوتی تھی۔ چنانچہ گندھارا آرٹ کا سب سے حسین شاہکار گوتم بدھ کی مٹی کی وہ مورت ہے جو کالوان اسٹوپا میں دستیاب ہوئی ہے۔ اس منظر میں گوتم ابھے مدرا میں آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ دو چیلے ان کے دائیں طرف اور تین بائیں طرف کھڑے ہیں۔ چار مورتیاں تو خالص کچی مٹی کی ہیں لیکن گوتم بدھ کی مورتی کا سر پکی مٹی کا اور دھڑ کچی مٹی کا ہے۔ ہنوں نے اسٹوپا کو آگ لگائی تو سب مورتیاں پک گئیں اور تباہی سے بچ گئیں۔ جو وقار اور سکون' نرمی اور شفقت گوتم بدھ کی اس مورتی کے چہرے پر جھلکتی ہے وہ کسی مجسمے میں نظر نہیں آتی۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس دور فن کاروں نے گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات کی منظر کشی ترک کر دی اور فقط گوتم بدھ کی شبیہیں بنانے لگے۔ کسی منظر میں ارادت مند گوتم کو عقیدت کا خراج پیش کرتے دکھائے گئے ہیں۔ کسی منظر میں گوتم پر پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور کسی میں گوتم بدھ دھیان میں بیٹھے ہیں اور جانور گھاس چر رہے ہیں۔

ہنوں نے وادی سندھ اور وسطی ہندوستان پر تقریباً دو سو برس تک حکومت کی ابتدا میں ان کا دارسلطنت پشاور تھا مگر یشو دھرمن کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد انہوں نے کپیا کو اپنا صدر مقام بنایا جو دریائے کابل کی وادی میں واقع تھا۔ ہنوں ہی کے زمانے میں ہندوستان میں ہندو مذہب کا احیاء اور بدھ مت کا زوال شروع ہوا۔ ہن سورج کی پوجا کرتے تھے۔ اس لئے ان کو سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر شیو مہاراج کو اپنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے جھنڈے پر آنندی بیل کی شبیہہ بھی بنالی جو شیو جی کی علامت ہے۔

مشہور چینی سیاح ہوانگ سانگ ہنوں کے آخری دنوں (629ء) میں یہاں آیا تھا۔ اس کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ وادی سندھ کا علاقہ کئی رجواڑوں میں بٹ گیا تھا۔ یہ رجواڑے ہنوں کے باجگزار تھے لیکن جب ہنوں کی مرکزی حکومت کمزور ہو گئی تو خود مختار بن بیٹھے۔ ہوانگ

Marfat.com

سانگ کے زمانے میں گندھارا راج کا صدر مقام پشاور تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ گندھارا کے لوگ بڑے شریف اور نرم دل ہیں اور ادب سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کی اکثریت ہندو ہے لیکن بدھوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ البتہ شہر اور دیہات ویران ہو گئے ہیں۔ سوات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں 18 ہزار بھکشو رہتے تھے لیکن اب وہار اور اسٹوپا سنسان پڑے ہیں۔ بس ایک آدھ بھکشو باقی رہ گیا ہے البتہ یہاں ہندوؤں کے دس مندر بن گئے ہیں۔ ٹیکسلا کی کیفیت بھی انہی لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔ ٹیکسلا ان دنوں کشمیر راج میں شامل تھا۔ ہوانگ سانگ نے سندھ کی زرعی پیداوار' معدنیات اور مویشیوں کی فراوانی کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ سندھ ہنوں کی براہ راست دست برد سے بچ گیا تھا اس لئے کہ یہاں بدھ مت کا زور ہنوز ٹوٹا نہیں تھا۔ ہوانگ سانگ کے بیان کے مطابق یہاں کئی سو وہار اور اسٹوپا موجود تھے اور بھکشوؤں کی تعداد میں ہزار تھی البتہ راجا یہاں کا شودر تھا۔ "وہ فطرتاً ایمان دار اور مخلص ہے اور بدھ دھرم کا احترام کرتا ہے۔" ملک میں مندروں کی تعداد 30 تھی۔ پانچواں رجواڑہ ملتان کا تھا۔ ہنوں نے سورج دیوتا کا سب سے بڑا مندر ملتان ہی میں تعمیر کیا تھا۔ ملتان کی اکثریت ہندو تھی اور ان کے آٹھ مندر تھے۔ البتہ بدھوں کے دسوں وہار کھنڈر ہو چکے تھے۔ "وہ چار بھکشو باقی بچے ہیں لیکن وہ بھی اتنے دل برداشتہ ہیں کہ گیان دھیان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔" چھٹی ریاست ہنوں کی تھی "جہاں کے لوگوں کو ادب اور فنون سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔"

اسی زمانے میں خروشتی رسم الخط کا رواج بھی ختم ہو گیا اور اس کی جگہ براہمی رسم الخط رائج ہوا۔ اس تبدیلی کا باعث شاید ہندو مذہب اور سنسکرت ادب کا احیا تھا۔ ہندو راجاؤں نے سنسکرت کو سرکاری زبان بنا دیا تھا۔ حالانکہ سنسکرت مردہ زبان تھی اور کسی جگہ بولی نہیں جاتی تھی۔ بودھ مذہب کے زوال کے ساتھ ذات پات اور چھوت چھات کی سختیاں بھی دوبارہ شروع ہو گئیں حقیقت یہ ہے کہ پانچویں' چھٹیں اور ساتویں صدی کا زمانہ پاکستان تہذیب کا تاریک ترین دور ہے۔ ان تین صدیوں میں یہاں علم و فن میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ معاشرہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لوٹ گیا۔ کسی زمانے میں رگ وید نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ آریوں نے سپت سندھو کے بند توڑ دیئے تاکہ پانی کا قدرتی بہاؤ رکنے نہ پائے۔ دو ہزار سال بعد یہی تاریخی فریضہ عربوں اور ترکوں نے سرانجام دیا۔ انہوں نے سپت سندھو تہذیب کے بند پانی کو آزاد ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس کو خوب پھیلایا اور گہرا کیا۔ وادی سندھ کی تہذیب ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔

Marfat.com

○ باب 8

گپتا تہذیب و تمدن

(GUPTA CIVILIZATION)

گپت شہنشاہوں کے دور حکومت کو اکثر ہندو تاریخ کے عہد زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں کئی بڑے قابل' ذہین اور طاقت ور حکمرانوں کا دور حکومت شامل ہے جنہوں نے شمالی ہند کے ایک بڑے حصے کو ایک سیاسی چھتری کے نیچے لا کر متحد مستحکم کر دیا اور باقاعدہ حکومت اور ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ان کی حکومت میں اندرونی تجارت کو بھی فروغ ہوا اور غیر ملکی تجارت کو بھی ملک میں دولت کی فراوانی ہو گئی۔ اس اندرونی سکون و اطمینان اور خوشحالی و فارغ البالی کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب' ادب اور علم و فن کی ترقی کے لئے نئی شاہراہیں کھل گئیں۔

برہمن مذہب :

اس عہد میں برہمن مذہب کا زور کافی بڑھ گیا۔ اس کی وجہ ایک بڑی حد تک تو یہ ہوئی کہ گپت راجاؤں نے جو برہمن مذہب کے پیرو تھے اور وشنو سے عقیدت رکھتے تھے' برہمن مذہب کی سرپرستی کی۔ لیکن خود برہمن مذہب میں جو حیرت انگیز لچک اور اثر پذیری کی داخلی صلاحیت موجود تھی اسے بھی اس کی کامیابی میں بڑا دخل تھا۔ برہمن مذہب نے ان تمام عقائد رسوم اور قدیم دیسی توہمات پر جنہیں عام مقبولیت حاصل تھی اپنی چھاپ لگا کر عوام کو اپنی طرف جیت لیا۔ اس کے علاوہ غیر ملکی حملہ آوروں کو جو ذات پات سے بے نیاز تھے اس نے اپنے وسیع دامن میں پناہ دی جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہو گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پیش بندی کے طور پر اپنے مد مقابل یعنی بدھ مذہب کی بعض لطیف تعلیمات کو اپنے اندر سمو کر اور بدھا کو اپنے دس اوتاروں میں شامل کر کے اس نے بدھ مذہب کے منصوبوں کو مکمل شکست دے دی۔ چنانچہ جب یہ تمام نئی باتیں اس میں داخل ہو گئیں تو برہمن مذہب نے وہ صورت اختیار کر لی جسے آج ہندو دھرم کہتے ہیں۔ مختلف و متنوع دیوتاؤں کی پرستش اس کا شعار ہو گیا۔ جن میں وشنو' جسے چکر بھرت بھی کہا جاتا ہے' گدادھر' خیار دن' نارائن واسو دیو' گووند خاص طور پر نمایاں تھے۔ دوسرے دیوتا جنہیں عام مقبولیت حاصل تھی وہ شیو' شمبھو کارتکیہ اور سوریہ تھے۔ دیویوں میں لکشمی در گایا بھگوتی اور پاروتی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ برہمن مذہب قربانیوں پر زور دیتا تھا۔ کتبوں میں ان قربانیوں کی طرف جا بجا اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً" آشو میدھ' واج پیہ' اگنش ٹوم' آپ متریام' اتی راتر' پنچ مہا یگیہ وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

بدھ مذہب :

گپت دور حکومت میں بدھ مذہب مدھیہ پردیش میں روبہ زوال ہو چکا تھا۔ گپت حکمرانوں نے کسی قسم کے جبروتشدد سے نہیں لیا۔ وہ ویشنو مت کے سچے پیرو تھے لیکن انھوں نے اپنی میزان عدل کو متضاد عقائد کے مابین ہمیشہ متوازن رکھا۔ رعایا کو مکمل طور پر آزادی ضمیر حاصل تھی۔ چند گپت کے بدھ سپہ سالار آتر کارود کی مثال تو خیر منفرد ہے لیکن اس طرح مملکت کے تمام اعلیٰ عہدوں کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ موضوع سے ذرا ہٹ کر، بدھ مذہب کے زوال کے اسباب کی بحث میں الجھنے کی بجائے اس مقام پر صرف اتنا کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مذہب کی فرقہ بندیوں اور بدھ سنگھ میں خرابیوں نے اس کی قوت حیات کو بالکل سلب کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ بدھا اور بودھی ستوؤں کی مورتی پوجا، بودھ دیوتاؤں کی مجموعی حیثیت سے پرستش کے رواج، مذہبی رسوم کی ادائیگی اور مذہبی جلوسوں نے بدھ مت کو اس کی دیرینہ لطافت و پاکیزگی سے اس قدر دور ہٹا دیا تھا کہ عام آدمی کے لئے اس میں اور ہندومت میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس کے ہندومت میں ضم ہونے کے لئے زمین خوب ہموار ہو گئی۔ آج اس مشابہت و مماثلت کی بہترین مثال نیپال میں پائی جاتی ہے جہاں بقول ڈاکٹر ونسٹ اسمتھ "ہندو دھرم کا عفریت اپنے شکار یعنی بدھ مت کو آہستہ آہستہ ہڑپ کئے جا رہا ہے۔"

جین دھرم :

کتبوں سے جین مت کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لیکن جین مت کچھ اس لئے کہ اس میں نظم و ضبط کی پابندیاں زیادہ تھیں اور کچھ اس لئے کہ شاہی سرپرستی اسے حاصل نہیں تھی، زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ جین مت اور دوسرے مذہبوں میں اتفاق و اتحاد پایا جاتا تھا، کیونکہ ایک شخص مدرنامی جس نے پانچ مجسمے جین پتر تھنکروں کے نام منسوب کئے تھے برہمنوں کے مذہبی پیشواؤں کی محبت کا بے پناہ جذبہ اپنے دل میں رکھتا تھا۔

مذہبی خیراتیں :

نیک اور مخیر لوگ دنیا اور عقبیٰ میں سکون و مسرت حاصل کرنے کی غرض سے بڑی فیاضی کے ساتھ برہمنوں کو رہائش کے لئے قیام گاہیں (ستر) دان کرتے اور سونے اور دیہی زمینوں (اگر ہار) کی نذریں گذارتے تھے۔ مورتیاں اور مندر تعمیر کر کے بھی لوگ اظہار عقیدت کرتے تھے۔ مندروں کے لئے وہ مستقل رقمیں جمع کر دیتے تھے (اکشیہ نی وی) جن کے سود سے مندر میں تمام سال روشنی کا انتظام کیاجاتا تھا۔ اسے پوجا کا ضروری جز سمجھا جاتا تھا اسی طرح بدھ اور جین مذہب والے علی الترتیب بدھا اور تیر تھنکروں کی مورتیاں خیرات کے طور پر نصب کراتے تھے۔

Marfat.com

بدھ مذہب کے لوگ بھکشوؤں کے رہنے کے لئے خانقاہیں (وہار) تعمیر کرتے تھے جہاں ان کے لئے کھانا اور کپڑا مفت فراہم کیا جاتا تھا۔

سنسکرت کا احیا :

برہمن مت کی تجدید کے ساتھ ساتھ سنسکرت کا استعمال اور اثر بھی بہت تیزی سے بڑھا۔ اس حیا کی بالکل ابتدائی منزل کی ایک سند جونا گڑھ میں رو درو امن کے طویل چٹانی کتبہ میں ملتی ہے جس پر 72 (شک سمیت؟) مطابق 150ء پڑا ہوا ہے۔ لیکن اب اسے مستقل طور پر سرکاری زبان کی حیثیت سے لوحِ دستاویزات اور سکو کانی بھوں میں وقیع مقام دیا جانے لگا پہلے ذریعہ اظہار تھی لیکن اب بدھ مصنفین بھی مثلاً" وسوبندھو اور وگ ناگ سنسکرت کو پالی پر ترجیح دینے لگے۔

ادبی ارتقا :

گپت عہد کا مقابلہ عام طور پر تاریخ یونان میں پیری کلیز کے عہد میں اور تاریخ انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کے عہد سے کیا جاتا ہے۔ گپت دور حکومت اس جہت سے ممتاز تھا کہ اس میں بہت سے نامور علما و فضلا موجود تھے جن کی تخلیقات نے ہندوستانی ادب کی مختلف اصناف کو مالا مال کر دیا۔ گپت حکمران علم و فضل کی ہمت افزائی کرتے تھے اور خود بھی بہت تعلیم یافتہ تھے۔ سمدر گپت کی شاعری اور موسیقی میں کمالات کے علاوہ وہ آفاقی روایت جس میں "نو ہیروں" (نورتن) کو قصوں کہانیوں والے وکر مادیتہ سے ربط دیا گیا ہے' ظاہر کرتی ہے کہ چندر گپت دوم وکرمادیتہ کے دربار کے اس عظیم الشان ادبی حلقہ نے عوام کے دل و دماغ پر کتنا گہرا اثر مرتب کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت بلا شبہ مشہور و معروف شاعر و تمثیل نگار' کالیداس کی تھی جو غالباً مالوہ کا ساکن تھا بدقسمتی سے اس کی تاریخ اب تک مشتبہ ہے یہاں تک کہ بعض عالم اس پر بضد ہیں کہ وہ 57 ق۔م کی شخصیت ہے۔ لیکن کافی مضبوط قرائن ہمارے پاس اس رائے کے حق میں موجود ہیں کہ کالیداس کا تعلق گپت عہد سے تھا' نیز یہ کہ وہ چندر گپت دوم یا کمار گپت اول کا معاصر تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ گپت دوم کی فتوحات کا ایک حوالہ رگھونش میں رگھو کی " دگ دجے" کی مبالغہ آمیز تفصیلات میں دستیاب ہوتا ہے۔ کالیداس کی ایک اور رزمیہ نظم کمار سمبھو ہے۔ رتو سنگھار اور میگھ دوت اس کی غنائی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ اسکے ناٹکوں میں ہم مال وکاگنی متر وکرم اروشی اور شکنتلا کے بارے میں جانتے ہیں۔ آخرالذکر تو اس درجہ دلکش ہے کہ اس نے دنیا بھر کے عظیم ترین ادبی نقادوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ گپت عہد میں اور بھی بہت سے پایہ کے شعرا موجود تھے لیکن کالیداس کی عظمت نے ان کے فن کو پھیکا کر دیا' ہری شین اور وتس بھٹی' علی الترتیب سمدر گپت اور کمار گپت کے معاصر تھے۔ ان کی تخلیقات پتھر کی سلوں پر کندہ ہیں اور بدستور ہم تک پہنچ گئی ہیں۔ مدرارا کشش کا مصنف' وشاکھ

Marfat.com

دت، فرہنگ نویس، امر سنگھ جس نے امر کوش مرتب کی، مشہور و معروف طبیب دھن ونتری اور عظیم بدھ عالم سب اسی عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ مزید برآں، برہمنوں نے اپنے ادب کو اپنے بے شمار عقیدت مندوں کے جذبات سے ہم آہنگ کرنے اور ان پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی غرض سے اس پر اسی زمانے میں نظر ثانی کی پرانوں نے جن میں گپت خاندان کا ذکر ہے اسی عہد میں اصلاح و تصحیح کے بعد وہ شکل اختیار کی جو آج تک موجود ہے۔ اسی طرح منو سمرتی میں بھی ترمیم کی گئی جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں انھیں مذہبا جائز قرار دینے کے لئے دوسری سمرتیاں مثلاً یا گیہ ولکیہ میں بڑے جم کر کام ہوا، اور آریہ بھٹ (ولادت: 476ء) ورآہ مہر (505 587ء) اور برہم گپت (ولادت: 1098ء) نے سائنسی ادب کی مختلف اصناف میں حیرف انگیز اضافے کئے معلوم ہوتا ہے وہ یونانی ہیئت سے بھی واقف تھے کیونکہ اپنی تصانیف میں انھوں نے بہت سی یونانی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔

تعلیم :

اس عہد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے نتائج کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رائج الوقت نظام تعلیم بہت عمدہ اور باقاعدہ تھا۔ بدقسمتی سے اس موضوع پر ہماری معلومات بہر حال مایوس کن حد تک ناکافی ہے۔ کتبوں سے معلوم ہوتا کہ استادوں کو اس وقت آچاریہ اور اپادھیائے کہا جاتا تھا، لیکن برہمن عالموں کے لئے بھٹ کا لقب استعمال ہوتا تھا۔ برہمنوں کی امداد کے لئے جاگیر میں گاؤں دیئے جاتے تھے اور مخیر لوگ اپنے عطیات سے بھی انہیں نوازتے تھے۔ برہمنوں کے تمام چیلے جو شیہ یا برہم چارن کہلاتے تھے۔ شاکھاؤں اور چرنوں یعنی ان ویدی مدرسوں میں جمع ہو جاتے تھے جو کسی مخصوص وید کے اصلاح شدہ نسخے کی تعلیم دیتے تھے۔ ان اصلاح شدہ نسخوں میں سے کتبوں میں میثرائے نیئے، تیتری لئے اور واجس نئے اور بعض دوسرے نسخوں کا ذکر آتا ہے۔ رہا مضامین کا سوال تو ان کے بارے میں ہماری معلومات یہ ہے کہ اس وقت چودہ علوم (چتردش ودیا) کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یعنی چاروں وید، چھ وید آنگ، پران می مان سا، نیائے، اور دھرم یا قانون۔ کتبوں میں شالا تری یہ (پانتی) کی دیا کرن واشٹ آدھیائی) اور شت ساھیری سن ہتا یعنی مہا بھارت کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ یقین ہے کہ غیر مذہبی اور دنیاوی ادب کا جو ذخیرہ موجود تھا اس کی ضرور تعلیم دی جاتی تھی۔

زمانے کے روادارانہ مزاج کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بودھ علوم کے عظیم مرکز نالندہ کی بنیاد شکرادیتہ، غالبا کمار گپت اول نے رکھی، جس نے تقریبا پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک خانقاہ وقف کی۔ اس کے بعد بدھ گپت تھتاگت گپت، بالادیتہ اور دوسرے گپت حکمرانوں نے مزید عطیات سے اسے نوازا۔ نالندا میں نصاف تعلیم بہت جامع تھا اور کچھ بعد تو اس کا مقام اتنا بلند ہو گیا کہ نہ صرف برصغیر کے گوشہ گوشہ سے بلکہ بیرونی ممالک سے سینکڑوں تشنگان علم اپنی علمی اور روحانی پاس بجھانے یہاں آتے تھے۔

Marfat.com

گپت عہد کے سکے :

سمدر گپت (یا چند گپت اول؟) کے سب سے پرانے سونے کے سکے 118 سے 122 گرین تک وزن رکھتے ہیں، شکل و صورت اور وزن میں کشن راجاؤں کے سکوں سے بہت مشابہ ہیں، سکوں پر غیر ملکی اثر اس سے ثابت ہے کہ گپت عہد کے کتبوں میں کشن نام "دینار" استعمال ہوا ہے جو لاطینی دنیریس سے مشتق ہے۔ بہر حال چندر گپت دوم نے جس کے سکوں کا وزن 124 سے 132 گرین تک تھا کشن (رومی) سکوں والے وزن میں تبدیلی کر دی، اور بعد ازاں اسکند گپت نے اس وزن کو بالکل ترک کر دیا اور ہندو سورون کا معیاری وزن (146 گرین) اختیار کر لیا۔ کشترپ علاقوں کی فتح کے بعد گپت راجاؤں نے شک معیار کے مطابق چاندی کے 32 گرین والے سکے بھی جاری کئے، بعد میں اسکندر گپت نے ان کا وزن بڑھا کر کارشاپان کی برابر کر دیا، اس مقام پر یہ کہہ دینا بھی مناسب ہے کہ گپت راجاؤں کے تانبے کے سکے بہت کم یاب ہیں اس کی وجہ غالبا یہ ہے جیسا کہ فاہیان نے بھی لکھا ہے کہ چھوٹے موٹے لین دین میں کوڑی بطور سکہ کے استعمال ہوتی تھی۔

فن تعمیر :

گپت راجاؤں کے عہد حکومت میں فن تعمیر کو بہت فروغ ہوا۔ لیکن کئی سبب ایسے جمع ہو گئے جن کے باعث اس دور کے آثار باقیہ زیادہ تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ گپت عہد کی بہت سی عمارتیں دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ بعض کا ملبہ لوگوں کی تعمیری ضروریات میں کام آ گیا۔ اس لئے ہماری معلومات کا دارو مدار اس عہد کے چند باقیات الصالحات ہیں۔ اور وہ بھی سب مذہبی عمارتیں ہیں، غیر مذہبی ان میں کوئی نہیں ہے۔ ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ نے ایسے دو مندروں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک جو دیو گڑھ (ضلع جھانسی) میں ہے اس کی دیواروں کی منبت کاری میں نقاشی کے خوبصورت نمونے موجود ہیں دوسرا بھتر گاؤں (ضلع کانپور) میں ہے جو اینٹ اور مسالہ سے بنی ہوئی مورتیوں کے لئے مشہور ہے۔ اس مقام پر اجنتا کے غاروں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو گپت عہد کے فنی کارناموں کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں سے اکثر مختلف زمانوں میں ٹھوس پتھر سے تراشے گئے ہیں۔ لیکن بعض ایسے ہیں جو غالبا زیر نظر عہد میں زمین کھود کر بنائے گئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ گپت عہد کے انجینروں کی فنی صلاحیتوں کی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں۔

مجسمہ سازی :

سارناتھ اور دوسرے مقامات پر جو دریافتیں ہوئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ گپت عہد میں مجسمہ سازی کا فن معراج کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اس عہد میں گندھارا فن کے اثرات رفتہ رفتہ

Marfat.com

زائل ہونے لگے۔ اور اب جو مجسمے بدھا کے بنائے گئے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نورانی بالوں سے مزین ہیں' بدھا کو چست لباس پہنایا گیا ہے جس میں جلد بدن جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور بالوں کو خاص انداز سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سارناتھ میں جو بے شمار مجسمے گپت دور کے ملے ہیں ان میں سب سے زیادہ دیدہ زیب اور خوبصورت شاید وہ ہے جس میں بدھا کو وعظ دینے کے انداز میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ (دھرم چکر مدرا) اپنے آقا کی زندگی کے مختلف مناظر کے علاوہ ہندو دیو مالا کے جو واقعات پیش کئے گئے ہیں ان میں غیر معمولی پاکیزگی پائی جاتی ہے مجموعی طور پر گپت عہد کے فنکاروں کی امتیازی شان یہ ہے کہ ان کا عمل حرکت و زندگی سے مملو' آورد کے عیب سے پاک' اور تکنیک کے اعتبار سے مکمل ہے۔

مصوری :

اجنتا (ریاست حیدر آباد) کے غار جن کے اندرونی حصے کو بہ افراط دیواری تصویروں سے آراستہ کیا گیا ہے' ظاہر کرتے ہیں کہ مصوری کے میدان میں بھی فن کاروں نے مہارت کا اعلیٰ معیار حاصل کر لیا تھا۔ ان غاروں کی تاریخ پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس طرح بعض غار یقیناً اس عہد سے بھی متعلق ہیں۔ ایک صاحب ذوق مبصر کی رائے ہیں "اجنتا کی مصوری کمال فن کا بہترین نمونہ ہے' اس میں روایت پسندی ہے مگر وضع داری کے ساتھ۔ اس کے نقش و نگار میں تنوع ہے جن سے شگفتگی جھلکتی ہے؟ اور رنگ روپ اور شکل و صورت میں حسن و دلکشی اس قدر نمایاں ہے کہ اسے قدیم دنیا کے بہترین فن کے زمرہ میں شامل کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اجنتا کے مدرسہ فن کا حلقہ اثر آگے بڑھ کر ریاست گولیار میں باغ کے غاروں تک پہنچ گیا۔ باغ کے غاروں کی تصویریں بھی اعلیٰ معیار رکھتی ہیں اور بے پناہ تنوع کی مظہر ہیں۔

دھات کا کام :

گپت عہد کے کاریگر دھات کے کام میں بھی ماہر تھے۔ یہ بات بدھا کے تانبے سے بنے ہوئے کئی دیو پیکر مجسموں' نیز دلی کے قریب مہرولی کے آہنی ستون کی دریافت سے ثابت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گپت عہد کے کاریگر خام دھاتوں کو صاف کرنے کے فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صدیوں تک دھوپ اور بارش کی زد میں رہنے کے باوجود ستون ابھی تک زنگ آلود نہیں ہوا ہے۔

Marfat.com

○ باب 9

ہندو تحریک احیائے علوم

(HUNDU RENAISSANCE)

اب ذرا ہندوؤں کی تحریک احیائے علوم کے حوالے' ان کی مذہبی' سماجی' سیاسی' اقتصادی' ادبی اور فنی کیفیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ کیا یہ ہر میدان میں جمود و انحطاط کا دور تھا یا ہمیں ترقی کی بھی کوئی کرن کہیں دکھائی دیتی ہے؟ بہتر ہو گا کہ ان سوالوں کا جواب حقائق کی روشنی میں دیا جائے۔

(1) مذہبی ادارے :

پہلی بات جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یہ کہ بدھ مت اب ہندوستان میں کوئی متحرک قوت نہیں رہا تھا' البتہ بعض مقامات پر اس کا وجود ضرور پایا جاتا تھا۔ یو ان چوانگ (تقریبا 629-645ء) کے سفرنامے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے سفر کے دوران کانچی میں " کوئی 100 ا سنگھرام اور 10000 سادھو" دیکھے۔ وہ استھویر عقیدہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور مہایان فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ہم بجا طور پر قیاس کر سکتے ہیں کہ پلو ریاست میں بدھ مذہب یوان چوانگ کی آمد کے بہت بعد تک باقی رہا۔ راجراج اول چول نے جو شیومت کا سچا پیرو تھا' نیگ پٹم کے بدھ وھار کو نذریں بھینٹ کیں اور کلوت تنگ اول نے بھی علی ہذا ایک دوسرے وہار کی امداد کی۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ بدھ مت کا وجود جنوب میں پایا جاتا تھا دکن میں بدھ مذہب کے حسب ذیل مرکز تھے۔ کم پلیہ (ضلع شولاپور)' رکبل (ضلع دھارواڑ) اور کنیری (ضلع تھانہ)۔ آٹھویں صدی کے شروع میں جب مسلمان سندھ پہنچے تو انھوں نے بدھ مذہب کے ماننے والوں کی وہاں خاصی بڑی آبادی دیکھی۔ پال خاندان کے راجاؤں نے بدھ مذہب کی باقاعدہ سرپرستی کی۔ انھوں نے بنگال اور مگدھ میں بدھ خانقاہوں کو فیاضی کے ساتھ عطیات دئے۔ بنگال اور مگدھ میں بدھ مذہب کے آثار بختیار خلجی کے حملے کے وقت تک باقی رہے۔ لیکن یہاں بدھ مذہب کی صورت کافی بدل گئی تھی۔ بدھ مت نے جو نئے تنتری طریقے اپنائے تھے ان سے اس کا پہچان میں آنا مشکل ہو گیا تھا۔ بھکشوؤں میں بہر حال تبلیغی جوش اب بھی موجود تھا۔ مثال کے طور پر اس مقام پر مشہور و معروف دیپانکر سرگیان کا ذکر کیا جا سکتا ہے جسے تبتیوں نے "اتس" کا نام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اتس گیارھویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی سرحدوں کے ماورا اپنے مذہب کی روشنی پھیلانے تبت گیا تھا۔ بدھ مذہب کے برعکس جین مذہب

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے ہندوستان کے بعض علاقوں میں کافی زور پکڑ لیا تھا۔ دکن میں بعض شروع کے چالکیہ راجاؤں اور اموگھ ورش اول' لند چہارم کرشن دوم اور اقدر سوم جیسے راشٹرکوٹ حکمرانوں نے اسے پروان چڑھایا۔ بہت سے مغربی گنگ راجہ بھی اس کی طرف مائل تھے۔ اوی نیت اور دروی نیت نے علی الترتیب جین آچاریوں وجے کیرتی اور پوجیہ پاؤ کی سرپرستی کی۔ یہ دونوں ہمارے زیر نظر دور سے پہلے کی شخصیتیں ہیں اس لئے انھیں چھوڑ دیجئے۔ لیکن راج مل (تقریباً 977-985ء) کے عہد میں ہمیں معلوم ہے کہ اس کے وزیر اور سپہ سالار چامندرائے نے جو جین مت کا سچا پیرو تھا' 983ء میں شراون بلگول کے مقام پر گومیشور کا مشہور و معروف مجسمہ تیار کرایا۔ عظیم بتک وشنو وردھن ہوا سل (تقریباً 1110-1140ء) پہلے جین عقائد کو مانتا تھا لیکن آچاریہ رامانج کے زیر اثر بعد میں ویشنومت کا پیرو ہو گیا۔ چولوں کے عہد میں' جو شیومت کے پکے ماننے والے تھے' جینی اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہے۔ 640ء میں مولو کیوچ آ (مل کوٹ) یا پانڈیہ دیش کا حال بیان کرتے ہوئے یوآن چوانگ نے "زگرنتھوں کے تعلق رکھنے والے بے شمار بدعقیدہ لوگوں" کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح اس نے کانچی کی ریاست میں رہنے والے "بہت سے زگرنتھوں" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس جہت سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ پلو اور پانڈیہ ریاستوں میں آنے والی کئی صدیوں تک جینیوں کی کافی آبادی رہی ہو گی۔ لیکن جین مت نے کمار پال چالکیہ (تقریباً 1143-1172ء) کے عہد میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کر لی۔ کمار پال نے عظیم آچاریہ ہیم چندر سے درس آگہی لیا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ ہیم چندر کی تبلیغ اور تبحر علمی کی بدولت جین مت گجرات' کاٹھیاوار' کچھ' راجپوتانہ اور مالوہ میں خوب پھیل گیا۔ شمال میں بہر حال چوں کہ اسے شاہی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی اس لئے وہاں اس کا اثر بہت محدود رہا۔ کیا شمالی ہند میں اور کیا جنوبی ہند میں' برہمن مت یا پورانی ہندومت کا زور سب سے زیادہ رہا۔ راجہ اور پرجا دونوں برہمنی دیوتاؤں کو پوجا کرتے تھے۔ ان دیوتاؤں میں سرفہرست وشنو اور شیو تھے جنھیں بہت سے دوسرے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ دیوتاؤں کی اس فہرست میں آگے چل کر برہما' سوریہ' ونایک یا وا مودر (گنیش) کمارا سکند' سوامی مہاسین یا کارتکیہ' اندر' اگنی' یم' ورن' مرت وغیرہ دیوتاؤں اور ماتا دیویوں (ماترکوں) بھگوتی یادرگا۔ شری دلکشمی اور بہت سے چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کے نام شامل کر لئے گئے۔ ان میں سے بہت سے آج بھی مقبول ہیں اور اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید ہندومت نے اسی عہد میں جنم لیا۔ پرستش کے معاملے میں دیوتاؤں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ مثال کے طور پر' راشٹرکوٹ کتبے شیو اور وشنو کے نام کے منتروں سے شروع ہوتے ہیں۔ گاہڑوال راجہ سوریہ' شیو' واسو دیو (وشنو) کی پرستش کرتے اور اگنی کی قربانی کے بعد دان دیا کرتے تھے۔ ایک ہی حکمران خاندان کے افراد مختلف دیوتاؤں سے اظہار عقیدت کرتے تھے۔ پرتی ہار راجاؤں کی خاص طور پر یہی صورت تھی۔ راجاؤں کے عقائد کسی ایک دائرے میں محدود نہیں تھے۔ ان میں وسعت پائی جاتی تھی کیوں کہ

Marfat.com

ایک کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جے چندر "برضا و رغبت اور بے انتہا شوق کے ساتھ" شری متر نامی بدھ بھکشو کا چیلا بن گیا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گووند چندر گاہڑوال اور راجراج اول چول اور کلوت تنگ اول نے بدھ دہاروں کے نام گاؤں وقف کیے۔ اس طریقہ کار نے یقیناً مختلف مد مقابل فرقوں کے درمیان رواداری اور ہم آہنگی پیدا کر دی۔ چنانچہ مذہبی جبر و تشدد اور فرقہ وارانہ منافرت اس وقت بہت کم پائی جاتی تھی۔ متذکرہ بالا کلوت تنگ کی نو ایک مثال ضرور اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے، جس کی ناراضگی نے عظیم ویشنو مصلح رامانج کو شری رنگم چھوڑ کر ہوا سل ریاست میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ رامانج کی واپسی اسی وقت ممکن ہو سکی۔ جب وکرم چول نے اپنے باپ کے برعکس طریقہ اپنایا۔ بہر حال چول خاندان کے راجا اور جنوب کے حکمران تمام مذہبی فرقوں کے ساتھ عام طور پر رواداری کا برتاؤ کرتے تھے اور ویشنو الور اور شیونین مار اپنے اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ میں پوری طرح آزاد تھے۔ ان مذہبی معلمین نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ رائج الوقت مذہبی عقائد میں نئی زندگی اور تازہ روح پھونک دی۔ اس عہد میں شمالی ہند نے کمارل بھٹ شنکر آچاریہ، رامانج، اور مدھو آچاریہ جیسی عظیم شخصیتیں پیدا کیں جنھوں نے ہندو مذہب اور فلسفہ پر اپنے اخلاق حسنہ اور تبحر علمی کی نہ مٹنے والی چھاپ چھوڑی ہے۔ آخر میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس وقت معلوم ہوتا ہے ویدک یگیوں کا رواج نہیں رہا تھا۔ راشٹرکوٹ راجاؤں کے کتبوں میں بہر حال اس قسم کے حوالے ملتے ہیں کہ انھوں نے ہرنیہ گربھ اور تلا دان کی رسوم انجام دیں۔ راجا دھراج اول (تقریباً 1044-1052ء) کے عہد کے ایک چول کتبے میں آشو میدھ کی طرف صرف ایک اشارہ ملتا ہے۔ غالباً یگیوں کے مقابلے میں، جنھیں تمام تر جزویات کے ساتھ انجام دینے میں دقت بھی تھی اور طوالت بھی، اب دان (نذر) پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ دوسری طرف عظیم مسلم عالم البیرونی (تقریباً 970-1039ء) نے 1030ء میں لکھتے ہوئے ان رسموں کے متروک ہونے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے: "رسموں کی مدت میں فرق رہتا ہے، اس طرح کہ وہ شخص جو طویل عمر پاتا ہے، ان میں سے صرف بعض انجام دے پاتا ہے اور اتنی طویل عمر ہمارے اس دور میں بہت کم ہوتی ہیں، اس لئے بہت سی رسمیں متروک ہو گئی ہیں، صرف چند باقی رہ گئی ہیں جنھیں لوگ آج کل انجام دیتے ہیں۔"

معاشرتی ادارے :

سماج ذات پات (ورن) کے بندھنوں میں اس وقت بھی اتنا ہی جکڑا ہوا تھا جتنا آج ہے۔ ابن خردازبہ جس کی وفات 300ھ مطابق 912ء میں ہوئی لکھتا ہے کہ سات ذاتیں پائی جاتی تھیں۔۔۔۔ (1) سب کفریہ یا سبک فریہ (2) برہم (3) کثریہ (4) سدریہ (5) بے سورہ (6) سندلیہ (7) لاہود۔ الادریسی نے بھی ان سب کا ذکر کیا ہے (آخر گیارھویں صدی)، لیکن آخر الذکر ذات کو اس نے "زکیہ" کہا ہے۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نمبر (1)، (2)، (3)، (4)، (5) اور (6) سے علی الترتیب برہمن، چھتری، شودر، ویش، اور چنڈال مراد ہیں، اور نمبر (1) سے شاید

Marfat.com

ست کشتریہ مراد ہیں نمبر (7) کی شناخت مشتبہ ہے۔ بہر حال' البیرونی کہتا ہے کہ شروع میں ہندو چار ذاتوں میں منقسم تھے (1) برہمن' (2) کشتریہ' (3) ویشیہ' (4) شودر۔ ظاہر ہے کہ البیرونی کے اس قول کی بنیاد وہ معلومات ہے جو اس نے سمرتیوں سے حاصل کی کیوں کہ یہ بات طے ہے کہ بات بعد کی سمرتیوں سے بھی ثابت ہوتی ہے اور کلہن نے 64 چھوٹی چھوٹی ذاتوں کا ذکر کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ذاتیں ناجائز شادیوں' موروثی پیشوں کو چھوڑنے یا نئے پیشے اختیار کرنے کے باعث وجود میں آئیں۔ ان چار خاص ذاتوں کے علاوہ البیرونی نے انتجوں کے آٹھ طبقوں' نیز ہاڑی' ڈوم (ڈومت)' چنڈال' اور "بدھ تاؤ" کا ذکر کیا ہے۔ آخرالذکر کا شمار کسی ذات میں نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے سپرد گندے کام کئے گئے تھے' اور انھیں شہر یا گاؤں کے باہر رہنا پڑتا تھا۔ ہمارے اس زیر نظر دور میں یہی گویا اچھوت تھے جنھیں سماج باہر کی کوئی چیز سمجھا جاتا تھا۔ البیرونی کہتا ہے کہ چاروں ذاتوں کے لوگ شہروں اور گاؤوں میں اور اپنے رہائشی مکانات میں ایک دوسرے کے ساتھ خوب گھلے ملے رہتے تھے۔ لیکن مختلف ذات کے لوگوں کے لئے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانا ممنوع تھا۔ ہندوؤں میں برہمنوں کا اقتدار مکمل طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ وہ اپنے گوتروں اور پرَدروں سے پہچانے جاتے تھے۔ حالاں کہ آج کل کی طرح خاندانی ناموں کا استعمال بھی رفتہ رفتہ رواج پاتا جا رہا تھا۔ ناموں پر صوبائی چھاپ ابھی نہیں لگی تھی۔ دوسری ذاتوں کے لوگ بھی برہمنوں کی عزت کرتے تھے اور انھیں دان دیتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ المسعودی اور الادریسی نے لکھا ہے کہ برہمن گوشت سے پرہیز کرتے اور جفاکشی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ ابن خردازبہ کا بھی یہی بیان ہے کہ برہمن شراب نہیں پیتے تھے اور مسکرات سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ یوگ کی مشق کرتے تھے اور ویدوں کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ویدوں کو وہ قلم بند نہیں کرنے دیتے تھے' بلکہ انھیں زبانی یاد کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اٹھارہ پرانوں' سمرتیوں اور سا کھیہ' نیائے و-شنک' می مانسا وغیرہ فلسفیانہ رسالوں' رزمیہ نظموں اور دوسرے باقاعدہ علوم مثلاً" قواعد' عروض' ہیئت' جیوتش' ریاضیات اور طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ المختصر انھیں علم و فضل کا مخزن مانا جاتا تھا۔ برہمن ویدوں کی تعلیم چھتریوں کو دیتے تھے۔ "چھتری ویدوں کو خود پڑھ سکتے تھے' لیکن کسی کو پڑھا نہیں سکتے تھے' یہاں تک کہ برہمنوں کو بھی نہیں۔" ویشیوں اور شودروں کے متعلق البیرونی کہتا ہے کہ "خود پڑھنے پڑھانے تو ذکر ہی کیا انھیں ویدوں کو سننے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگر کسی ایک کے خلاف بھی یہ بات ثابت ہو جاتی تو برہمن اسے عدالت میں پیش کر دیتے اور اسے سزا دی جاتی اور اس کی زبان قطع کر لی جاتی تھی۔ یہ سب تکلیف دہ امتیازات اور پابندیاں اس وقت کے سماج پر ایک بدنما داغ تھیں۔

ذات پات کے افتکار کو ازدواجی رشتوں میں بھی دخل تھا اور مختلف ذاتوں میں باہمی شادیوں کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ البیرونی لکھتا ہے کہ حالاں کہ انولوم شادیوں کی اجازت تھی' پھر بھی برہمن اس کے زمانے میں اپنی ذات کے باہر کسی عورت سے کبھی شادی نہیں کرتے تھے۔

Marfat.com

اس کے برخلاف ابن خرداذبہ مغربی ہندوستان کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے کہ برہم (برہمن) کتریوں (کشتریوں) کی لڑکیوں کو زوجیت میں لے لیتے ہیں۔ تاریخ نے اس قسم کی بعض شادیوں کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ راج شیکھر نے (نویں صدی کے اواخر۔ دسویں صدی کے ربع اول میں) اونتی سندری نام کی ایک کشتری خاتون سے شادی کی جو چاہ مان قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس طرح کشمیر کے ایک راجہ سنگرام راج نے اپنی بہن کو ایک برہمن کے ساتھ بیاہ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندانوں میں دوسری ذات میں شادیاں ممنوع نہیں تھیں، کیوں کہ گووند چندر گاہڑوال کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ اس نے کمار دیوی کو اپنی زوجیت میں لے لیا جو بدھ مذہب کی جوشیلی پیرو تھی۔ اس دور میں کمسنی کی شادی کا بھی رواج تھا۔ چناں چہ البیرونی کہتا ہے: "ہندو بہت کم عمر میں شادی کرتے ہیں، چناں چہ اولاد کی شادی والدین ہی کرتے ہیں۔" بالائی دس بھر نچ کئی کئی بیویاں رکھتے تھے اور طلاق کو ناپسند کیا جاتا تھا۔ اگر کسی عورت کا شوہر مر جاتا تو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے یا تو عمر بھر بیوہ رہنا پڑتا تھا یا ستی ہونا پڑتا تھا۔ کشمیر میں یہ رسم عام تھی۔ دکن میں اس کا رواج نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ستی کی رسم اس وقت صرف شاہی خاندانوں تک محدود تھی اور عوام میں نہیں پھیلی تھی۔ بعد میں عوام نے بھی اسے اختیار کر لیا۔ اس قیاس کے لئے بھی کافی گنجائش موجود ہے کہ پردہ کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ ابوزید لکھتا ہے..... ہندوستان کے بہت سے راجہ جب دربار کرتے ہیں تو اپنی عورتوں کو باہر آنے دیتے ہیں۔ دیسی لوگ ہوں یا غیر ملکی، سب انھیں دیکھ سکتے ہیں اور وہ دربار میں شرکت کرتی ہیں۔ غیروں سے منہ چھپانے کے لئے وہ برقع وغیرہ استعمال نہیں کرتیں۔ عورتوں کی سماجی حیثیت عام طور پر پست نہیں تھی۔ بعض عورتیں اپنی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل کر لیتی تھیں۔ راج شیکھر نے شاعرہ عورتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی اپنی بیوی اونتی سندری بڑی صلاحیتوں والی عورت تھی۔ کہتے ہیں کہ مندن مشر کی بیوی نے اپنی غیر معمولی قابلیت سے شنکر آچاریہ جیسی عظیم شخصیت کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ لیلاوتی ریاضیات میں زبردست مہارت رکھتی تھی۔ اس دور کو کشمیر کی دوا (تقریباً 980-1003ء) اور کاکتیہ رانی، رودارمبا (تقریباً 1261-1290ء) جیسی عظیم حکمران خواتین کو جنم دینے کا بھی افتخار حاصل ہے۔ مغربی چالکیوں کے کتبوں میں گورنر رانیوں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ چناں چہ سومیشور اول آہومل کی ایک بیوی، میلا دیوی 1053ء میں بنواسی کے صوبے کی حاکم تھی۔ اسی طرح وکرمادتیہ ششم کی اکر مہشی لکشمی دیوی کے ذمے 1095ء میں 18 گرہروں کی نگرانی تھی۔ اگر ہم وکرمادتیہ ششم تقریباً 1076-11266ء) کے ایک متوسل اور متاکشرا کے مصنف وگیانیشور کی شہادت کو تسلیم کریں تو ماننا پڑے گا کہ غلاموں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اپنی آزادی کس طرح خرید سکتے تھے۔ ہندوؤں میں وارانسی (بنارس) متھرا، پکر (پشکر) وغیرہ جیسے مقدس مقامات (تیرتھوں) کی یاترائیں کرنے کا رواج اس وقت عام تھا۔ سال کے بعض مقررہ دنوں میں تیوہار

Marfat.com

منائے جاتے تھے اور ثواب حاصل کرنے کے خیال سے روزے (ورت) رکھے جاتے تھے اس طرح اس دور میں بعض ایسے رواج پائے جاتے تھے جنھوں نے ہندو سماج میں آگے چل کر کافی زور پکڑ لیا۔

سیاسی ادارے :

عوام کی مذہبی اور سماجی زندگی کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھنے کے بعد اب ہمیں اس طرز حکومت کا جائزہ لینا چاہئے جس کے ماتحت وہ زندگی گزارتے تھے۔ پہلی قابل ذکر بات اس سلسلے میں یہ کہ اس دور میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں وہ سب کی سب خاصی منظم تھیں۔ یہ حقیقت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ گدی کے لئے جھگڑوں یا تھوڑے وقفوں کے بعد پے درپے لڑائیوں کے باوجود پالوں' چولوں اور مشرقی چالکیوں کا راج لگ بھگ چار صدیوں تک اور پرتی ہاروں' راشٹرکوٹوں' اور مغربی چالکیوں کا راج دو صدی سے کچھ زیادہ مدت تک باقی رہا۔ اس زمانے میں آمدورفت کے وسائل کم بھی تھے اور ست بھی' لیکن اس کے باوجود یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ان خاندانوں نے اتنے طویل عرصے تک اس قدر دور دراز علاقوں پر اپنی حکومت جمائے رکھی۔ نظام حکومت کے کل پرزے تمام حکومتوں کے ایک جیسے ہی تھے' سوائے اس کے کہ زمانے کے اعتبار سے' نیز مقامی حالات کہیں کہیں ان کل پرزوں کی ساخت میں تھوڑا بہت فرق آ جاتا ہے۔ عہدہ داروں کے نام تو ضرور بدل جاتے تھے لیکن ان کے اختیارات و فرائض میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ انتظامی سہولت کے لئے ریاست (راجیہ) کو پہلے کی طرح متعدد صوبوں (بھکتی'بھوی'منڈل' یا جسے جنوب میں منڈلم کہتے تھے) میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ صوبوں کی تقسیم در تقسیم اپنی جگہ علیحدہ ہوتی تھی جو وشیہ' یا بھوگ' یا جنوبی ہند میں کوتم یا ول ناڑو کہلاتے تھے۔ دوسری اس سے چھوٹی انتظامی اکائی ضلع ہوتا تھا راد ھشٹمان یا پتن' جسے جنوب میں ناڑو' کہتے تھے) جس میں کئی کئی گاؤں (پتل' یا اگرھار' یعنی موجودہ تحصیل جس کے لئے جنوبی ہند کے کتبوں میں کرم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے) شامل ہوتے تھے۔ سب سے چھوٹی انتظامی اکائی گاؤں (گرام یا گرامم) ہوتا تھا۔ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے بہت سے اعلیٰ یا ادنیٰ قسم کے صوبائی اور مقامی عہدے دار ہوتے تھے۔ بعض اوقات فوجی اور غیر فوجی افسروں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس مقام پر ان تمام افسروں کی تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں ہے اس لئے ہم صرف اس عہد کے طرز حکومت کی خاص خاص باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دور میں غیر شخصی حکومتوں کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ اس قسم کے خوداختیاری یا چند سری نظام رکھنے والے قبیلوں کی آخری جھلک ہمیں سمدرگپت کے الہ آباد والے ستونی کتبے میں دکھائی دیتی ہے۔ اب یہ چیزیں قصہ' پارینہ بن گئی تھیں اور شخصی حکومتوں کے سیلاب میں غرقاب ہو چکی تھیں۔ شخصی حکومت موروثی ہوتی تھی۔ اس میں حکمران کے انتخاب کا سوال نہیں تھا۔ واقعا ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آٹھویں صدی کے وسط میں اہل بنگال نے

Marfat.com

تمام دیش میں پھیلی طوائف الملوکی سے تنگ آکر پال کو راجہ چن لیا۔ اسی طرح 939ء میں سور ورمن کے انتقال کے بعد برہمنوں کی ایک جماعت نے ششکر کو کشمیر کا راجہ منتخب کر لیا۔ لیکن یہ مستثنیات ہیں اور ان سے اصول باطل نہیں ہو جاتا۔ عام طور پر سب سے بڑا بیٹا کی گدی پر بیٹھتا تھا۔ باپ اپنی زندگی ہی میں بیٹے کو یووراج نامزد کرنے کی رسوم باقاعدہ انجام دیتا تھا۔ بہر حال اگر چھوٹا بیٹا زیادہ اہل ہوتا تو بڑے بیٹے کو اس کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا' جیسا کہ اس وقت ہوا جب دھرووترویم نے استمب (کھمبہ) کی بجائے گووند سوم کو گدی کے لئے نامزد کیا۔
اس قسم کی ترجیحات کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بھائیوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تھی۔ بعض اوقات سوتیلے بھائی' مثلاً" بھوج دوم اور مہی پال گدی کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے۔ اگر راجہ نابالغ ہوتا تو کوئی قریبی رشتہ دار ولی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ایسے حالات میں اکثر و بیشتر درباری ریشہ دوانیاں شروع ہو جاتی تھیں اور ملک میں گڑ بڑ پھیل جاتی تھی۔ اس عہد میں شاہی خاندان کے افراد شان و شوکت کی زندگی گزارتے تھے اور ان کی ستبدادیت ایک مسلمہ حقیقت تھی' اور اگرچہ کہیں کہیں منتریوں اور اماتیوں (وزیروں اور مشیروں) کا ذکر سننے میں آتا ہے' لیکن راجہ کو مشورہ دینے اور اس کی مطلق العنانی پر پابندی لگانے کے لئے اگلے وقتوں کی طرح کوئی باقاعدہ منتری پر ۔شد نہیں ہوتا تھا۔ دراصل ہمارے اس دور کی دستاویزات میں راجہ کے کسی نئی مہم کا آغاز کرنے سے پہلے اپنے ویزروں سے مشورہ کرنے کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ وزرا اپنے عہدے کو برقرار رکھنے کے لئے جو انھیں اعلی نسبی کی بنیاد پر تفویض ہوتا تھا' نیز اپنے کلیتا بااختیار آقاؤں کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کی غرض سے ان کی ہاں میں ہاں ملانے کو عین مصلحت سمجھتے تھے۔ کلہن نے تاریخ کشمیر میں ایسی ایسی بہت سے کٹھ پتلیوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن ایسے وزرا کی مثالیں بھی ناپید نہیں ہیں جن کی دانش وری دیانت داری اور جاں نثاری کی بدولت راجہ ان کی عزت کرتے تھے۔ چناں چہ ایک کتبے میں یارو حکمران کرشن نے اپنے وزرا کو اپنی زبان اور اپنا دست راست کہا ہے۔
نظام حکومت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جاگیردار (سامنت یا مہاسامنت) ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا وجود بہت پرانے زمانے سے پایا جاتا تھا کیوں کہ فاتحین اکثر منو یا کوٹلیہ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق مفتوحہ علاقوں کو سلطنت میں شامل نہ کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے تھے۔ نویں صدی کے وسط میں سلیمان لکھتا ہے..... "ہندوستان میں جب کوئی راجہ کسی پڑوسی ریاست کو فتح کرتا ہے تو اس کے انتظام کے لئے وہ ہارے ہوئے راجہ کے خاندان میں سے کسی کو تعینات کر دیتا ہے جو فاتح کی طرف سے وہاں کی حکومت کا کام چلاتا ہے۔ اہل ریاست خود اس کے علاوہ کوئی بات گوارا نہیں کرتے۔" یہ بھی واقعہ ہے کہ توسیع سلطنت کی خواہش مند طاقتوں نے وقتاً فوقتاً مفتوحہ علاقوں کو سلطنت میں شامل کرنے اور ان کا انتظام شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ کرنے کی کوشش کیں۔ چناں چہ راشٹرکوٹوں نے گنگ واڑی کو'

Marfat.com

اور کرشن سوم کے عہد میں تونڈ منڈلم کو ضم کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح کیرل نے بھی کیرل اور پانڈیہ دیش کے معاملے میں یہی پالیسی اختیار کی۔ لیکن ان تمام کوششوں میں کامیابی ناپائیدار ثابت ہوئی۔ تمام جاگیر دار اپنے فرماں روا کے حاضرباش تھے اور فوجی مہموں میں راجہ کی امداد کیا کرتے تھے۔ کناری کا شاعر پمپ ہمیں بتاتا ہے کہ نرسنگھ چا لکیہ شمالی مہموں میں اپنے سردار اعلی اندر سوم کے ہمرکاب تھا۔ اسی طرح پالوں' پرتی ہاروں اور دوسرے حکمران خاندانوں کے کتبوں میں ایسے بے شمار جاگیرداروں کا ذکر موجود ہے جنھوں نے اپنے آقاؤں کی طرف سے ان کی لڑائیوں میں شرکت کی۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے یہاں تھوڑی بہت فوج بھی رکھتے تھے۔ چولوں کے پاس تو ایک بہت اچھا بری اور بحری لشکر تھا۔ لیکن دوسری بڑی بڑی طاقتیں' خاص کر شمالی ہند کی طاقتیں' خود اپنی باقاعدہ فوجوں کی طرف سے غافل ہو جائیں' اور ان کی قوت اور صلاحیت میں کمی آجاتی۔ چناچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ایک قسم کے جاگیر دارانہ نظام کی تشکیل ہو رہی تھی جو آگے چل کر ایک لعنت بن گیا۔ اس نظام نے اقتدار اعلی کو کمزور کر دیا یا کہیں بالکل ختم کر کے رکھ دیا۔

جنوبی ہندوستان کے کتبے اس دور میں پائی جانے والی گرام سبھاؤں کے وجود اور کارکردگی پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ پلو کتبوں میں اگرچہ ان سبھاؤں کا ذکر ذرا بعد کے زمانے میں آتا ہے' لیکن چولوں کے یہاں یہ سبھائیں انفرادی خصوصیت رکھتی تھیں۔ بدقسمتی سے شمالی ہند کے کتبوں میں بہر حال ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس مقام پر ضروری نہیں کہ جنوبی ہندوستان کی ان گرام سبھاؤں یا مہا سبھاؤں کے اختیارات و فرائض کی تفصیلات بیان کی جائیں۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگرچہ عام نگرانی شاہی افسران کی رہتی تھی' پھر بھی گاؤں کے تمام انتظامی معاملات میں یہ سبھائیں پوری طرح بااختیار ہوتی تھیں۔ انتظام میں باقاعدگی پیدا کرنے کی غرض سے سبھا کو چھوٹی چھوٹی کئی کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اپنے مقام پر الگ الگ مندروں' تالابوں' اشنان گرہوں' باغوں یا کھیتوں وغیرہ کی دیکھ بھال اور اصلاح کی ذمہ دار ہوتی تھیں۔ ان جماعتوں کے چناؤ کے لئے بڑے واضح اصول مقرر تھے۔ اراکین کا انتخاب صرف ایک سال کے لئے عمل میں آتا تھا۔ رکنیت کے لئے کسی شخص کی اہلیت یا نااہلی کا تعین کرنے کی غرض سے کچھ مخصوص صلاحیتوں..... مثلاً" کردار' علم و فضل' سماجی حیثیت وغیرہ..... کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

امن و امان قائم رکھنا ریاست کا بنیادی فرض ہوتا ہے' چناں چہ اس قیاس کے لئے ہمارے پاس کافی گنجائش موجود ہے کہ حکمران اپنے خارجی تعلقات میں کتنے ہی جارحانہ اقدامات کرتے ہوں' لیکن وہ اپنی ریاست کے اندر امن و امان قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ راجہ بھوج پرتی ہار کی سلطنت کے بارے میں سلیمان (851ء) لکھتا ہے..... "ہندوستان میں کوئی علاقہ ڈاکوؤں سے اس سے زیادہ محفوظ نہیں ہے۔" یہ گویا پرتی ہار راجہ کے انتظام حکومت کی انتہائی تعریف ہے کیوں کہ دو صدی پہلے جب یوآن چوانگ' ہرش کے زمانے میں اس علاقے سے گزرا

Marfat.com

تھا تو ڈاکوؤں نے اسے کافی پریشان کیا تھا۔

معاشی ادارے :

ریاست عوام کی خوش حالی کا بھی خیال رکھتی تھی اور رفاہ عام کے کام انجام دیتی تھی۔ چولوں نے لمبی چوڑی شاہراہیں تعمیر کرائیں جنھوں نے فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانیوں کے علاوہ تجارت اور رسل و رسائل میں بے پناہ سہولتیں۔ پہنچا دیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کنوئیں کھدوائے' تالاب بنوائے اور کاویری پر عظیم الشان ڈام تعمیر کرائے۔ نیز کاشتکاروں کی آبپاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہریں کھدوائیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے راجیندر اول نے بھی اپنی راجدھانی گنگے کونڈ چول پرم کے قریب ایک مصنوعی جھیل کھدوائی جو دریائے کولیرن اور ویلر کے پانی سے بھری جاتی تھی۔ اس طرح چندیلوں اور پرماروں نے متعدد جھیلیں ایسی تعمیر کرائیں جن پر پشتے بنائے گئے تھے۔ جیسے مہوبا میں مدن ساگر اور دھر میں منج ساگر۔ کشمیر میں اونتی ورمن کے وزیر سیہ (تقریبا 855-883ء) نے آبپاشی کے لئے نہریں کھدوائیں' یہاں تک کہ اس نے سیلابوں کی روک تھام کے لئے دریائے وتست (جہلم) کے بہاؤ کا رخ بدل دیا اور اس طرح بڑے بڑے دلدلی علاقوں کو قابل کاشت بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر میں لوگ اقتصادی طور پر زیادہ خوش حال ہو گئے کیوں کہ چاول کی ایک کھاری جس کی قیمت پہلے 200 دینار ہوا کرتی تھی' اب 36 دینار میں ملنے لگی۔ یہ تمام رفاء عامہ کے کام ظاہر کرتے ہیں کہ اس دور میں حکمران فوجی ترنگ میں محض اپنی من مانی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ بھولی بھالی رعایا کی فلاح و بہبود بھی ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔

حکومت کا استحکام اور افادیت ایک باقاعدہ نظام محصولات پر منحصر تھی۔ شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان دونوں جگہ کے کتبوں میں ہم کئی طرح کے محصولوں کا ذکر دیکھتے ہیں جن میں سے کچھ پابندی کے ساتھ' اور کچھ کبھی کبھار اتفاقیہ طور پر وصول کیے جاتے تھے۔ ان محاصل کی جامعیت غمازی کرتی ہے کہ حکومت نے آمدنی کے تصور میں آنے والے قریب قریب تمام ذرائع کو اچھی طرح کھکوڑ لیا تھا۔ ان بے شمار ٹیکسوں' چندوں اور جرمانوں کو ادا کرنے کی صلاحیت لوگوں کی اقتصادی حالت پر بالواسطہ روشنی ڈالتی ہے۔ درحقیقت مالیات کا سب سے بڑا سہارا زمین پر لگان تھا' جس میں غالبا قسم زمین' آبپاشی کی سہولتوں اور ریاست کی مخصوص ضروریات کے اعتبار سے کمی بیشی پائی جاتی تھی۔ لگان عام طور سے جنس میں ادا کیا جاتا تھا' لیکن بعض اوقات جزوی طور پر نقدی کی صورت میں بھی وصول کیا جا سکتا تھا' اور اس کے لئے قسطیں مقرر کی دی جاتی تھیں۔ راجرا جیشور مندر کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تامِلکم میں لگان چاول کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ وقتا فوقتا بڑی احتیاط کے ساتھ زمین کی پیمائش کرائی جاتی تھی اور زمین کے تمام پٹوں کا اندراج کر لیا جاتا تھا۔ چول ریاست میں یہ اہتمام خاص طور پر ہوتا تھا۔ ریاست کی آمدنی کا ایک ذریعہ تجارت بھی تھا۔ دور سمندر پار کے تجارتی تعلقات کے سلسلے میں

Marfat.com

چولوں کا جہازی بیڑا بہت مدد دیتا تھا۔ ریاست کی آمدنی کے دیگر ذرائع بھی تھے مثلاً"...... بنجر زمینیں' درخت' کانیں' نمک' زمین سے برآمد شدہ دفینے وغیرہ...... ریاست کے نزدیک بیگار لینا جائز تھا۔ اقتصادی زندگی کی تنظیم' پیشوں کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ ایک ہی پیشہ اختیار کرنے والے لوگ اپنے کاروبار میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے اپنی الگ الگ تجارتی انجمنیں بنا لیتے تھے۔ ہمارے اس عہد کے کتبوں میں اس قسم کی انجمنوں کے جا بجا حوالے آتے ہیں۔ ہر انجمن کا ایک چودھری ہوتا تھا۔ اور انجمن کے اراکین مجموعی طور ر مندروں وغیرہ کو عطیات دیتے تھے۔ یہی انجمنیں بعض اوقات بنک کا کام بھی انجام دیتی تھیں اور ان کے پاس روپیہ جمع کر دیا جاتا جس پر تھوڑا بہت سود بھی ادا کیا جاتا تھا۔ اپنے اندرونی انتظام میں وہ آزاد تھیں اور ریاست ان کے معاملات میں بہت کم دخل دیتی تھیں۔ ان کے ذریعہ سماجی تنظیم تو ہوتی تھی' لیکن اس کے علاوہ چوں کہ وہ قانونی پابندی کا جذبہ پیدا کرتی تھیں۔ اس لئے ریاست کے لئے ان کا وجود انتہائی مفید تھا۔

ثقافتی سرگرمیاں :

(الف) اس دور میں ادب کے میدان میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ یہ ادب بہر حال معیاری نہیں تھا۔ بے شمار حکمران ایسے تھے جو شائستہ ادب کے نہ صرف سرپرست تھے' بلکہ شعروشاعری میں خود بھی مہارت تام رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صاحب قلم بھی تھے اور صاحب سیف بھی چناں چہ ھرکیلی ناٹک' جس کے بعض اجزا جمیر میں پائی گئی ایک پتھر کی سل پر کندہ دستیاب ہوئے ہیں۔ وگرہ راج وسل دیو چاہمان سے منسوب ہے۔ ولال سین نے دان ساگر اور ادبھوت ساگر کی تدوین کی اور اس کا جو ناتمام حصہ تھا اسے لکشمن سین نے مکمل کیا واگ پتی منج کو اعلیٰ درجے کے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور بھوج پرور اعظم مختلف موضوعات...... مثلاً" طب' ہیئت' مذہب' قواعد تعمیرات' شعریات' فرہنگ نویسی' فنون وغیرہ پر تقریباً دو درجن کتابوں کا نام نہاد مصنف ہے۔ اس سے منسوب چند کتابوں کے نام ہم ذیل میں درج کرتے ہیں...... آیورویدسودسو راج مرگانگ' دیوھار' بجھیہ' شبدانوشاسن' سمرانگن سونتردھار' سرسوتی کنٹھا بھرن' نام مالکا یکتی کل پترو وغیرہ۔ اموگھ ورش اول راشٹر کوٹ نے کوی راج مارگ جو کناڑی زبان میں شعریات کے موضوع پر تصنیف ہے' اور پرشنوتر مالکا لکھیں۔ آخرالذکر کو بہر حال بعض لوگوں نے شنکر آچاریہ یادمل نامی شخص سے منسوب کیا ہے۔ مان سولاس جس میں مختلف قسم کے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ غالباً مغربی چالکیہ سومیشورسوم (تقریباً 1126-1138ء) کی تالیف ہے۔ مشرقی چالکیہ ونے ادتیہ سوم گند نے ریاضیات کی توسیع و ترقی میں کدوکاش کی۔ گنگ اور پلو فرماں رواؤں میں بھی کئی راجہ صاحب کیف ہوئے۔ بہر حال یہ بھی عین ممکن ہے کہ بعض راجاؤں کو جن کے نام اوپر لئے گئے' ان تصنیفات کے سلسلے میں ان کے درباری ادیبوں اور عالموں نے مدد دی ہو۔ راجہ دانش وروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی کرتے تھے جنھوں نے اپنی محنت و جاں فشانی سے اپنے

Marfat.com

زمانے کے علم و ادب کو مالا مال کر دیا۔

(ب) اس عہد کے جو بے شمار مندر آج باقی رہ گئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ جہاں تک فن کا تعلق ہے یہ عہد کافی زرخیز و شاداب تھا۔ ہندوستان میں جتنی عمارتیں بھی اس وقت تک تعمیر ہوئیں یہ مندر ان سب سے زیادہ نفیس و خوش نما ہیں اور ان کی تعمیر میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اڑیسہ کے مشہور مندر، خاص کر بھونیشور (ضلع پوری) کے مندر "ہند آیائی) طرز کا" جو اس وقت معراج کمال پر پہنچ چکا تھا، بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ہر مندر میں ایک دمان (مینار والا مٹھ) ایک جگ موہن (جلسہ گاہ) اور اس کے علاوہ نٹ منڈپ (ناچ گھر)، اور بھوگ منڈپ (رسوئی) ہوتے تھے۔ آخرالذکر دو کا اضافہ غالباً بعد کے زمانے میں کیا گیا۔ اڑیسہ کے مندروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں آرائش کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ آرائش میں انسانی حیوانی اور نباتی زندگی کے گوناگوں مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ بھونیشور میں لنگ راج کا مٹھ (گیارھویں صدی) اس خصوصیت کا بہترین نمونہ ہے۔ ان مندروں کی ایک خصوصیت ان کے سربہ فلک گاؤدم کلس ہیں جن کے املک میلوں دور تک تمام مناظر پر چھائے نظر آتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کونارک کے سوریہ مندر میں غیر ثقہ مناظر کی بھرمار ہے۔ یہ ایک دل چسپ بات ضرور ہے، لیکن اس انوکھی خصوصیت کا اصل محرک کیا تھا یہ ایک زچ کرنے والا مسئلہ ہے۔ ایک دوسرا مقام جہاں اب بھی چند عظیم الشان مندر باقی ہیں بند یلکھنڈ میں کھجوراوہ ہے۔ اس کے حسن کو چندیلوں نے چار چاند لگائے۔ کھجورا ہو کا کندریہ مہادیومندر (دسویں اور گیارسویں صدی) "ہند آریائی" طرز کا دوسرا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے مجسموں اور زیب و زینت کو دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ اس عہد میں سرزمین کشمیر پر تعمیر کا ایک جداگانہ طرز نشوونما پا رہا تھا جو اپنی علیحدہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کا بہترین نمونہ مارتنڈ مندر ہے جسے للتادیتہ مکتا پیڈ نے آٹھویں صدی کے ربع دوم کے قرب و جوار میں تعمیر کرایا۔ جین مت کے پیرو بھی عظیم معمار تھے۔ جین مندروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا گنبد عام طور پر ہشت پہل ہوتا ہے اور ان کے نقش و نگار میں جین دیو مال کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ شمالی ہند کے جین مندروں کا طرز "ہند آریائی" ہے اور جنوبی ہند کے مندروں کا دراوڑی۔ جینیوں کی تعمیری سرگرمیوں کا بہترین نمونہ دل وڑ (آبو پہاڑ) اور شت رنجیہ (پالتانہ) کے مشہور و معروف مندر میں۔ آبو پہاڑ پر تیجہ پال، اور دستو پال، ویل اور اس کے بھائیوں کے بنوائے ہوئے جو مندر ہیں وہ خوب صورت منت کاری اور خوش نما نقش و نگار کے لئے ممتاز ہیں۔ واتاپی (بادامی) اور پت (کل (ضلع بیجاپور) کے مندر چالکیہ یا دکنی طرز کے ہیں اور صحیح معنوں میں اس عہد سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس طرز کے مندروں میں بڑی آراستہ پیراستہ کرسی ہوتی ہے جس میں پانچ پہلو ہوتے ہیں اور اس کا نقشہ اکثر ستارہ جیسا ہوتا ہے۔ دکنی طرز غالباً دراوڑی طرز کا مرہون منت ہے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرا، اس کی اپنی انفرادیت مسلم ہو گئی۔ اس طرز کے بہترین نمونے میسور میں بٹک وشنو

Marfat.com

وردھن (تقریباً 1110-1140ء) کے بنوائے ہوئے بیلور کے مندروں میں اور ہوا ئسل ایشور کے بنوائے ہوئے بیلی بد کے (بارھویں صدی کا آخر) مندروں میں پائے جاتے ہیں۔ آخرالذکر اگرچہ ناتمام ہے لیکن "شان و شوکت اور آرائش میں ہندوستان کا کوئی دوسرا مندر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دکن کے بعض مندر پہاڑ کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں مثال کے لئے اس مقام پر ایلا پورا (الورا) کے عظیم الشان شیومندر کا ذکر کیا جا سکتا ہے جسے کرشن اول راشٹر کوٹ (تقریباً 757-772ء) نے کھدوایا۔ اسے "ہندوستان کے تعمیری دماغ کی حیرت انگیز ترنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پلووں نے فن کی زبردست حوصلہ افزائی کی۔ دلو نور (جنوبی ارکاٹ کا ضلع) پلو رم، دلم (ضلع چنگل پت) کے مندر، نیز مالا پرم کا دھرم راج رتھ، کانچی کا کیلاش ناتھ رتھ اور سات پیگوڈا مندروں کے نمونے کا "شور" (ساحلی) مندر ان کے تعمیری ذوق اور فنی صلاحیتوں کی بہترین یادگار ہے۔ لیکن یہ مندر ہمارے زیر نظر دور سے ذرا پہلے کی تعمیر ہیں۔ پلووں کی تعمیری روایات کی چولوں نے بھی برقرار رکھا اور جنوب میں متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں۔ دراوڑی مندروں کی پہچان نہ ہے کہ ان میں چوکھوٹے ومان، منڈپ اور گوپر پائے جاتے ہیں، ہالوں میں بڑے بڑے ستون ہیں، اور آرائش کے لئے روایتی شیر (یالی) کھنیاں (بریکٹ) اور مرکب ستون استعمال کئے گئے ہیں۔ بعد کے زمانے کی عمارتوں میں درمیانی مینار بہت بلندی پر بنے ہوئے منقش گوپورموں (پھاٹکوں) کے مقابلے میں ماند پڑ گئے ہیں۔ تنجور کا شیو مندر دراوڑی فن تعمیر کی بہترین مثال ہے۔ اسے راجراج اول (تقریباً 985-1014ء) نے تعمیر کرایا تھا، جو اسی کے نام پر آج تک "راج راجیشور" کہلاتا ہے۔ اس کا بلند ومان یا مینار 82 مربع فٹ کی کرسی سے پے در پے تیرہ منزلوں میں اوپر اٹھتا ہے۔ اس پر بہت بڑے ٹھوس پتھر کا تاج ہے جس کی اونچائی 25 فٹ اور وزن 50 ٹن ہے۔ ظاہر ہے اسے اپنی جگہ نصب کرنے میں کس قدر محنت کی گئی ہوگی اور انجینئروں نے کتنی قابلیت صرف کی ہوگی۔ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ دیگر قابل ذکر چول مندروں میں تنجور، کل ہستی اور گنگے کونڈ چول پرم کے مندر ہیں۔ چولوں نے سانچے میں ڈھالنے کے فن کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے زمانے میں پتھر اور دھات کے مجسموں میں شان، لطافت اور وقار پایا جاتا ہے۔

Marfat.com

○ باب 10

جنوبی ایشیا میں اسلام کی آمد

(ADVENT OF ISLAM IN SOUTH ASIA)

ظہور اسلام کے بعد جو عرب جہازرانی اور تجارت کے سلسلے میں جنوبی ایشیا میں آئے وہ قدرتی طور پر مسلمان تھے۔ اور اپنے جدید مذہب کے شوق سے سرشار۔ اس کے علاوہ وہ ان کے اخلاق و اطوار پہلے سے بہت سلجھ چکے تھے وہ عبادت' دیانت اور امانت کے پیکر بن چکے تھے۔ انہوں نے جنوبی ایشیا کے اکثر مقامات پر اپنی نوآبادیاں بنا لیں اور یہاں کے لوگوں کو مشرف باسلام کرنا شروع کر دیا۔ سراندیپ (لنکا) کے ایک پہاڑ پر ایک نقش قدم زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ جس کو ہندو شوجی کا نقش قدم سمجھتے ہیں۔ بودھ اسے ساکیامنی گوتم سے منسوب کرتے ہیں۔ اور سامی قوموں کا عقیدہ ہے کہ آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر اتارے گئے تھے' تو سب سے پہلے زمین کے جس حصے نے ان کے قدم چومے۔ وہی لنکا کی پہاڑی تھی۔ اور یہ نقش قدم انہی کا ہے۔ چنانچہ ظہور اسلام کے بعد بے شمار درویش اور سیاح اس نقش قدم کی زیارت کے لئے بھی سراندیپ آنے لگے اور آہستہ آہستہ ان جنوبی علاقوں میں جابجا مسلمانوں کی آبادیاں ہونے لگیں۔

جنوبی ایشیا میں اسلام کا پہلا مرکز :

جنوبی ایشیا میں اسلام کی اشاعت کے متعلق عرب اور ایرانی سیاحوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً" بزرگ بن شہریار ناخدا جو سراندیپ' لکادیپ' مالدیپ اور دوسرے جزائر کا جہاز راں تھا۔ سراندیپ کے سادھوؤں اور جوگیوں کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں اور ان سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ یہ لوگ ضرور بودھ ہوں گے اور دوسرے عرب سیاحوں کے بیانات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ناخدا نے بتایا ہے کہ اسلام کا پہلا مرکز سراندیپ ہی ہوا۔ سراندیپ اور اس کے نواحی علاقوں کو جب پیغمبر اسلام ﷺ کا حال معلوم ہوا۔ تو انھوں نے اپنا ایک فہیم وزیر کا قاصد تحقیق حال کے لئے عرب بھیجا۔ لیکن جب وہ مدینہ پہنچا۔ تو حضور ﷺ کا وصال ہو چکا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی وفات پا چکے تھے۔ اور حضرت عمر کا عہد تھا۔ یہ قاصد ان سے ملا۔ اور حضور ﷺ کے حالات دریافت کئے۔ حضرت عمر نے تفصیلا تمام حالات بتائے جب یہ قاصد واپس آرہا تھا۔ تو کمان میں فوت ہو گیا۔ اس کا ایک ہندو نوکر سراندیپ واپس پہنچا جس نے حضور اور حضرات

Marfat.com

شیخین کے حالات بیان کئے۔ اور ان کے درویشانہ اسلوب زندگی کا ذکر کر کے ان کی تواضع اور خاکساری کی تعریف کی۔

جنوبی ایشیا میں اسلام کا دوسرا مرکز :

جزیرہ مالدیپ میں مسلمانوں کا دوسرا مرکز قائم ہوا۔ ابن بطوطہ کے زمانے میں یہاں یمن وغیرہ کے بہت سے علماء اور جہاز ران موجود تھے۔ ان کی زبانی ابن بطوطہ نے مالدیپ کے لوگوں کے مسلمانوں ہونے کی یہ کیفیت درج کی ہے کہ یہ لوگ پہلے بت پرست تھے۔ یہاں ہر ماہ سمندر سے ایک عفریت بر آمد ہوتا تھا۔ جب لوگ اس کو دیکھتے تو ایک دوشیزہ کو آراستہ پیراستہ کر کے سمندر کے کنارے ایک مندر میں چھوڑ آتے' لیکن مراکش سے ایک عرب شیخ ابوالبرکات بربری اتفاق سے یہاں آنکلے۔ ان کی دعا سے یہ عفریت غائب ہوگیا اور لوگوں کے سر سے بلا ٹل گئی۔ مالدیپ کا راجا شنورازہ اور تمام رعایا حضرت شیخ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئی۔ اس وقت سے آج تک یہ جزائر مسلمان ہیں اور ان کی آبادی میں اکثریت مخلوط النسل عربوں کی ہے۔

ملیبار اشاعت اسلام کا ابتدائی مرکز :

ملیبار بھی اسلام کا ایک بڑا مرکز قرار پایا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں عرب و عجم کے کچھ مسلمان درویش حضرت آدم علیہ اسلام کے نقش قدم کی زیارت کے لئے سراندیپ (لنکا) جا رہے تھے کہ بادمخالف کی وجہ سے ان کا جہاز بھٹک گیا اور ملیبار کے شہر کدنگانور کے کنارے آن لگا۔ شہر کے راجا زیمورن (سامری) نے ان کی بہت خاطر تواضع کی۔ اور دوران گفتگو میں پوچھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے تو میں نے تمہارے پیغمبر اور دین کا حال بہت سنا ہے لیکن آج تم خود سناؤ۔ جب ان درویشوں نے اسلام کی حقیقت موثر انداز میں بیان کی تو راجا دین حق پر فریفتہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ آپ لوگ زیارت سے فارغ ہو کر واپسی پر یہاں ضرور آئیں جب وہ آئے تو راجا زیمورن نے امراء کو بلا کر کہا کہ میں اب یاد الٰہی میں بسر کرنا چاہتا ہوں تم لوگ مملکت کا انتظام کرو۔ یہ کہہ کر ملک اپنے افسروں میں تقسیم کر دیا اور خود چھپ چھپا کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس نے عربوں کو ملیبار کے ساتھ تجارت اور آمدورفت کی تلقین کی اور اپنے امراء کے نام ایک وصیت لکھی کہ "ان غیر ملکی تاجروں کو تمام سہولتیں بہم پہنچاؤ۔ ان کو مسجدیں بنانے کی اجازت دو اور اگر یہ ملیبار کو اپنا وطن بنانا چاہیں تو شوق سے بنائیں۔"

چنانچہ اس وقت سے جنوبی ایشیا جوق در جوق آنے لگے۔ اگرچہ ان کی آبادی دس فی صدی سے زیادہ نہیں تھی لیکن ملک کے سردار فوجی افسران سے حسن سلوک سے پیش آتے۔ یہی مسلمان عرب تاجر ہیں۔ جو برابر ملیبار میں مقیم ہیں اور ماپلا اور نائت کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں ملیبار کے اصلی باشندے بھی ہیں جو گزشتہ صدیوں میں مشرف باسلام ہوتے رہے۔

Marfat.com

معبر (کارومنڈل) اور اشاعت اسلام :

ان علاقوں کے مسلمان چونکہ اپنے غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت نہایت آزادی اور عزت و حرمت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس لئے ان پر جان بھی چھڑکتے تھے۔ چنانچہ 710ھ میں جب علاؤالدین خلجی کی فوج گجرات سے روانہ ہو کر کارومنڈل میں پہنچی۔ تو یہاں کے مسلمانوں نے جو عرب اور عراقی تھے۔ ترکوں کا جان توڑ مقابلہ کیا لیکن اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ سپہ سالار ملک کافور نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور معبر (کارومنڈل) میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ جہاں حسن کیتھلی اور اس نے جانشینوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک کوئی چالیس برس حکومت کی۔ لیکن اس صدی کے آخر میں وجیانگر کے راجا نے اس اسلامی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا پایۂ تخت شہر مدورا تھا۔

گجرات اور دکن میں اشاعت اسلام :

عرب مؤرخین اور سیاحوں میں اکثر نے یہ لکھا ہے۔ کہ ہندوستان کا سب سے بڑا راجا بلہرا ہے (جو اصل میں ولبھ رائے ہے) اس کی حکومت بہت وسیع تھی گجرات' کاٹھیاواڑ' کچھ اور کوکن جو عربوں کے تجارتی مرکز تھے۔ اسی راجہ کے ماتحت تھے۔ یہ راجا عربوں سے بے حد محبت رکھتا تھا اس کی رعایا کا عقیدہ تھا کہ ان کے راجاؤں کی عمریں صرف اس لئے لمبی ہوتی ہیں کہ عربوں کے ساتھ مدارات سے پیش آتے ہیں۔ اسی طرح طاقن کے راجا (یعنی حکمران دکن) کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ عربوں کے ساتھ بلہراہی کی طرح محبت رکھتا ہے۔ لیکن جزریا گوجر راجاؤں کی نسبت عام رائے یہ ہے کہ وہ عربوں کے دشمن ہیں۔ مسعودی نے بھی مروج الذہب میں بلہرا راجاؤں کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی راج میں بہت سی مسجدیں اور جامع مسجدیں تعمیر ہوئیں جو ہر طرح آباد ہیں۔ تھانہ اور کھمبایت میں بھی عربوں کی آبادیاں تھیں اور یہ بھی بلہراہی کی حکومت میں شامل تھے۔

دوسرے بے شمار مراکز :

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں بے شمار مقامات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں عرب بہت عزت و اقتدار کے ساتھ آباد تھے۔ یہ سیاح محمد تغلق کے زمانے میں آیا اور اس بادشاہ کی طرف سے ایک جوابی سفارت لے کر چین جا رہا تھا۔ یہ دہلی سے کھمبایت اور وہاں سے کارومنڈل گیا کہ چین کو جانے کا یہی راستہ تھا۔ چنانچہ اس نے کھمبایت' گاوی' گندھار' بیرم' گوگہ' چنداپور' ہنور' ملیبار ابی سرور' پاکنور' منگلور' ہیلی' جرپٹن' دہ پٹن' بدھ پٹن' پنڈارانی۔ کالی کٹ کولم' چالیات' مالدیپ' سیلون' گالی' معبر' دوراسمندر اور وجیانگر کا آنکھوں دیکھا حالات قلمبند کیا ہے۔ ابن بطوطہ کو ان تمام مقامات پر مسلمان تاجروں' مسلمان ناخداؤں اور مسلمان بزرگان دین سے ملاقات کا

Marfat.com

موقع ملا۔ ہر جگہ مسجدیں آباد نظر آئیں۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام پسند آیا اور بعض مقامات پر راجاؤں کی فوجوں میں ہزاروں مسلمانوں سپاہی بھی شامل نظر آئے۔ غرض جنوبی ایشیا کے جزائر اور مالا بار اور کارومنڈل کے ساحل صدہا سال سے عربوں کے تجارتی اور جہاز رانی کے مرکز بن چکے تھے۔

مسلمان بلوچستان میں :

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں حارث بن البصری نے 34 ہجری میں بلوچستان کے قریبی علاقے کچھی پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب کہ حارث بن مرہ نے پورے ضلع کچھی کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد راشد بن عمرو کو اس علاقے کا حاکم مقرر کیا گیا۔اس نے خضدار بھی فتح کر لیا۔ اس کے انتقال کے بعد ایران کے اموی حاکم حجاج بن یوسف نے سعید بن السلم الکلابی کو مکران کا حاکم مقرر کیا جس نے پورے مکران کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد مجاعد اور محمد بن ہارون بلوچستان کے حکمران رہے۔

مسلمان سندھ میں :

اس دور میں مسلمان بلوچستان اور سندھ کے سماجی حالات اور ثقافتی امور پر انداز نہ ہو سکے البتہ سندھ اور پنجاب میں مسلمان آباد کاروں نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا۔ عرب جہاز ران بھڑوچ' دیبل' مالا بار اور لنکا کے ساحلوں تک تو جاتے ہی تھے مگر بعض عرب قبیلے سندھ کے اندر آباد ہونے شروع ہو گئے تھے۔ غالباً یہ تجارت پیشہ لوگ تھے سندھ کے اندر ان کا اثرورسوخ اتنا ہو گیا تھا کہ "چچ نامہ" کی روایت کے مطابق سندھ کے حکمران راجہ چچ نے سکھر کے قلعہ پر امیرعین الدین ریحان مدنی کو حاکم مقرر کر رکھا تھا۔ ایک غیر ملکی کو حاکم مقرر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان سندھ کے سیاسی امور چھا چکے تھے۔

ان دنوں سندھ بڑا زرخیز لیکن ہندوستان کا بڑا دور دراز علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ راجہ چچ کے بعد حکومت اس کے بیٹے داہر اور بھتیجے راج میں تقسیم ہو گئی تھی راجہ داہر اروڑ (روہڑی) سے دیبل تک اور راج برہمن آباد (شہدا دپور کا) حاکم تھا راج کے بعد داہر کا بھائی دھر سینہ برہمن آباد کا حاکم بنا۔ یہ برہمن حکمران تھے جب کہ رعایا بدھ مت کی پیرو تھی۔ برہمنوں کی ہوس اقتدار اور ظلم و ستم نے بدھ رعایا کو اپنے حاکم سے بدظن کر رکھا تھا۔ داہر نے تو اس خیال سے کہ سلطنت کسی اور کے پاس نہ چلی جائے اپنی بہن سے خود شادی کر لی تھی۔ چنانچہ اس کا اپنا خاندان بھی اس کے مخالف ہو گیا۔ اس وقت سندھ کی حکومت کشمیر' قنوج اور افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی' لیکن داخلی کشمکش' بے اطمینانی اور ظلم و ستم کا شکار تھی' نچلے طبقے سومرو' سمہ قبیلوں کو برہمن اچھوت سمجھتے تھے۔ انہیں اچھے کپڑے پہننے کی عادت نہ تھی۔ انہیں حکم تھا کہ گھر سے نکلتے وقت اپنے ساتھ کتے رکھیں تاکہ پہچانے جائیں۔

Marfat.com

حجاج بن یوسف کے ظلم ستم سے تنگ آئے مسلمان اور بعض باغی سردار سندھ میں پناہ ڈھونڈتے تھے' جہاں ان کے مسلمان بھائی بھی موجود تھے۔ انہی میں ایک باغی سردار محمد علافی بہت مشہور تھے۔ حجاج نے عبید اللہ بن بنہان کو سندھ پر پہلا حملہ کرنے کا حکم دیا تھا یہ حملہ ناکام رہا تھا تو دوسرا حملہ بدیل نے کیا وہ بھی ناکام رہا۔ تو تیسرا حملہ محمد بن قاسم نے کیا اور 712ء میں وہ مکران سے ہوتا ہوا دیبل پہنچا۔ یہی نہیں بلکہ وہ پنجاب کے اندر ملتان اور دیپال پور تک چلا آیا اور اس نے سندھ میں باقاعدہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

محمد بن قاسم کی حکمت عملی :

محمد بن قاسم چار برس تک ہندوستان میں رہا اس کے باوجود اس نے ملک کے انتظام پر خاطر خواہ توجہ دی۔ یہ انتظام رواداری اور رعیت پروری پر مبنی تھا اس نے اکثر دشمنوں کو امان دی انہیں مختلف عہدے دیئے شہری آزادیاں برقرار رکھیں' مندروں کو بھی جاگیریں عطا کیں' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی آبادی کثرت سے مسلمان ہونے لگی' چنانچہ جابجا مسجدیں اور مدرسے قائم ہوئے۔ محمد بن قاسم کی حکمت عملی کو ہم مندرجہ ذیل نکات میں بیان کر سکتے ہیں۔

(1) مقامی ہندوؤں اور برہمنوں کی ذمی قرار دیا گیا اور انہیں آزادی دی گئی کہ وہ جس مذہب پر رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں۔ ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔

(2) راجا داہر نے سول نظم و نسق کے لئے جو عمال مقرر کر رکھے تھے انہیں بحال رکھا گیا۔ سوائے فوجی اور اعلیٰ انتظامی عہدی کے برہمنوں اور دیگر منصب داروں کے حقوق کو بحال رکھا گیا۔

(3) محمد بن قاسم نے ہندو اور بدھ مندروں کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ پرانے مندروں کی تعمیر کا ذمہ بھی لیا۔

(4) زمینداریاں اور ملکیتیں بھی بحال رکھی گئیں۔ صرف ان کی پیداوار پر معمولی مالیہ یا خراج وصول کیا جانے لگا۔

(5) جنگ کے دوران میں جن لوگوں کو نقصان پہنچا تھا انہیں دوبارہ آباد ہونے میں مدد دی گئی۔ ایسے لوگوں کی تعداد دس ہزار تھی۔

(6) دشمنوں اور مخالفوں کو معافی اور امان دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ تاجروں کو سابقہ حکمرانوں ناجائز پابندیوں سے بھی نجات دلائی گئی' نرمی اور فیاضی کا سلوک کیا گیا۔

(7) ہندوؤں میں پنچائت کا نظام رائج تھا محمد بن قاسم نے قاضیوں کے تقرر کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ان عدالتوں کو بھی قائم رکھا۔ دیوانی معاملات میں ہندوؤں کو عدالت کا انتخاب کرنے میں آزادی تھی۔

محمد بن قاسم کی اس فیاضی اور نرمی کے سلوک کا نتیجہ نکلا کہ رعایا جوق در جوق مسلمان ہونے لگی اور جب محمد بن قاسم کو جب واپس بلایا گیا تو اہل سندھ نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ غیر

Marfat.com

مسلم رعایا نے تو اس کے مجسمے تک بنا کر رکھ لئے

محمد بن قاسم کی واپسی تک اگرچہ اسلامی حکومت ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھی اور اس کے بعد طوائف الملوکی کا شکار ہو گئی لیکن جلد ہی محمود غزنوی اور اس کے بعد التمش نے یہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

فتح سندھ کے اثرات :

تاریخ پاکستان میں سندھ کی فتح کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ہم جان چکے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری تھا مگر اسلام کی اشاعت کے لئے جس سیاسی پشت پناہی کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد سندھ کی فتح کے ساتھ رکھی گئی۔

(1) ہندوستان کے مستقبل اور تاریخ پر فتح سندھ کے دوررس اثرات پیدا ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ شمالی ہندوستان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی چھاپ پڑنے لگی۔

(2) مسلمان مبلغوں' علما اور مشائخ کا ہندوستان میں آنا آسان ہو گیا اور یوں اسلامی اثرات تیزی سے پھیلنے لگے۔ سیاسی طور پر مقامی جاٹوں' زمینداروں مثلاً" لوہانوں' سومروں اور سموں کو برہمنوں کی غلامی سے نجات ملی۔

(3) لوگوں کو رواداری اور مساوات اور درگزر جیسے اخلاقی اقدار کا علم ہوا۔

(4) منصورہ بھنبورہ' اچ' سہون' اور ملتان میں علمی مراکز قائم ہوئے۔ ہندی کتابوں کے عربی میں ترجمے ہونے شروع ہوئے "معدحات" ریاضی اور فلکیات کی اہم کتاب اور چانکیہ کی طبی اور سیاسی کتابوں کے تراجم اسی دور میں ہوئے۔

(5) تجارت کو فروغ ہوا۔ دیبل' نیری کوٹ' سیوستان' خضدار' ارزڑ' منصورہ' ملتان' گجرات' مالابار' مدراس اور بنگال اہم تجارتی مراکز بنے۔

(6) صنعت و حرفت کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ کوفے کے کاریگروں نے سندھیوں کو چمڑا نرم کرنا سکھایا۔ یہاں تک کہ سندھ کا چمڑا دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔

(7) عربوں نے سندھ کو دو کوہان والا "نجقائی" اونٹ دیا۔ جو یہاں کی آب و ہوا میں خوب کام کرتا تھا گھوڑوں کی نسلیں اتنی بڑھیں کہ سندھ سے کچھ اور کاٹھیاوار تک پہنچ گئیں۔

محمد بن قاسم کے بعد :

محمد بن قاسم کے بعد سندھ پر یزید بن ابی کیشہ' حبیب بن مہلب اور عمر بن مسلم جاہلی حاکم مقرر ہوئے ان میں سے کوئی بھی محمد بن قاسم کی صحیح معنوں میں جانشینی نہیں کر سکا۔وہ مقامی لوگ جو نرمی رواداری اور عزت نفس سے آشنا ہو چکے تھے۔ نئے حکمرانوں کا ساتھ نہ دے

Marfat.com

سکے۔ اگرچہ بعد کے حکمران مثلاً" جنید بن عبدالرحمان نے اجین' مارداڑ' مالو ہنبلما اور گجرات پر حملے کئے اور انہیں اپنی قلمرو میں شامل کیا مگر عباسی دور کے آتے ہی جگہ جگہ بغاوتیں ہونے لگیں۔ خلیف منصور عباسی کے عہد میں منصورہ اور محفوظ کے شہر آباد کئے گئے لیکن عباسی خلفا ان دور دراز علاقوں پر قابو نہ رکھ سکے سب سے پہلے روہڑی میں ہندوؤں اور پھر رفتہ رفتہ دیگر علاقوں' منصورہ اور ملتان میں مسلمانوں نے خودمختار سلطنتیں قائم کر لیں۔ منصورہ میں 854ء میں ہباری اور ملتان میں 902ء میں بنوسامہ نے حکومت بنائی۔

اسماعیلی داعیان :

نویں صدی میں سندھ میں اسماعیلی داعی آنا شروع ہوئے یہ قرامطہ تھے۔ 883ء میں پہلا اسماعیلی داعی الہیشم سندھ میں آیا اور ملتان اور کاٹھیاواڑ تک کے علاقے میں کسانوں اور دستکاروں میں اسماعیلی تعلیمات کی تبلیغ کرنے لگا۔ یہ لوگ باطنی عقائد رکھتے تھے اور اسلامی رسم و رواج اور عقیدوں پر بھی قائم رہیں اور اسماعیلی بھی بن جائیں وہ انہیں عربی زبان سیکھنے' عربی تہذیب اختیار کرنے اور اسلامی نظام رکھنے کے لئے بھی مجبور نہیں کرتے تھے ان کوششوں سے پہلے سومرہ اور پھر سمہ قبیلے مسلمان و اسماعیلی ہوئے۔

اسماعیلیوں نے ملتان میں اپنا اثرورسوخ بڑھانا شروع کیا۔ ل یہاں ان دنوں عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ 964ء میں اسماعیلی داعی جلم بن شیان نے ملتان کے حاکم کو قتل کر کے یہاں قبضہ کر لیا۔ اس نے محمد بن قاسم کی مسجد بند کر دی۔ نئی مسجد تعمیر کرائی اور فاطمی خلیفہ کا خطبہ جاری کرایا۔ کچھ عرصہ بعد اسماعیلی سومروں نے منصورہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ چنانچہ سندھ کی طرف سے ہندوستان کی تسخیر کا عمل ختم ہو کر رہ گیا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ سندھ کے ریگستانوں کی طرف سے برصغیر کی فتح کسی کے لئے ممکن نہ تھی۔ یہ عمل شمالی زرخیز میدانوں سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ شمال کی طرف پہلے محمود غزنوں اور پھر شہاب الدین غوری نے برصغیر کی تسخیر کا عمل شروع کیا۔ انہی نے ملتان میں اسماعیلیوں کا زور ختم کیا اور پنجاب اور سندھ کو شمالی ہندوستان کے ایک پرچم تلے جمع کیا۔

محمود غزنوی کے سترہ حملے :

تاریخ میں برصغیر پر سلطان محمود غزنوی کے سترہ حملے مشہور ہیں۔ شروع میں تو اپنی سلطنت کو راجا جے پال کی دستبرد سے بچانے کے لئے اس نے درہ خیبر' پشاور اور بھٹنڈا پر حملہ کیا۔ مگر بعد میں ہندو راجاؤں کی امداد کرنے والے ملتان کے اسماعیلی حکمران کو سبق سکھانے اور راجاؤں کی قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے اسے برصغیر میں مزید فوج کشی کرنا پڑی۔ اگرچہ وہ برصغیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے ارادے سے تو نہیں آیا تھا لیکن اس کے بعد کے فاتحین کو شمال کا کمزور راستہ سجھائی دے گیا اور یوں شمال کی طرف سے ہندوستان کی تسخیر کا آغاز

Marfat.com

ہو گیا۔

سیاسی اثرات :

سلطان محمود کے سترہ حملوں کے مندرجہ ذیل سیاسی اثرات پیدا ہوئے۔

(1) سلطان محمود ہی نے برصغیر کو فتح کرنے کے لئے شمال کی طرف سے راستہ دکھایا۔

(2) پنجاب کے الحاق سے مسلم فاتحین کو ایک اہم سیاسی اور فوجی مرکز مل گیا جہاں سے باقی برصغیر کو فتح کیا جا سکتا تھا۔

(3) ہندوؤں پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا اور اگلے ایک ہزار برس تک یہ دبدبہ قائم رہا۔

(4) ہندو شاہی اور ہندو اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔

(5) شمالی ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کی لڑی میں پرو دیا گیا۔

(6) برصغیر کی سیاسی اور فوجی کمزوریاں آئندہ فاتحین پر عیاں ہو گئیں۔

(7) اسلامی سلطنت کے قیام کی راہیں ہموار ہو گئیں۔

مذہبی اثرات :

سلطان محمود غزنوی نہ تو مذہبی پیشوا' مبلغ یا رہنما تھا اور نہ اس کے حملے مذہبی نوعیت کے تھے لیکن اپنے ہر حملے کو مذہبی حیثیت ضرور دی تھی۔ ہندوؤں کے ساتھ جہاد مندروں پر حملہ اور بت شکنی اس کے عام مذہبی نعرے تھے ظاہر ہے کہ اس کام سے مذہب کی اشاعت ممکن نہ تھی لیکن اس کا بڑا اثر ہندو سیاست پر مرتب ہوا۔ ہندو شاہی بنیادی طور پر مذہبی تھی برہمنوں کا اقتدار تھا۔ برہمن اپنی تمام تر دولت کے انبار مندروں میں جمع کر رکھتے تھے۔ چنانچہ محمود کی سیاسی بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ سیاسی اہمیت کے مندروں کی شکست ہی دراصل ہندو شاہی کی شکست ہو گی ایک لازمی نتیجے کے طور پر سلطان غزنوی کو ان مندروں سے دولت بھی حاصل ہوئی جو اس نے غزنہ کے علاوہ اسلامی مساجد اور درسگاہوں کو بھی ارسال کی۔

اسلامی سلطنت کے قیام کی راہیں استوار ہونے اور برہمنوں کے اقتدار کی شکست سے اب اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے امکانات بھی بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ علماء اور صوفیا نے برصغیر کے اندر جانا شروع کر دیا ملتان کے لاہور بہت بڑا اسلامی مرکز بن گیا مساجد کی تعمیر تیزی سے ہونے لگی۔

عام ہندوؤں کے ساتھ سلطان محمود کے فیاضانہ سلوک نے انہیں اسلام کی طرف مائل کیا۔ دس ہزار ہندو اس کے لشکر میں شامل تھے۔ اس کے معروف ہندو سپہ سالاروں میں سو بند رائے' تلک اور ناتھ اہم ہیں۔

علمی اثرات :

Marfat.com

محمود غزنوی کے حملوں سے ملتان کے بعد لاہور علم و فضل کا بہت بڑا مرکز بنا محمود خود بھی علم پرور تھا اس کا بیٹا مسعود علم پروری میں اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ غزنوی دربار علماء اور فضلا سے بھرا رہتا تھا ابن سینا اور البیرونی اس کے دربار میں شامل تھے۔ البیرونی محمود کے ساتھ ہی ہندوستان آیا اور اس نے پہلی بار ہندوؤں کے مذہب' تاریخ اور تہذیب پر کتاب "الہند" لکھی۔ زمین کو گولائی (محیط) ناپنے کا تجربہ اس نے جہلم میں نندنا قلعے پر کیا تھا مسعود سعد مسلمان جیسا فارسی شاعر لاہور آیا۔ یہاں اس نے کتاب خانہ قائم کیا۔ اسنے اردو شاعری کا آغاز ہوا۔

مسعود بن ابوالفرح اور دیگر شعرا نے بھی لاہور کا رخ کیا۔ 1005ء میں لاہور میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز غزنوی عہدی میں شیخ علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہور کو تشریف لائے لاہور کے ہندو نائب رائے راجو نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا بعد میں لاہور اور اس کے گردونواح کے گوجر اور دیگر اقوام جوق در جوق اسلام میں شامل ہوئیں اور داتا صاحب سے بیعت کرنے لگیں لاہور اور ملتان میں دینی درسگاہیں کا قیام عمل میں آیا۔ پنجاب اور سندھ کے دور دراز گاؤں بھی اس عمل خیر میں پیچھے نہ رہے اس دور میں بھکر اور اچ کے قصبے دینی تعلیمات میں معروف تھے۔

محمود غزنوی اپنے ساتھ فارسی زبان لایا تھا۔ جس کے اثرات پنجابی پر مرتب ہوئے اور ادھر سندھ پر عربی کے اثرات مرتسم ہو رہے تھے۔ چنانچہ محمود کے پنجاب اور سندھ کے حملوں سے اس جدید پنجابی اور سندھی کا ملاپ ہوا اور اس سے ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جسے ہم آج اردو کے نام سے جانتے ہیں۔

سماجی اثرات :

سلطان محمود غزنوی کا حملہ دراصل اسلامی تہذیب و ثقافت کا ہندومت کے ساتھ ٹکراؤ تھا۔ ہندو تہذیب برصغیر کی ایک مستحکم اور سخت تہذیب تھی۔ کوئی مذہب' مسلک یا تہذیب اس میں دراڑ نہ ڈال سکتی تھی۔ بدھ مت اور جین مت کے حملے بھی ناکام ثابت ہوئے اور علماء ہندومت کا حصہ بن کر رہ گئے اسلامی تہذیب سخت جان ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ اسلامی تعلیمات کی سادگی' نرمی' رواداری' مساوات اور نیکی تھی۔ چنانچہ ہندومت اسلام کو اپنا حصہ نہ بنا سکا۔ اسلامی تہذیب کے اثرات کے باعث علمی' ثقافتی' تعمیراتی' سماجی اور معاشی صورتوں میں تبدیلی آئی۔ علم مخصوص لوگوں کی جاگیر بننے کی بجائے عام مدرسوں میں پہنچ گیا۔ لوگوں کا رہن سہن صاف ستھرا ہو گیا۔ ننگ دھڑنگ رہنے والے ہندوستانی اب تن پوشی کرنے لگے خوبصورت مساجد کے ساتھ ساتھ دیگر خوبصورت تعمیرات وجود میں آنے لگیں۔ جن میں وسعت اور کشادگی کا احساس ہوتا تھا معاشی طور پر البتہ غزنوی عہد برصغیر کے لئے بہتر ثابت نہ ہوا۔

Marfat.com

محمود نے برصغیر کی دولت غزنہ میں جمع کر دی چنانچہ غزنہ خوشحال ہو گیا۔ علمی دفاتر اور کتابیں ہی محمود غزنہ لے گیا تھا لیکن لاہور آنے والے علما یہ ذخائر کو واپس نہیں کر گئے بلکہ ان میں قابل قدر اضافہ بھی کیا۔

غزنوی دور حکومت کے بعد :

غزنوی دور حکومت کے خاتمہ کے بعد برصغیر پر غوری خاندان کی حکومت قائم ہوئی جو برصغیر میں اسلامی سلطنت کا قیام تھی۔ اس کے بعد بالترتیب خاندان غلاماں' خاندان خلجی' خاندان تغلق' سید خاندان' لودھی خاندان کی حکومت رہی۔ ان تمام حکومتوں کو عہد سلاطین کہا جاتا ہے۔ سلاطین کے عہد کے بعد مغلیہ خاندان کی حکومت قائم ہوئی اور اس کا خاتمہ انگریزوں کے برصغیر پر قبضے پر ہوا۔ انگریزوں نے برصغیر پر تقریبا سو سال تک حکومت کی اور آخر کار 1947ء میں برصغیر آزاد ہوا جس کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان دو آزاد ریاستیں دنیا کے نقشے پر ابھریں۔

برصغیر پر اسلام کے اثرات :

سندھ' ملتان اور پنجاب کے بعد رفتہ رفتہ اسلامی سلطنت کم و بیش پورے برصغیر میں قائم ہو گئی تھی۔ اسلامی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی علم و فضل اور عدل و مساوات کا دور دورہ ہو گیا۔ اسلامی علوم و فنون کو بڑی ترقی ملی اور مسلمان بادشاہوں نے بڑے بڑے شہروں میں عالیشان مسجد تعمیر کرائیں۔ اس طرح برصغیر میں فن تعمیر کا ایک نیا اور جداگانہ انداز رائج ہوا۔

وسط ایشیا سے آنے والے بے شمار عالموں اور صوفیوں نے برصغیر میں اسلام کی اشاعت اور ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں میں لاکھوں انسانوں کی اصلاح کر کے ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ایک طرف تو مسلمان حکمرانوں نے عادلانہ نظام حکومت قائم کر کے پرانے طبقاتی اور ذات پات کی تفریق کا سلسلہ ختم کیا' دوسری طرف صوفیاء اور علماء نے عوام سے قریبی تعلق قائم کر کے ان کی ہدایت اور اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ ان کی خانقاہیں اور درس گاہیں مسلم معاشرے کی اہم تہذیبی اور تربیتی مرکز ہوا کرتی تھیں۔

یہ ان بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہاں کی سر زمین کی آبادی کا بڑا حصہ مسلمان ہے۔ انہوں نے یہاں کی معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

برصغیر میں اسلامی حکومت کے قیام سے جو اثرات اور نتائج بر آمد ہوئے' اس سلسلے میں یہ نکات یاد رکھنے کے قابل ہیں:

(1) برصغیر کا بیرونی دنیا سے تعلق قائم ہوا اور باہمی تجارت کا سلسلہ شروع ہوا۔

(2) سب علاقوں میں ایک طرح کا نظم و نسق قائم ہونے سے انتظامی ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔

Marfat.com

(3) فن تعمیر کا نیا انداز قائم ہوا اور اعلیٰ صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا۔

(4) امن و امان کے قیام سے معاشی اور معاشرتی بہتری پیدا ہوئی۔

(5) ایک عام ملک زبان اردو وجود میں آئی۔

(6) تصوف کی ترقی سے ایک عام رواداری اور باہمی میل جول کا رجحان پیدا ہوا۔

(7) ثقافتی، علمی اور ادبی فضا قائم ہوئی۔

Marfat.com

○ باب 11

مسلم معاشرے کا قیام

(MUSLIM SOCIETY)

مسلم فاتحین کے زیر برصغیر میں مسلمانوں کی آمد' ان کے قیام اور بودوباش سے رفتہ رفتہ ایک مسلم معاشرے کا قیام ممکن ہو سکا۔ ان کی نیک عملی اور تبلیغی سرگرمیوں سے مقامی آبادی کی بڑی تعداد بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئی۔ اسلام کی تعلیم بہت سادہ اور دلنشین تھی۔ اس لئے صوبوں سے ذات پات کی تفریق میں الجھی ہوئی اور برہمنت کی کچلی ہوئی انسانیت نے اس تعلیم میں امن اور نجات کی صورت دیکھی' صفائی' طہارت' مساوات' انصاف اور علم کی روشنی اسلام کی ایسی خصوصیات تھیں جن نے یہ دین عوام و خواص کے لئے قابل قبول بن گیا۔

مثال کے طور پر محمد بن قاسم نے 720ء میں دیبل فتح کیا یہاں چار ہزار عرب مسلمان آباد ہوئے اور مسجد تعمیر کی گئی اس طرح دوسرے شہروں میں بھی مسجدیں اور درس گاہیں قائم ہوئیں۔ چنانچہ دوسرے علاقوں میں بھی اسلامی تہذیب کے اثرات رہے اور سندھ کی جو اقوام نیم وحشی تھیں' تہذیب و ترقی کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ ان پر اسلامی تعلیم و تمدن کے اثرات غالب آگئے۔ اس طرح جو معاشرہ وجود میں آیا' وہ جھوٹ' فریب' دھوکے سے پاک تھا اور لوگ قول کے سچے تھے' ناپ تول میں کمی نہ کرتے تھے۔

اسی طرح محمود غزنوی کی فتوحات کے نتیجے میں بہت سے ایرانی اور افغانی خاندان پنجاب میں آکر آباد ہو گئے۔ مسلمان فوجوں کے ہمراہ کئی مسلمان مبلغ بھی آئے اور یہاں آباد ہو گئے۔ ان کی تبلیغ اور روحانیت سے برصغیر میں اسلام کی خوب اشاعت ممکن ہو سکی۔ ایسے ہی محمود غزنوی کی پالیسی سے اسلامی سلطنت قائم ہوئی اور تبلیغ دین کو تقویت ملی۔

اس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جہاں عدل و انصاف تھا اور غیر مسلموں سے رواداری کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں وسطی ایشیا میں مسلمان حکومتیں منگولوں کے سیلاب کے ساتھ بہہ رہی تھیں لیکن برصغیر میں ایک نئی مضبوط ریاست کا قیام عمل میں آیا اس کے ساتھ ہی اسلامی ثقافت اور علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔

ثقافتی اثرات :

مسلمانوں کی آمد سے' خصوصاً محمود غزنوی کے حملوں کے بعد برصغیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ اسی طرح علم و ادب کو فروغ حاصل ہوا' فن تعمیر اور اسلامی تہذیب

Marfat.com

تمدن کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں نہایت مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں' تہذیبوں اور ثقافتوں کے ملاپ سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی جو ہندوستانی تہذیب کہلائی۔ سندھی رسم الخط' سندھی زبان اور پھر اردو زبان اسی تہذیب کی پیداوار تھی۔

معاشی اثرات :

ہندو برہمنوں نے اپنے مندروں میں بے اندازہ دولت جمع کر رکھی تھی۔ محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں یہ دولت مسلمانوں کے قبضے میں آگئی اور عالم اسلام پر صرف ہونے لگی۔ محمود غزنوی نے اسے دولت سے اپنی فوج کی تنظیم نو کی' اپنی سلطنت کو مستحکم کیا اور غزنی میں عالی شان عمارات سر اٹھانے لگیں۔

برصغیر میں فوری طور پر سونے چاندی کے ذخیرے کم ہو گئے چونکہ یہ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور اس وقت یہاں لوٹ کھسوٹ کرنے والے برہمن اپنا اثرو رسوخ کھو چکے تھے' اس لئے چند ہی برسوں میں کسانوں کی خوشحالی میں اضافہ ہو گیا' عربی نسل کے گھوڑوں اور اونٹوں کی افزائش ہونے لگی اور کھجوروں کی بہتات ہو گئی۔ تجارت کو دیانت اور امانت کی بنیادوں پر استوار کیا گیا۔

علمی اثرات :

اس دور میں علوم و فنون کو بڑا فروغ حاصل ہوا عباسی خلفاء نے ہندو کتابوں کے میں دلچسپی لی' چنانچہ فلکیات کی کتابیں سدہانت' آریہ بھٹ اور کھنڈا کھنڈیک سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ہندوستانی اعداد اور صفر لکھنے کا طریقہ مسلمانوں نے ترقی دے کر عربی ہندسوں کے نام سے روشناس کرایا۔ اس سے گنتی لکھنا آسان ہو گئی۔

طب پر ہندو پنڈتوں کی کتابیں خصوصا سشرت' چرک اور چانکیہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ سنسکرت کی کتاب پنچ تنتر کا فارسی میں ترجمہ کلیلہ و دمنہ اور کئی دیگر علوم کی کتابوں کے فارسی اور عربی ترجمے ہوئے۔ نویں صدی عیسوی کے اواخر میں قرآن مجید کا سندھی ترجمہ ہوا۔ اس سے سندھی زبان میں اسلام کی اشاعت کو فروغ حاصل ہوا۔

محمود غزنوی کے دور میں غزنی کا دربار علم و ادب کا مرکز بن گیا جو رفتہ رفتہ لاہور منتقل ہو گیا۔ اس کے دربار میں البیرونی' فارابی' بیہقی اور ناگی جیسے ممتاز علماء موجود تھے۔ لاہور میں اس کے ساتھ البیرونی' مسعود سعد سلمان جیسے علماء اور اس کے دور میں داتا گنج بخش جیسے صوفیاء تشریف لائے۔

اہم علمی اور ادبی شخصیات :

(الف) البیرونی : وہ 973ء میں خوارزم کے قریب ایک گاؤں بیرون میں پیدا ہوا۔ 1017ء

Marfat.com

میں غزنی چلا آیا یہاں وہ محمود غزنوی اور اس کے بیٹے مسعود سے منسلک رہا۔ اس نے ایک سو چودہ کتابیں تصنیف کیں اور 78 برس کی عمر میں 1048ء میں وفات پائی۔

البیرونی پہلا مسلمان سائنس دان ہے جس نے زندگی کا زیادہ عرصہ برصغیر کے باہر گزارا لیکن برصغیر پر پہلی کتاب اسی کی "کتاب الہند" ہے۔ اس کتاب میں اس نے ہندوؤں کے مذہب' رسموں' رواجوں' علوم و فنون اور معاشرتی و معاشی حالات کا پہلی بار جامع تذکرہ کیا۔

وہ پہلا سائنس دان ہے جس نے زمین کا محیط ناپا۔ محیط ناپنے کا یہ تجربہ اس نے جہلم کے قریب قلعہ نندنا میں کیا۔ اس نے اپنے تمام تجربات کو کتاب "قانون مسعودی" میں درج کیا ہے۔

البیرونی نے جواہر اور نباتات پر بھی کتابیں لکھیں۔ اس نے پہلی بار بتایا کہ پھول کی پتیوں میں عددی باقاعدگی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ طاق تعداد میں ہوتی ہیں یعنی تین' پانچ' یا سات وغیرہ۔

البیرونی ریاضی' ہیئت' نجوم' کیمیا' جغرافیہ وغیرہ علوم کا ماہر تھا۔ اس نے بتایا کہ پنجاب اور سندھ کے میدان دریاؤں کی پہاڑوں سے لائی ہوئی مٹی سے بنے ہیں۔

وہ فارسی' عربی' ترکی' عبرانی' یونانی زبانوں سے واقف تھا۔ اس نے عربی سے کئی کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کی تھیں۔

(ب) مسعود سعد سلمان : برصغیر میں پہلا فارسی اور اردو شاعر مسعود سعد سلمان کو تصور کیا جاتا ہے۔ وہ 1046ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کے والد خواجہ سعد سلمان' سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں لاہور آئے تھے۔

مسعود سعد سلمان پہلے سلطان ابراہیم' پھر اس کے بیٹے علاؤالدین مسعود کے دربار سے وابستہ رہا۔ شک کی بناء پر کچھ عرصہ قید رہا۔ قید کے دوران میں اس نے کئی فارسی قصیدے لکھے۔ رہائی کے بعد اسے شاہی کتب خانے کا نگران مقرر کیا گیا۔ اس کے عربی' فارسی اور ہندوی یا اردو کلام کے تین دیوان تھے۔ اس کا فارسی دیوان مشہور فارسی شاعر سنائی نے مرتب کیا تھا جو تہران سے شائع ہو چکا ہے۔ عربی اور اردو دیوان نایاب ہیں۔

اہم علمی اور تہذیبی مراکز :

(1) بنبھور :

کراچی سے گھارو جاتی ہوئی سڑک پر کراچی سے قریباً چالیس میل اور گھارو سے دو میل کے فاصلے پر بنبھور کے کھنڈر چوتھائی میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کھنڈروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی یہ بڑا گنجان اور پر رونق شہر تھا۔ یہاں کے آثار سے مسلمانوں' ہندوؤں' ساسانیوں اور پارتھیوں کی تہذیبوں کے نشانات ملتے ہیں۔

محمد بن قاسم کے عہد میں ایک مشہور بندرگاہ تھی۔ مسلمانوں یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس کے کتبے پر 294ء درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خلیفہ ولید اول کے

Marfat.com

دور کی مسجد ہے۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک بڑی عمارت کے کھنڈر ملتے ہیں جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مکتب تھا۔

بعض مورخوں اور جغرافیہ دانوں کا اندازہ ہے کہ محمد بن قاسم نے 712ء میں جس بندرگاہ دیبل کو فتح کیا تھا' وہ دراصل بنبھور ہی تھا۔

بنبھور کی اہم دریافت اس کے سکے ہیں۔ ایک سکے پر ایک طرف 21 یزدگردی سال (مطابق 32ھ) اور دوسری طرف بسم اللہ لکھا ہوا ہے۔ یہاں سے اموی اور عباسی دونوں عہدوں کی چیزیں نکلی ہیں۔ اموی دور کے برتن ملے ہیں جن پر خط کوفی میں عبارتیں لکھی ہیں اور عباسی دور کے سکے ملے ہیں۔ ان کے علاوہ سندھ میں ڈھلنے والے سکے بھی دریافت ہوئے ہیں۔

(2) منصورہ :

منصورہ شہر کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے نے رکھی تھی۔ وہ سندھ کا گورنر تھا اور اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر اس نے 737ء میں یہ شہر آباد کیا۔ انداز 743ء تک سندھ کا دارالسلطنت اوڈا تھا۔ اس کے بعد منصورہ دارالسلطنت بنا اور قریبا تین سو سال تک سندھ کا دارالسلطنت رہا۔

یہ دریائے سندھ کے کنارے ایک جزیرے کے شکل میں آباد ہوا تھا۔ یہ ایک مربع میل رقبے کا پررونق شہر تھا اور ملتان سے بڑا شہر تھا۔ شہر کے چار دروازے تھے اور اردگرد باغ تھے۔ محل وقوع کے اعتبار سے یہ شہر دریا کے کنارے اور سمندر سے قریب تھا۔ اس لحاظ سے عراق اور ملک عرب سے آمدورفت کے لئے مناسب تھا۔ اس کے دائرہ حکومت میں آنے والے دیہات اور آبادیوں کا شمار تین لاکھ تھا۔

منصورہ میں عربوں کی خاصی آبادی مقیم ہو گئی تھی۔ عرب سیاح مقدسی لکھتا ہے کہ منصورہ میں قاضی ابو محمد منصوری جیسے بلند پایہ عالم اور مصنف موجود تھے۔ یہاں پر مقیم ایک عرب نوجوان نے قرآن کا ترجمہ سندھی میں کیا تھا۔ منصورہ میں علم و فضل کی عام رونق تھی۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت دوسرے شہروں سے بڑھی ہوئی تھی۔ عربوں کے زمانے میں منصورہ علم و ادب کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

یہ شہر ساتویں صدی ہجری کے وسط تک موجود تھا۔ محمود غزنوی کے حملوں کے زمانے میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی صدی کے آخر میں زلزلے کی وجہ سے منصورہ اور برہمن آباد تباہ ہو گئے۔

(3) اُچ

بہاول پور سے جنوب مغرب میں اڑتیس میل پر اُچ واقع ہے۔ اچ کو اسلامی عہد میں بڑی ترقی اور وسعت حاصل ہوئی اور ایک علمی' تہذیبی' تجارتی اور جنگی مرکز کے لحاظ سے اہمیت

Marfat.com

اختیار کر گیا۔ سیاحوں اور مورخوں نے اس کی خوبصورتی اور خوشحالی کا ذکر کیا ہے۔ اسے پہلے پہل محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ محمود غزنوی کے زمانے میں یہاں ایک اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی عہد میں شیخ صفی الدین گازرونی یہاں تشریف لائے اور ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ اچ کو سب سے زیادہ عروج سلطان ناصرالدین محمود کے عہد حکومت میں حاصل ہوا۔

حضرت زکریا ملتانی نے اپنے مرید جلال بخاری (1191ء-1291ء) کو لوگوں کی رہنمائی کے لئے اچ روانہ کیا۔ وہ اچ میں باقاعدگی سے وعظ کیا کرتے جس سے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے۔

مسلم سلاطین کے زمانے میں ملتان کی طرح اچ بھی تصوف کا بڑا مرکز تھا۔ اچ کی شہرت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی موجودگی سے ہوئی۔ مخدوم صاحب (1307ء-1384ء) علم ولایت اور سیادت کے جامع تھے۔ وہ کثرت سیاحت کی وجہ سے جہاں گشت کہلائے۔ انہوں نے چھتیس حج کئے تھے۔

سید محمد غوث گیلانی ملتان' لاہور' اور اچ میں ہدایت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے رہے۔ سلطان سکندر لودھی آپ کا مرید تھا۔

اچ میں شیخ صفی الدین گازرونی' سید جلال بخاری' مخدوم جہانیاں جہاں گشت وغیرہ کے مزار بھی موجود ہیں۔

(4) ملتان :

راجہ داہر کے زمانے میں ملتان ریاست سندھ کا ایک صوبہ ہوا کرتا تھا۔ ہر صوبے کا الگ صوبیدار ہوتا تھا جو ضرورت پڑنے پر راجہ کو سپاہی فراہم کرتا تھا۔

ملتان میں ہندوؤں کا ایک مشہور بت تھا۔ لوگ دور دور سے اس کی زیارت کے لئے آتے تھے اور نذریں اور چڑھاوے لاتے تھے۔ اس طرح ملتان ایک دولتمند شہر بن گیا۔ اس کی رونق اور خوشحالی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔

عربوں نے یہاں ساتویں صدی عیسوی میں قبضہ کیا' پھر محمود غزنوی کے عہد تک اس پر عربوں کا قبضہ رہا۔ پہلے تو یہ سندھ اور منصورہ کے حکمرانوں کے قبضے میں رہا۔ بعد ازاں ایک خود مختار ریاست بن گیا۔ اس ریاست میں ایک لاکھ سے زائد دیہات شامل تھے۔

ملتان شہر کے چاروں طرف ایک فصیل تھی۔ محمد بن قاسم نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔

ملتان میں ہندی اور عربی تہذیب و ثقافت کی آمیزش ہوئی۔ یہ شہر منصورہ سے چھوٹا تھا لیکن زیادہ آباد تھا۔ بلبن کے زمانے میں ملتان پنجاب اور سندھ کا دارالسلطنت تھا اور اسلامی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز۔ ملتان نے علوم و فنون کے اعتبار سے بہت ترقی کی۔ یہاں عرصے تک اسماعیلیوں کی حکومت رہی۔ یہ شہر صوفیاء کا بھی بہت بڑا مرکز تھا۔ ہندوستان جانے والے اکثر صوفیاء پہلے ملتان ہی میں قیام کرتے تھے۔ منگولوں کے حملوں کے بعد ملتان تجارت کا بڑا مرکز بن

Marfat.com

گیا تھا۔

صوفیاء ملتان میں اولین تذکرہ شاہ یوسف گردیزی (1069ء-1152ء) کا ملتا ہے۔ جن کا خاندان آج تک ملتان میں آباد ہے' چنانچہ مسلمانوں کے دور کی سب سے پرانی عمارت بھی یوسف گردیزی کا مقبرہ ہے۔ یہ 1152ء میں تعمیر ہوا۔ پھر شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (1182ء-1262ء) کا نام نامی بہت مشہور ہے۔ انہوں نے ہدایت اور خدمت خلق کا نہایت اعلیٰ معیار قائم کیا۔

(5) سہون :

اسلام کی آمد سے پہلے ہندو راجوں نے سندھ کو چار صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان میں سے ایک صوبہ سہون بھی تھا جو اس وقت سیوستان کہلاتا تھا۔

محمد بن قاسم دیبل اور نیرون کی فتح کے بعد سہون پہنچا۔ وہاں کا حاکم قلعہ بند ہو گیا۔ آبادی زیادہ تر بدھ مت سے تعلق رکھتی تھی اور جنگ نہیں چاہتی تھی۔ محمد بن قاسم نے قلعے کا محاصرہ کیا اور چند دنوں میں وہاں کا حاکم بھاگ نکلا۔ شہریوں نے اطاعت قبول کر لی' چنانچہ محمد بن قاسم وہاں چند روز مقیم رہا۔

سلطان ناصر الدین محمود نے سندھ کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک صوبے کا صدر مقام بھکر تھا' دوسرے کا سہون۔ ان کا الگ الگ گورنر ہوا کرتا تھا۔

سلاطین غلاماں کے عہد میں سہون علوم کا ایک بڑا مرکز اور تعلیم کے لئے کئی اعلیٰ مدرسے قائم تھے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ میں نے سہون میں شیراز' بغداد اور مصر کے متعدد علماء سے ملاقات کی۔

عربوں سے پہلے یہ شہر بدھ مت کا بڑا مرکز تھا۔ عربوں کی آمد کے بعد یہ ایک تجارتی مرکز بن گیا۔

حضرت لال شہباز قلندر کی وجہ سے سہون کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

سہون سے کچھ سکے محمود غزنوی کے نام کے جاریکردہ دریافت ہوئے ہیں۔ محمد غوری کے تانبے کے سکے بھی قلعہ سہون سے برآمد ہوئے ہیں۔ قطب الدین ایبک کے زمانے میں ناصر الدین قباچہ اچ' ملتان اور سندھ کا حاکم تھا۔ اس کے نام کا تانبے کا ایک سکہ بھی سہون سے ملا ہے۔ اس طرح ناصر الدین محمود' معزالدین کیقباد' جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی وغیرہ کے عہد کے سکے بھی یہاں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکے ان علاقوں میں رائج رہے ہیں۔

(6) لاہور :

لاہور کا ذکر عام طور پر ایک قدیم شہر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے پرانے قصوں

Marfat.com

اور مذہبی روایتوں میں لاہور کا نام آتا ہے۔ کشمیر کی قدیم تاریخ راج ترنگنی میں بھی تذکرہ آیا ہے کہ لاہور راجہ للتا دتیا کا دارالحکومت تھا۔

ساتویں اور دسویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے برصغیر پر حملے کیے تو اس وقت لاہور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا دارالحکومت تھا اور ایک بڑا شہر تھا۔

محمود غزنوی نے لاہور فتح کیا اور اس کے جانشینوں نے اسے بڑا عروج بخشا۔ محمود غزنوی نے یہاں کا انتظام اپنے عزیز غلام ایاز کے سپرد کیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق لاہور کا قلعہ اور شہر کی فصیل ایاز ہی نے بنوائی تھی۔ ان کا تو اب نام و نشان نہیں ملتا' البتہ ایاز کا مقبرہ اب بھی لاہور میں موجود ہے۔ ایک اندازے کے مطابق غزنوی خاندان کی حکومت کے اختتام تک لاہور دارالسلطنت بنا رہا۔

دوسرے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں بھی لاہور کو مرکزی اہمیت حاصل رہی۔ چونکہ یہاں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس لئے دوسرے شہروں سے صوفیاء علماء اور شعراء یہاں آکر مقیم ہونے لگے اس طرح لاہور کو ایک اہم دینی اور علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

مسلمان مبلغوں میں سب سے پہلے شیخ اسمٰعیل بخاری 1005ء میں لاہور وارد ہوئے۔ وہ تفسیر و حدیث کے بلند مرتبہ عالم تھے۔ انہوں نے لاہور میں تفسیر کا درس شروع کیا۔ ان کی مجلسوں میں بے شمار غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ وہ اپنی آمد کے قریبا ترپن سال بعد لاہور میں فوت ہوئے۔

غزنوی دور کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان لاہور ہی میں پیدا ہوا اور اس نے یہیں زندگی بسر کی۔ حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش گیارہوں صدی عیسویں کے قریبا وسط میں لاہور تشریف لائے اور یہاں تبلیغ و ہدایت کا فیض جاری کیا۔ ان کی کتاب "کشف المحجوب" سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت لاہور کو لہانور کہتے تھے اور یہ ملتان کے گردونواح کا شہر سمجھا جاتا تھا۔

برصغیر کا پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک لاہور مقیم رہا اور یہیں دفن ہوا۔

1241ء میں لاہور پر منگول فوج نے حملہ کیا' شہر کا محاصرہ کیا اور لوٹ مار سے اسے بردبار کر دیا۔ جب بلبن بادشاہ بنا تو وہ خود لاہور آیا اور شہر کی فصیل اور قلعے کی مرمت کرائی اور ویران شہر کو نئے سرے سے آباد کرنے کا سروسامان کیا۔

لاہور کے کئی صوفیوں اور عالموں کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے انسان دوستی' خدمت خلق اور پرہیز گاری کی تعلیم دی' مثلاً محمد غوری کے عہد کے عالم اور واعظ سراج الدین ابن منہاج جو لشکر کے قاضی مقرر ہوئے تھے' اپنے مواعظ حسنہ اور تقریر کی فصاحت میں مشہور تھے۔

Marfat.com

○ باب 12

علما و مشائخ

(ULAMA AND MASHAIKH)

جس طرح مسلمان بادشاہوں کے دربار امراء' روسا' فوجی جرنیلوں اور عظیم فن کاروں کا ملجا و ماویٰ تھے اور وہ سلاطین کی سرپرستی میں ملک گیری' کشور آرائی اور ثقافت کی گراں قدر خدمات انجام دیتے تھے۔ اسی طرح علماء و مشائخ کے دربار عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ جہاں انھیں روحانی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ علماء و مشائخ چونکہ مبلغین تھے۔ انھیں کسی کی تکفیر و تفسیق سے واسطہ نہ تھا۔ وہ کسی کو برا نہ کہتے۔ سب اہل عالم کو بلا امتیاز مذہب و ملت "خدا کا کنبہ" سمجھتے۔ باہم اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے مشترک مالوفات کی تلاش میں رہتے اور سب کو عرفان الٰہی کی تعلیم دیتے۔ اس لئے ان کے دروازے ہرکس و ناکس پر کھلے رہتے تھے۔ ان کے درباروں میں برہمن اور اچھوت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ امن و آشتی اور مساوات انسانی کی تلقین کر کے اسلام کے اصول اساسی کو تقویت پہنچاتے۔ ان کی مقدس زندگیوں کے اثر سے عوام کو اسلام کی طرف کشش و رغبت ہوتی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں اسلام زیادہ تر علماء و مشائخ یعنی صوفیہ ہی کی مساعی سے پھیلا۔ ان بزرگوں کو ذاتی اغراض سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس لئے سلاطین و امراء بھی ان کی عزت و توقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے بلکہ ان کے لنگروں کے مصارف کے لئے اکثر روپیہ بھی دیتے رہتے۔ لیکن ان بزرگوں کی روز افزوں خیرات ان کے خزانوں کو ہمیشہ خالی ہی رکھتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے رسوخ سے عوام کی بعض شکایات کا تدارک کرا دیتے اور عوام کی ممنونیت بھی تبلیغ کے کام میں معاون ہو جاتی۔ بعض صوفیہ نے ادب و شعر اور موسیقی کی بھی اعانت و سرپرستی کر کے ثقافت کی گراں قدر خدمت انجام دی۔

ہندوستان کے مختلف گوشوں میں دس گیارہ صدیوں تک ہزار ہا صوفیہ اور مبلغین نے کام کیا ہو گا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کا فکری جمود ٹوٹ گیا۔ جاہلانہ ضعیف الاعتقادی' اوہام پرستی' ذات پات کے امتیاز' چھوت چھات اور شرک و انکار کی گھٹائیں جو صدیوں سے اس بدنصیب ملک پر چھائی ہوئی تھیں چھٹ گئیں اور شرف انسانیت کا آفتاب طلوع ہوا۔ عقیدہ توحید اور مساوات انسانی کی مقبولیت عامہ کے باعث ہندوؤں کے مذاہب کی بنیادیں ہل گئیں اور ان میں نئے نئے روشن خیال مذہبی مفکرین پیدا ہوئے۔ جن کی مساعی سے پرانے ہندو دھرم کا قلع قمع ہو گیا۔

ان سب بزرگوں کے حالات کی فراہمی تو ممکنات میں سے نہیں۔ البتہ چند اکابر کا مختصر

Marfat.com

تذکرہ سطور ذیل میں کیا جائے گا۔ جو اپنے زہد و تقویٰ' اپنے اعمال صالحہ اور اپنے تبلیغی کارناموں کے اعتبار سے بے حد ممتاز ہیں اور جن کی درگاہیں آج تک ہر مذہب و ملت کے افراد کے لئے مرجع عام بنی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں پہلے مبلغ اسلام حضرت شیخ اسماعیل بخاری ثم لاہوری ہیں۔ جو 1005ء میں یہاں وارد ہوئے۔ وہ عالم دین بھی تھے اور صوفی صافی بھی۔ چنانچہ ان کے وعظ و ارشاد سے ہزار ہا ہندو مشرف باسلام ہوئے۔

داتا گنج بخش :

حضرت شیخ علی ہجویری غزنی کے ایک محلے ہجویر کے رہنے والے تھے۔ 1009ء میں پیدا ہوئے اور 1072ء میں انتقال کیا۔ علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد بہت سے ملکوں کی سیاحت کی اور سلطان مسعود غزنوی کے عہد حکومت میں لاہور پہنچے۔ یہاں ان کا مشغلہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف رہا۔ زہدو تقوے اور پاک نفسی میں مثال نہ رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کی کشش سے جو لوگ مشرف باسلام ہوئے۔ ان میں لاہور کا راجا رائے راجو بھی شامل تھا جس کو آپ نے "شیخ ہندی" کے نام سے موسوم کیا۔ حضرت شیخ علی ہجویری عوام میں "داتا گنج بخش" کے نام سے مشہور ہیں۔ یوں تو آپ نے طریقت اور تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں۔ مثلاً" البیان اہل العیان۔ منہاج الدین۔ کشف الاسرا۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت کشف المحجوب کو حاصل ہوئی۔ جس میں تصوف کے مقامات و منازل' اذکار و اشغال اور صفائے باطن کی تدابیر کا تزکرہ کیا گیا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے داتا صاحب کے مزار پر اعتکاف بھی کیا تھا۔ چنانچہ ان کی شان میں خواجہ اجمیری کا یہ شعر زبان زد عام ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

خواجہ معین الدین اجمیری :

تلقین اخلاق و تصوف اور تبلیغ اسلام میں خواجہ معین الدین اجمیری کا نام غالباً ہندوستان بھر کے اولیا میں زیادہ مشہور ہے۔ آپ 1142ء میں سیستان کے ایک قصبے سنجر میں پیدا ہوئے۔ عراق میں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ قصبہ ہارون (علاقہ نیشاپور) میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے مرید ہوئے۔ سالہا سال کی ریاضتوں کے بعد خرقہ خلافت حاصل کی۔ ممالک اسلامی کی سیاحت کے دوران میں حضرت غوث اعظم' شیخ شہاب الدین سہروردی' خواجہ اوحدالدین کرمانی شیخ نجم الدین کبریٰ اور دوسرے بے شمار اولیا سے مجالست کا اتفاق ہوا۔ ہندوستان آکر داتا گنج بخش کے مزار پر دو مہینے چلہ کشی کی۔ 1192ء میں اجمیر پہنچے جو راجپوتانہ میں اس زمانے کے ہندوؤں کی فوجی طاقت کا مرکز تھا۔ آپ کی تعلیمات و کرامات کی شہرت نزدیک و دور پھیل گئی۔ اجمیر کے راجا گرو جے پال جوگی آپ کے دست حق پرست پر مشرف باسلام ہوا۔ اس کے علاوہ ہزاروں ہندو

Marfat.com

آپ کے اثر سے مسلمان ہو گئے۔ حضرت خواجہ اجمیری سلسلہ چشتیہ کے بانی اور بہت بڑے ولی تھے۔ آپ کا مزار اجمیر میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ 1236ء کو سلطان التمش کا زمانہ تھا۔ آپ کا وصال ہو گیا۔

شیخ بہاء الدین زکریا :

شیخ بہاء الدین زکریا 1182ء میں بمقام ملتان پیدا ہوئے۔ بخارا' شام اور عراق میں تحصیل علوم کی۔ شیخ شہاب سہروردی کی خدمت میں بمقام بغداد باریاب ہوئے۔ چونکہ تقوے اور صلاحیت باطنی سے پہلے ہی ممتاز تھے۔ اس لئے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ شیخ سہروردی نے ان کو خرقہ خلافت عطا کیا اور ہدایت و ارشاد کے لئے ملتان جانے کا حکم دیا۔ شاہ ناصر الدین قباچہ والی ملتان کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ ہندوستان میں سلسلہ سہروردیہ کے پہلے بزرگ تھے۔ چشتیہ اور سہروردیہ دونوں سلسلوں میں سماع و سرو کا رواج ہے۔ چشتیہ میں زیادہ سہروردیہ میں کم لیکن شیخ بہاء الدین زکریا سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ فارسی کے نامور صوفی شاعر عراقی کے کلام سے آپ کو بہت شغف تھا۔ یہ عراقی شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے اور شیخ زکریا کے داماد تھے۔

1266ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ ملتان میں آپ کا مزار مرجع عام ہے۔

حضرت شیخ کے جانشین :

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے بعد شیخ صدرالدین عارف ان کے خلیفہ ہوئے ان کے بعد شیخ رکن الدینؒ نے سجادہ طریقت کو زینت بخشی۔ یہ بہت عالم اور بہت بڑے صوفی تھے۔ آپ حضرت نظام الدین اولیا کے معاصر ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی آپ کا بے حد معتقد تھا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے ایک اور نامور خلیفہ سید جلال الدین منیر شاہ نے جھنگ آباد کیا اور مدتوں ان علاقوں میں تبلیغ اسلام کا فرض انجام دیتے رہے۔ آپ کا مزار اوچ شریف (بہاولپور) میں ہے۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت میر سید جلال الدین حضرت شیخ رکن الدین کے خلیفہ تھے۔ آپ نے ہندوستان کے مختلف حصوں خصوصاً گجرات میں اشاعت اسلام کا کام کیا۔ ان کے پوتے اور پڑپوتے قطب عالم اور شاہ عالم جن کے مزار احمد آباد گجرات میں ہیں۔ مدتوں شاہان گجرات کی عقیدت کا مرکز رہے۔

اوچ میں سید محمد غوث گیلانی :

حضرت سید محمد غوث گیلانی مغربی پنجاب میں سلسلہ قادریہ کے پہلے بزرگ ہیں۔ آپ حلب میں پیدا ہوئے۔ ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ ہو کر ہندوستان آئے اوچ' ملتان اور لاہور

Marfat.com

میں مدت دراز تک ارشاد و ہدایت کا فرض انجام دیتے رہے۔ سلطان سکندر لودھی آپ کا مرید تھا۔ اوچ اب تک سلسلہ قادریہ کا اہم مرکز سمجھا جاتا ہے۔ حضرت سید محمد غوث گیلانی 1517ء میں واصل بحق ہوئے۔ اوچ میں آپ کا مزار ہے۔

خواجہ بختیار کاکی :

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی عراق کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے۔ حصول علوم کے بعد بغداد میں ان کی ملاقات خواجہ معین الدین اجمیری سے ہوئی۔ وہیں حضرت خواجہ صاحب سے خرقہ خلافت پایا۔ جب خواجہ صاحب ہندوستان میں وارد ہوئے تو خواجہ بختیار کاکی نے بھی بغداد سے ہندوستان کا رخ کیا۔ ملتان میں شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ بہاء الدین زکریا کے مہمان رہے۔ اس کے بعد خواجہ اجمیریؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ تو حکم ہوا کہ جب قرب روحانی میسر ہے تو قرب جسمانی کی کیا ضرورت ہے۔ تم دہلی ہیں رہ کر کام کرو۔ چنانچہ حضرت بختیار کاکی مدت العمر دہلی ہی میں رہے وہیں 1236ء میں انتقال ہوا۔ خواجہ صاحب سماع کے بہت شوقین تھے اور اپنے رفیق قاضی حمید الدین سے مل کر اکثر مجلس سماع برپا کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ چشتیا میں سماع داخل عبادت ہو گیا حالانکہ خواجہ عثمان ہارونی سماع کے مخالف تھے۔ اور حضرت خواجہ اجمیری بھی اس کے قائل نہ تھے۔

بابا فرید شکر گنج :

حضرت خواجہ بختیار کاکی کے بعد خواجہ فرید الدین شکر گنج ان کے جانشین ہوئے جو عوام میں بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ملتان کے پاس ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں حصول تعلیم کے بعد ممالک اسلامی کی سیاحت کی جس کے دوران میں شیخ شہاب الدین سہروردی' شیخ فریدالدین عطاء اور بعض دوسرے صوفیہ کرام سے مجالست کا اتفاق ہوا۔ خواجہ بختیا کاکی کے انتقال کے بعد خرقہ خلافت ملا تو اجودھن میں مقیم ہو گئے۔ جسے آج کل پاک پتن کہتے ہیں۔ آپ مدت العمر یہیں ہدایت و ارشاد اور ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔ بے حد پاک نفس اور مقدس بزرگ تھے۔ اخلاق کے علاوہ آپ سے اکثر کرامات بھی سرزرد ہوئیں۔ سلطان بلبن آپ کا اتنا معتقد ہوا کہ اس نے اپنی بیٹی کا نکاح آپ سے کر دیا۔ آپ کے سب سے بڑے خلیفہ حضرت قطب الدین ہانسوی تھے۔ جن پر آپ کو بے حد اعتماد تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے جب اپنے بھانجے مخدوم علاء الدین صابر کو ولایت دہلی کی سند عطا کی تو حضرت ہانسوی نے وہ سند پھاڑ ڈالی۔ حضرت مخدوم نے حضرت بابا فرید سے شکایت کی تو ارشاد ہوا کہ جمال کا پھاڑا ہوا فرید نہیں سی سکتا۔ تم اب دہلی نہیں جا سکتے۔ کلیر کا علاقہ تمہیں دیا جاتا ہے۔

مخدوم علاء الدین صابر :

حضرت مخدوم علاء الدین صابر حضرت بابا فرید کے بھانجے تھے۔ 1195ء میں پیدا ہوئے۔

Marfat.com

حضرت بابا صاحب ہی ان کو علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کیا۔ آپ زیادہ تر عالم استغراق میں رہے۔ کتابوں میں آپ کی بہت سی کرامتیں درج ہیں۔ لیکن ہدایت و ارشاد کا کوئی ذکر نہیں۔ 1291ء میں انتقال ہوا۔ مزار رڑکی ضلع سہارن پور کے پاس کلیر میں واقع ہے۔ آپ سلسلہ صابریہ کے بانی ہیں۔ آپ کے مزار پر ہر سال بڑے زور شور سے عرس ہوتا ہے جس کی خصوصیت رقص و سرود ہے۔ گو سماع اور حال و قال کی محفلیں بھی برپا کی جاتی ہیں۔

نظام الدین اولیا :

حضرت بابا فریدؒ کے خلیفہ اعظم حضرت نظام الدین اولیا تھے جو سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کے القاب سے ملقب ہیں۔ آپ کا اصلی اسم گرامی سید محمد ہے۔ 1238ء میں بمقام بدایوں آپ کی ولادت ہوئی۔ بدایوں اور دہلی میں تکمیل علوم کے بعد پاک پتن میں حضرت بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عبادت و ریاضت اور صفائے باطن کا یہ حال تھا کہ بیس برس کی عمر میں دہلی کی نیابت پر فائز کر دیئے گئے۔ جب آپ حضرت بابا صاحب کے مقبول و منظور بزرگ شیخ جمال ہانسوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کہ سند نیابت پر ان کی تصدیق حاصل کریں تو حضرت ہانسوی نے سند پر یہ شعر لکھ دیا۔

ہزاروں درودو ہزاروں سپاس　　　که گوہر سپردم بہ گوہر شناس

اس کے بعد حضرت سلطان المشائخ دہلی سے تین میل دور ایک گاؤں میں مقیم ہو گئے۔ حضرت کا لنگر وسیع تھا۔ جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ نذر و نیاز کا روپیہ بے شمار آتا تھا اور اسی وقت خیرات کر دیا جاتا تھا۔ رجوع کی کیفیت یہ تھی کہ آپ کے مریدوں کی تعداد کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ شہر کے عمائد و معززین بھی آپ کے مرید تھے اور بادشاہ بھی آپ کا بے حد لحاظ و احترام کرتے تھے۔

حضرت سلطان المشائخ نے تین شاہی خاندانوں کا زمانہ پایا۔ خاندان غلاماں کے عہد میں آپ کے ابتدائی ایام بسر ہوئے۔ پھر خلجیوں کا دور گزرا جن کے بعد غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا۔ جس کے انتقال اور حضرت ممدوح کے وصال میں صرف دو چار ہفتوں کا فصل تھا۔ بعض سیاسی وجوہ سے غیاث الدین تغلق اور حضرت سلطان المشائخ کے درمیان اختلاف ہوا۔ اس کا ایک شاخسانہ یہ نکلا کہ غیاث الدین کے نزدیک سماع خلافت شریعت تھا اور حضرت سلطان المشائخ اس کے حامی تھے۔ سلطان نے اس مسئلے پر بحث کے لئے دہلی کے علما و مشائخ جمع کیا۔ اور مجلس نے فیصلہ کیا کہ سماع شرعا حرام نہیں۔ اس مجلس میں سلطان المشائخ بھی شریک تھے۔

اس کے بعد سلطان غیاث الدین بنگالہ کی مہم پر گیا تو اس کے بڑے بیٹے الغ خاں نے سلطان المشائخ کی مریدی اختیار کی اور فوج فراہم کر کے باپ کے تخت پر قبضہ کرنے کی زور شور سے تیاری کرنے لگا۔ سلطان غیاث الدین کو طبعا شبہ ہوا کہ سلطان المشائخ اس بغاوت کی پشت پر

Marfat.com

ہیں۔ چنانچہ اس نے حضرت کو لکھا کہ میرے واپس دہلی پہنچنے سے پہلے آپ دہلی سے باہر نکل جائیں۔ حضرت نے اس پر کہا۔ کہ "ہنوز دہلی دوراست"۔ سلطان کی مراجعت پر الغ خاں نے ایک نئے محل میں باپ کا استقبال کیا۔ یہ محل گر پڑا اور سلطان غیاث الدین اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ یہ 1325ء کے موسم بہار کا واقعہ ہے۔ چند روز بعد سلطان المشائخ کا بھی انتقال ہو گیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق سب مورخین کے نزدیک لائق، انصاف پسند اور دیندار تھا۔ ایسے بادشاہ اور سلطان المشائخ جیسے بزرگ کے درمیان اختلافات نے نہایت افسوسناک صورت اختیار کر لی۔ بلکہ بعض مورخین تو بے تکلف بادشاہ کی ہلاکت میں سلطان المشائخ کے اشارے کا دخل بھی بتاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت سلطان المشائخ کی نماز جنازہ حضرت رکن الدین ملتانی نے پڑھائی اور آپ وہیں دفن ہوئے۔ جہاں نظام الدین کے نام سے ایک گاؤں آباد ہے۔ آپ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ فقرا اولیا میں یہ امتیاز حضرت سلطان المشائخ ہی کو حاصل ہے۔ کہ آپ اس عہد کی سیاست میں بھی دخیل رہے۔ بعض بادشاہوں کو آپ سے عقیدت اور بعض کو اختلاف رہا۔ علاوہ بریں آپ کا سلسلہ ارشاد ہندوستان کے مختلف گوشوں کے علاوہ عرب اور چین تک پھیلا ہو تھا۔ آپ نے اپنے سینکڑوں خلفاء مبلغین گجرات، دکن، پنجاب، چین، افغانستان وغیرہ میں بھیجے۔ جنھوں نے تبلیغ و اشاعت اسلام کی شاندار اور پائدار خدمات انجام دیں۔ امیر خسرو اور مشہور مورخ ضیاالدین برنی دونوں آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ امیر خسرو نے تو حضرت کی ترغیب و قدردانی کے ماتحت موسیقی میں مجتہد کا درجہ حاصل کیا۔ آپ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بانی قرار پائے جو صابریہ کی طرح سلسلہ چشتیہ کی ایک شاخ ہے جس کے وابستگان طریقت کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

بو علی قلندر :

حضرت بو علی قلندر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ قطب جمال ہانسویؒ کے خالہ زاد اور حضرت سلطان المشائخ کے ہم عصر تھے۔ علوم دین کی تحصیل کے بعد آپ نے تدریس و تعلیم کا مشغلہ اختیار کیا اور مسجد قوت الاسلام دہلی میں وعظ کہتے رہے۔ اسی حالت میں کسی فقیر کے جذب و اثر سے درس تدریس کو ترک کر کے قلندر بن گئے اور جنگلوں میں گھومنے پھرنے لگے۔ آپ کی عمر زیادہ تر جذب و استغراق میں بسر ہوئی۔ 1334ء میں انتقال ہوا۔ مزار پانی پت میں ہے۔

نصیر الدین چراغ دہلی :

حضرت نصیر الدین چراغ حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ اور جانشین ہوئے ہیں۔ نصیر

Marfat.com

الدین محمود نام اور چراغ دہلی لقب ہے۔ سنت کے بڑے متبع۔ پرہیز گار اور صاحب اثرولی تھے۔ اپنے پیر کے مسلک کے خلاف سماع کو ناجائز اور خلاف سنت سمجھتے تھے۔ اپنے خلفاء کو بھی یہی تلقین کرتے تھے کہ علوم دین کی اشاعت اور شریعت اسلامی کی ترویج میں مصروف رہو۔ اپنے بھانجے اور خلیفہ اعظم خواجہ کمال الدینؒ کو احمد آباد میں ہدایت کے لئے بھیجا۔ جہاں ان کے اولاد احفاد نے سلسلہ تبلیغ جاری رکھا۔ چنانچہ خواجہ کمال الدین کے صاحبزادے شیخ سراج الدین کا مزار گجرات کے پرانے پایہ تخت پٹن میں موجود ہے۔ حضرت چراغ دہلی نے مولانا خواجگی اور شیخ احمد تھا -نسری کو کالپی میں خلیفہ بنا کر بھیجا۔ وہیں ان دونوں بزرگوں کے مزار ہیں۔ دکن میں آپ کے نامور خلیفہ حضرت سید گیسو درازؒ ہیں۔ جن کا مزار گلبرگہ میں آج تک زیارت گاہ عوام ہے۔ آپ نے حدیث' کلام' تصوف اور تفسیریں ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ پونا اور بلگام کے بے شمار لوگ آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ محمد تخلص کرتے تھے۔

ملیبار :

جنوبی ہندوستان خصوصاً ملیبار میں تبلیغ اسلام کا چرچا اسی زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ جب پہلی صدی ہجری میں عرب تاجروں نے یہاں اپنے مرکز قائم کر لئے تھے۔ پھر ماپلا لوگوں کی آبادی بڑھنی شروع ہوئی۔ کچھ مسلمان عراق سے آکر ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ماپلاؤں نے ہندوستان کے علاوہ ملایا' جاوا' سماٹرا اور دوسرے جزائر میں بھی اسلام پھیلایا۔ چنانچہ ان علاقوں کی آبادی میں عظیم اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

قرامطہ :

جنوبی ہند کے بعد مساعی تبلیغ کے مرکز ملتان اور اوچ قرار پائے۔ عربوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی اور ان کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ لیکن منظم تبلیغی کوشش حسن بن صباح کے پیروؤں نے شروع کی' جو نویں صدی عیسوی میں ہندوستان آنے لگے اور سندھ اور مغربی پنجاب میں پھیل گئے۔ اگرچہ یہ لوگ جن کو قرامطہ کہتے ہیں۔ قائم شدہ اسلامی سلطنتوں کے خلاف مجرمانہ سازشوں میں مصروف تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے یہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے بڑے مخالف تھے۔ چنانچہ دونوں نے ان کی بیخ کنی کے لئے لشکر آرائی کی۔ محمد غوری کا قاتل بھی قرملی ہی تھا۔ سب سے پہلے حسن بن صباح کے داعیوں نے اوچ کو اپنا مرکز قرار دیا تھا۔ لیکن بہت جلد بعض سنی بزرگان و مشائخ نے ان کو باہر کیا اور یہ لوگ کچھ اور گجرات کی طرف نکل گئے۔ گجرات اور بمبئی کے علاقوں میں جو لاکھوں انسانوں کی جماعتیں خوجہ اور بوہرہ کہلاتی ہیں۔ ان میں بے شمار انہی قرملیوں یا اسماعیلیوں کی اولاد ہیں جو سندھ اور پنجاب سے ان علاقوں میں منتقل ہو گئے اور باقی ہندوؤں سے مسلمان ہوئے بوہروں کی تعداد کوئی دو لاکھ ہے۔ ان کے مبلغ اول

Marfat.com

محمد علی تھے۔ جن کا مزار کھمبایت میں ہے ان کی وفات 1137ء میں ہوئی تھی۔

بوہرے :

آج کل بوہروں میں داؤدی بوہروں کی کثرت ہے۔ ان کے موجودہ امام یاداعی مطلق ملا طاہر سیف الدین ہیں۔ جو سورت میں رہتے تھے آپ علوم عربیہ کے فاضل تھے۔ بوہروں کے اوقاف کی آمدنی انہی کے ہاتھوں خیرات و صدقات اور تعمیر جماعت کے کاموں میں صرف ہوتی تھی۔ بوہروں کی مسجدیں اور قبرستان الگ ہیں۔ عیدین کو بھی مسلمانوں سے علیحدہ طریق پر مناتے ہیں۔ نمازیں پانچ کے بجائے تین پڑھتے ہیں۔ بہت سے معاملات میں ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ وراثت کے معاملے میں شروع کے پابند نہیں۔ سود لیتے اور دیتے ہیں۔ دیوالی کے موقع پر ہندوؤں کی طرح اپنی حساب کی کتابیں بدلتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ بعض معاملات میں عام مسلمانوں سے زیادہ پابند شرع نظر آتے ہیں۔ ان میں اکثر داڑھی رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے۔ نہ ہندو دھوبیوں سے کپڑے دھلاتے ہیں اگر دھلاتے ہیں تو انھیں پاک کر لیتے ہیں۔

خوجے :

دوسری اسماعیلی جماعت خوجہ کہلاتی ہے۔ یہ لوگ پنجاب' سندھ' کاٹھیاواڑ اور کچھ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے اولین داعی اور مبلغ نور ساگر' پیر شمس الدین اور شیخ صدر الدین تھے۔ خوجوں میں سے بعض شمالی پنجاب اور چترال میں آباد ہیں اور باقی آغاخانی ہیں۔ زمانہ حال کے پابند ہیں۔ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ ان میں ایرانی النسل خاندان زیادہ ہیں۔ خود ان کے حاضر امام آغا خان ہیں۔ جن کا خاندان ایران سے آیا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح اور سر ابراہیم رحمت اللہ بھی اسی خوجہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ آغا خاں کی وسیع المشربی اور روشن خیالی نے اس جماعت کو ملت اسلامی کی طرف زیادہ متوجہ کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مسلمانوں کی قومی تحریکات میں حصہ لیتے ہیں۔ گجرات اور کچھ کے علاقوں میں اسماعیلی فرقوں کی تبلیغی کوششیں بہت قدیم سے جاری ہیں لیکن سنی مبلغین بھی غافل نہیں رہے۔ چنانچہ بہت سے اولیا و مشائخ کے مزار جا بجا موجود ہیں۔ انہی کی مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ گجرات میں مسلمانوں کی تعداد خاصی ہے اور ان میں اکثریت سینوں کی ہے۔

بنگال میں جلال الدین تبریزی :

بنگال میں سب سے پہلے جو بزرگ تبلیغ اسلام کی غرض سے پہنچے وہ شیخ جلال الدین تبریزی ہیں۔ آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور حضرت بہاء الدین زکریا (ملتان) کے خواجہ تاش تھے۔ شیخ جلال الدین اپنے پیر بھائی سے ملنے کے لئے ملتان آئے۔ کچھ مدت یہاں رہنے کے بعد

Marfat.com

دہلی پہنچے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ پھر بدایوں ہوتے ہوئے بنگال میں پہنچ گئے۔ یہاں آپ نے تبلیغ و اشاعت کا کام نہایت کامیابی سے انجام دیا اور بے شمار ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ آپ کا انتقال 1225ء میں ہوا۔ سلہٹ میں مزار ہے۔ سلطان المشائخ نے شیخ سراج الدین بدایونی کو خلیفہ بنا کر بنگال بھیجا۔ ان کے مرید شیخ علاء الدین علاء الحق' پھر ان کے خلیفہ میر اشرف جہانگیری اور ان بزرگوں کے صدہا مریدوں نے بنگال میں اسلام پھیلایا۔ ڈاکٹر ہنٹراور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ بنگال میں شہروں کے بجائے دیہات میں اسلام کو بڑی کامیابی ہوئی کیونکہ غریب ماہی گیروں' شکاریوں اور ادنی کاشت کاروں کے لئے اسلام کی روحانیت اور مساوات بہت بڑی رحمت تھی۔ وہ اسلام میں داخل ہوتے ہی چھوت چھات اور ذات پات کی ذلت و خواری سے نجات پا گئے اور اخوت اسلامی کی برکتوں سے بہرہ ور ہونے لگے۔

دکن میں سید گیسو دراز :

دکن میں اگرچہ 1304ء میں ایک عرب مبلغ کے ورود کا سراغ ملتا ہے۔ جس نے پیر مہابیر کندایت کا نام اختیار کر کے تبلیغ اسلام شروع کی تھی۔ لیکن حقیقت میں سب سے زیادہ نامور اور کامیاب مبلغ سید گیسو دراز ہی تھے جو 1320ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ مغربی ساحل کے علاقہ کوکن میں شیخ بابا عجیب' سید ہاشم گجراتی' شاہ محمد صادق' سرمست حسینی اور متعدد دیگر مبلغین اسلام نے کام کیا۔ جن کے مزار اب تک قصبہ دھانو' ناسک دھاروار میں موجود ہیں۔ بلگام' ستارا' احمد نگر کے اضلاع میں بھی بعض بزرگ دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔

جنوبی ہند دکن اور ساحلی علاقوں میں اسلام کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی لیکن افسوس ہے کہ سلاطین نے اس زرخیز زمین کی طرف توجہ نہ کی۔ جس کی تخم ریزی تو قدسی نفس بزرگوں نے کر دی تھی۔ لیکن اس کے بعد آبیاری کی ضرورت تھی۔ ان علاقوں میں کروڑوں اچھوت آباد تھے جو قبول اسلام کے بعد صدیوں کی ذلت سے نجات پا جاتے تھے اور تہذیب و تمدن کے راستے پر بے تکلف گامزن ہو کر ترقی کی منزلیں طے کرتے تھے۔ کیونکہ اسلام ان کی ذات پات کے بندھنوں سے نجات دلا کر بڑے سے بڑے مسلمان کا بھائی بنا دیتا تھا اور انھیں مساوی موقع عطا کرتا تھا۔ وہ مسلمان ہو کر شرک' بدعت' اوہام' جہالت' افلاس' غلاظت اور افسردہ طبعی سے آزادی حاصل کر لیتے اور حکمرانوں کے ہم مذہب بن کر عزت آبرو کی زندگی بسر کرتے۔

شاہ مرزاؒ : عرف سلطان شمس الدین شاہ

"سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا 1315ء میں کشمیر کے راجا سنگھ دیو کے ہاں ملازم ہوئے۔ جب سنگھ دیو کو ایک تبتی نے شکست دی اور خود راجا بن بیٹھا تو اس نے شاہ مرزا کے ہاتھ اسلام قبول کر لیا۔ جب وہ مرا تو ملک میں پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ شاہ مرزا خود شمس الدین شاہ کے نام سے تخت نشین ہوئے۔ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ نئے بادشاہ نے اپنے

Marfat.com

اختیارات سمجھ بوجھ اور نیک نیتی سے استعمال کئے۔ کشمیر کے ہندو راجا بڑے ظالم تھے۔ ان کی علانیہ پالیسی یہ تھی کہ رعیت کے پاس معمولی دال روٹی سے زیادہ کچھ نہ رہنے دیا جائے۔ نئے (مسلمان) بادشاہ کی حکومت لبرل اصولوں پر تھی۔ اس نے بے جا سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹا دیئے اور وصول کرنے کے ظالمانہ طریقے موقوف کر دیئے اور سرکاری لگان پیداوار کے چھٹے حصے پر مقرر کیا۔

امیر کبیر ہمدانی :

1314ء میں بمقام ہمدان حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی ولادت ہوئی۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے کشمیر کو وہ کشمیر بنایا جس پر آج دنیا فریفتہ ہے۔ آپ ممالک اسلامی کی سیاحت میں صدہا اولیاء اللہ سے ملاقات کرنے کے بعد 1379ء میں کشمیر میں تشریف لائے۔ اس وقت سات سو سادات ایرانی کاملہ رکھتے تھے۔ آپ نے کشمیریوں میں تبلیغ اسلام اصلاح اخلاق اور تصفیہ باطن کا کام شروع کر دیا۔ آپ کے ہمراہی سیدوں نے ملک کے گوشے گوشے ہیں جا کر تبلیغی مرکز قائم کر لئے۔ اس کے علاوہ کشمیریوں کو قالین بانی گبہ بانی' پیپر ماشی' سنگ تراشی اور ریشم بانی وغیرہ بے شمار فنون سکھائے۔ غرض اس دور دست پہاڑی علاقے کے مسکین اور نادار باشندوں میں نئی زندگی کی روح پھونک دی۔ 1384ء میں حضرت امیر کبیر ہمدانی واصل بحق ہوئے۔

سلطان سکندر لودھی کا وزیر سنہا بھاٹ مشرف باسلام ہوا تو اس نے کشمیریوں میں اسلام کی تبلیغ بھی شروع کی اور انہیں بعض رسوم قبیحہ سے بھی حکماً منع کیا۔ اس کے بعد سلطان زین العابدین شاہ جس کو کشمیری "بڈشاہ" کہتے ہیں۔ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کے دور میں ہندوؤں سے انتہائی رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔ اور کشمیر میں اسلام کو بے حد تقویت پہنچی۔ اس کا نظم و نسق بڑی حد تک اکبر کے انداز حکومت سے مشابہ تھا۔ لیکن مذہبی اعتبار سے زین العابدین شاہ اکبر سے بالکل مختلف اور نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری :

تصوف کے تین سلسلوں یعنی چشتی' قادری اور سہروردی کے بزرگوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ہمایوں کے زمانے میں یہاں طریقہ شطاریہ بھی رائج ہوا۔ جو حضرت بایزید بسطامی سے منسوب بتایا جاتا ہے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری اسی طریقے سے تعلق رکھتے تھے چلہ کشی' دعوت اسماء اور عملیات میں مہارت رکھتے تھے۔ "جواہر خمسہ" ان کی مشہور کتاب ہے جو انہی عملیات پر مشتمل ہے۔ ہمایوں اور ایک زمانے میں اکبر کو بھی ان سے بہت ارادت تھی۔ علمائے دین مثلاً" شیخ علی متقی اور شیخ گدائی ان کے مخالف تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک شیخ محمد غوث کے بعض خیالات و عقائد خلاف شریعت تھے۔ آپ اسی برس کی عمر پا کر 1562ء میں واصل بحق ہوئے۔ مزار گوالیار میں ہے۔

Marfat.com

شیخ عبدالقدوس گنگوہی :

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اس زمانے کے اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ متعدد سلاسل تصوف سے نسبت رکھتے تھے۔ اپنی پاکیزہ درویشانہ زندگی سے اور اپنے ارشادات سے مدتوں ہدایت عامہ کا فرض ادا کرتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے والد شیخ عبد الاحد اور ہمایوں بادشاہ شیخ عبدالقدوس کے خلفا میں شامل تھے۔ 1536ء میں انتقال کیا۔ مزار گنگوہی میں مرجع خاص و عام ہے۔

انیسویں صدی عیسوی بھی بے شمار جلیل القدر صوفیہ پیدا ہوئے۔ جنھوں نے عوام کی زندگیوں پر بہت گہرا اور مبارک اثر ڈالا۔ لیکن تین حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی۔ حضرت شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی اور حضرت شاہ غوث علی قلندر۔

خواجہ سلیمان تونسوی :

خواجہ محمد سلیمان تونسوی 1770ء میں پیدا ہوئے تحصیل علم کے بعد خواجہ نور محمد مہاروی کے مرید ہوئے۔ پھر دہلی' اجمیر اور جے پور میں علوم ظاہری اور فیوض باطنی کا سرمایہ فراہم کرتے رہے۔ خواجہ نور محمد نے آپ کو اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ نہایت زاہد و متقی بزرگ تھے۔ ماسویٰ اللہ سے بے نیاز اور منقطع رہتے تھے۔ نواب محمد بہاول خان والی بہاول پور کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔ وفات 1841ء میں ہوئی نواب بہاول پور نے ستر ہزار روپے کی لاگت سے آپ کا روضہ تعمیر کیا جو تونسہ شریف میں مرجع عوام ہے۔

شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی :

شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی ضلع ہردوئی کے ایک قصبہ ملانواں میں 1798ء میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد آپ نے دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق سے علوم دین کی تحصیل کی۔ پھر سلسلہ نقشبندیہ میں شاہل محمد آزق کے مرید ہوئے۔ سند خلافت پانے کے بعد گنج مراد آباد میں مقیم ہو گئے یہ غالباً حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی شریعت پروری کا اثر تھا۔ کہ اس زمانے کے جلیل القدر صوفی بزرگ بھی رد بدعت اور ترویج سنت میں سرگرم تھے ان سے کوئی خلاف شریعت حرکت سر زرد نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت شاہ فضل الرحمن بھی کرامات و مکاشفات باطنی کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تفسیر و حدیث کا درس دیتے۔ طرز زندگی کی سادگی' فقر و استغنا اور حسن اخلاق میں سنت نبوی کے پابند تھے۔ محتاجوں کی امداد اپنی استطاعت سے بھی بڑھ کر کرتے۔ 1895ء میں انتقال ہوا۔ گنج مراد آباد میں مزار ہے۔

شاہ غوث علی قلندر :

Marfat.com

حضرت شاہ غوث علی قلندر مونگھیر (بہار) کے پاس ایک گاؤں میں 7 دسمبر 1804ء کو پیدا ہوئے۔ والدہ بعض عوارض دماغی میں مبتلا تھیں۔ اس لئے آپ کو ایک برہمنی کا دودھ پلایا گیا۔ جب چار برس چار ماہ کے ہوئے تو ایک طرف اصلی والدہ نے بسم اللہ پڑھ کر قرآن مجید شروع کرایا اور دوسری طرف اس برہمنی (مادر رضاعی) کے شوہر نے شاستر پڑھانا شروع کیا۔ اس کے بعد علوم عربی فارسی اور سنسکرت کی تعلیم متوازی جاری رہی۔ آخر میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق صاحب سے حدیث اور مولانا فضل امام خیر آبادی سے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ باطنی فیوض بھی گیارہ مسلمانوں بزرگوں اور آٹھ ہندو درویشوں سے حاصل کئے۔ حج اور سیاحت کے بعد 1862ء میں پانی پت تشریف لے آئے۔ 1880ء کو یہیں انتقال ہوا۔ آپ کے خلیفہ مولانا گل حسن نے آپ کے حالات کے متعلق ایک نہایت دل چسپ کتاب "تذکرہ غوثیہ" کے نام سے لکھی۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اور قلندری کے ساتھ ساتھ آپ ترویج سنت میں بھی سرگرم تھے اور تصور شیخ، سجدہ قبور، تشیع اور بدعات عامہ کو خلاف شریعت بتاتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ملک میں حضرات صوفیہ کرام نے روحیت اسلام کی ترویج اور احکام اسلام کی تبلیغ بہت وسیع پیمانے پر انجام دی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو اخلاق نبوی کی تعلیم دی۔ اپنی پاکیزہ زندگیوں کا نمونہ پیش کر کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو صراط مستقیم پر گامزن ہو۔ کی توفیق بخشی جھگڑوں اور مناقشوں سے الگ رہے اور اپنے معتقدین کو بھی محبت رواداری رحم و کرم اور اخلاق حسنہ کی تلقین فرماتے رہے۔

Marfat.com

باب 13

مغلوں سے پہلے تمدنی ارتقاء
(CULTURAL DEVELOPMENT)

برصغیر کی مسلم حکومتوں میں حکمران کی ذات کو سیاست، معاشرت، جنگ، دفاع اور دوسری ملکی سرگرمیوں کے اعتبار سے مرکزی نقطے کی حیثیت حاصل تھی۔ ملک کی خوش حالی یا بدحالی کا تمام تر انحصار حکمران ہی کی صفات پر تھا۔ تہذیب و تمدن کی ترویج و ترقی کا بھی یہی حال تھا۔ اس باب میں ہم مغلوں سے عہد سے قبل کے عہد میں تہذیب و تمدن کے نشوو ارتقاء کے بارے میں گفت گو کریں گے۔

معیشت :

مغلوں سے پہلے کے دور میں معیشت کا دارومدار تجارت، ہنر مندی اور زراعت پر تھا۔ برصغیر کے زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ تھے۔ ہنر مند سلاطین کے ساتھ آئے تھے اور تجارت عربوں نے ہندوستان کے ساتھ پہلے ہی شروع کر رکھی تھی۔ معاشی زندگی یکسانی کا شکار تھی۔ لوگ عموماً اپنی قسمت پر شاکر رہتے تھے، قحط، آفت یا ظلم سے بھی گزر جاتے۔ زیادہ تر لوگ دیہات میں رہتے اس لئے یہی زندگی نے انہیں دیہی برادریوں میں بدل دیا تھا۔ صنعتیں بنگال اور گجرات میں تھیں اور تجارت کا مرکز ملتان اور سندھ میں تھا ذیل میں ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) تاجر اور ساہوکار :

اہل دربار کے بعد سب سے موثر طبقہ تاجروں اور ساہوکاروں کا تھا۔

(الف) تجارت : اگر فصل اچھی ہو جاتی تو کسان اسے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ صنعتی مال بھی تاجر ہی خریدتے شمالی ہند کے گجراتیوں کا قدیم پیشہ تجارت ہی تھا۔ دہلی، لاہور اور ملتان تجارت کے بڑے مراکز تھے۔ ان میں ملتان کے تاجر مشہور تھے۔ ملتانی کا نام ہی تاجر پیشہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ غیر ملکی تاجروں کو خراسانی کہا جاتا تھا۔ تجارتی کاروبار عام طور پر دلالوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ یہ دلنوں فریقوں سے کمیشن حاصل کرتے۔ علاؤ الدین خلجی نے ان پر سختی سے قابو پایا لیکن فیروز تغلق کے زمانے میں انہیں باقاعدہ قانونی تحفظ حاصل ہو گیا، تاجروں کا اخلاقی معیار بہت گرا ہو تھا۔ سلطان علاؤ الدین خلجی تاجروں کی بے ایمانی، ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی سختی کے ساتھ ختم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ آڑھت کا رواج تھا بڑے بڑے تاجر

Marfat.com

انھیں ملازم رکھ لیتے تھے۔

(ب) **درآمدات** : سلطان تغلق کے زمانے میں زر بفت اور ریشمی ملبوسات اسکندریہ' عراق اور چین سے درآمد ہوتے تھے۔ سلاطین عموماً گھوڑوں کی خریداری کرتے تھے' جو ایران سے منگوائے جاتے تھے۔ درآمدات پر کسٹم وصول کیا جاتا تھا' جو ملتان میں ادا کیا جاتا تھا۔ جانوروں پر یہ محصول بہت زیادہ ہوتا تھا۔ عموماً پچیس فیصد کی شرح سے کسٹم وصول کیا جاتا۔ محمد تغلق نے یہ شرح کم کر دی تھی۔

(ج) **ساہوکاری** : تجارت کا تعلق چونکہ روپے پیسے سے تھا۔ اس لئے بعض لوگوں نے اسی کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ یہ لوگ تاجروں اور کسانوں کو رقم ادھار پر دیتے اور سود وصول کرتے تھے۔ شرح سود عام طور پر دس سے بیس فیصد سالانہ ہوتی تھی۔ یہ شرح سود مرکب کے اصول کے تحت قائم ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ غریب آدمی سود در سود کے نظام تلے دب کر رہ جاتا۔ سود کا کام کرنے والوں کو ساہوکار کہتے تھے۔ اگر اعلیٰ تجارت اور جاگیریں مسلمانوں کے قبضے میں تھیں تو ساہوکاری پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اکثر مسلمان ان کے مقروض رہتے اپنی جائیدادیں اور جاگیریں بیچنے پر مجبور ہو جاتے۔

(2) ہنرمندر اور صنعتیں :

مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی صنعتیں وجود میں آئی تھیں خصوصاً کپڑے' دھات اور چمڑے کی صنعتیں عروج پر تھیں۔ ان کے لئے بڑے بڑے کارخانے تو نہ تھے۔ لیکن کپڑے' لوہے' پتھر' کاغذ' تیل اور شکر سازی کے چھوٹے چھوٹے دستکاری یونٹ قائم تھے' جو زیادہ تر قصبات میں ہوتے تھے۔ مرکزی شہروں مثلاً" دہلی وغیرہ میں شاہی یونٹ قائم تھے۔ محمد تغلق خزاں کے موسم میں جو ایک لاکھ خلعتیں تقسیم کرتا تھا' ان کا کچھ حصہ دہلی میں بنتا تھا دیوگیر اور مہادیو نگری بھی کپڑے کی صنعت کے لئے مشہور تھے۔ جب تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو اسے سب سے زیادہ زر بفت ہاتھ آیا تھا' جو اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تھا۔ حکومت کو صنعت و حرفت سے براہ راست کوئی سروکار نہ تھا۔ ذیل میں ان صنعتوں پر مختصر معلومات پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) **کپڑے کی صنعت** : یہ برصغیر کی قدیم صنعت ہے' سوتی' اونی اور ریشمی ہر طرح کے کپڑے بنے جاتے تھے۔ ریشم کے کیڑے صرف بنگال میں پالے جاتے تھے اور بنگال میں کپڑے کی برآمد میں سب سے آگے تھا۔ اسی طرح گجرات کپڑے کی صنعت میں مشہور تھا' بنگال کے ابتدائی دور کی ململ اور سوت بہت مشہور ہے' اس سے دھوتیاں اور ساڑیاں بنتی تھیں۔ گجرات میں اطلس مخمل اور بھاری قالین تیار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ برصغیر میں گدے' چادریں' دریاں' جانماز رنگ دار اور پھول دار کپڑے بھی تیار ہوتے تھے۔

Marfat.com

(ب) دھات کی صنعتیں : لوہے اور سیسے کی صنعتیں تو ہمیں ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے دور میں ملتی ہیں۔ مسلمانوں کے دور میں اس کی مختلف صنعتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً" شمشیر سازی' اور ظروف سازی۔ فخرالدین مبارک لکھتا ہے کہ دنیا بھر میں ہندوستانی تلوار بہترین ہوتی تھی۔ اس نے دریائے سندھ کے قریب کورج کے تلوار سازوں کے آکر کیا ہے۔ قطب الدین ایبک نے سلطان محمد غوری کو سونے کے بنے ہوئے خربوزے بھیجے جو بالکل اصلی لگتے تھے۔ سلطان مبارک شاہ خلجی نے اپنے بیٹے کی ولادت پر ایک مصنوعی باغ تیار کرایا جس کے تمام پھل دار درخت سونے کے اور پتیاں زمرد کی تھیں' سرو کے درخت یاقوت سے بنائے گئے تھے۔ فرش پر بڑی مقدار میں زمرد بکھیرا گیا تیمور کے زمانے تک مرصع کاری اور پچی کاری کے کام بہت نفیس ہونے لگے تھے۔ تیمور نے ہندوستان کے کاریگروں ہی کی وجہ سے قتل عام رکوا دیا اور ان کی ایک کثیر تعداد اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔

(ج) کاغذ کی صنعت : بنگال میں درختوں کی سفید چھال سے کاغذ بنایا جاتا تھا جو موٹا اور چمکدار ہوتا تھا۔ دہلی میں دو طرح کا کاغذ عام استعمال ہوتا تھا۔ ایک سادہ اور دوسرا ریشمی عام کتابوں اور دستاویزات کے لئے استعمال ہوتا اور ریشمی کاغذ شاہی فرمان میں استعمال ہوتا تھا۔ کاغذ کی یہ صنعت ملکی ضروریات کے لئے کاغذ تیار نہیں کرپاتی تھیں اس لئے لوگ عام طور پر کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔

(د) چمڑا : پہلے پہل سندھ میں مسلمانوں نے چمڑے سازی کی صنعتیں قائم کیں' گھوڑوں کی زین' تلواروں کی نیام' کتابوں کی جلد' جوتے اور تھیلیاں چمڑے ہی سے بنتی تھیں۔ بنگال سے شکر لانے کے لئے چمڑے کے تھیلے استعمال ہوتے تھے۔ گجرات میں سرخ اور نیلے رنگ کے چمڑے سے چٹائیاں بنتی' جن پر پرندوں اور درندوں کی تصاویر ہوتیں۔ ان پر بڑی مہارت کے ساتھ سونے اور چاندی کے تاروں سے گلکاری کی جاتی۔ بکری اور بیل کی کھالیں عام طور پر استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ جنگلی جانوروں مثلاً" بھینسے اور گینڈے کی کھالیں بھی استعمال ہوتی تھیں اونٹ کی کھال سے نفیس آرائشی سامان بنتا۔ ملتان اور گجرات اس کے اہم مراکز تھے۔

(ر) شکر سازی : گنا برصغیر کی اہم پیداوار تھی۔ شکر عام طور پر گنے سے تیار کی جاتی تھی۔ اسے تیار کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ گنے کے رس کو کولہو سے نکالا جاتا اور بڑے بڑے کڑھاؤں میں ابالا جاتا تھا حتی کہ اس کی قلمیں بننے لگتیں۔ اس کی بھلیاں بنا لی جاتیں۔ زیادہ نفیس شکل قند ہوتی تھی۔ بنگال میں اتنی زیادہ شکر تیار ہوتی جو برصغیر کی ضرورت کے علاوہ برآمد بھی کی جاتی۔ بازار میں مشروب' مربے اور مٹھائیاں شکر ہی سے تیار ہو کر فروخت ہوتیں۔

(س) دستی کام : پتھر' لکڑی' ہاتھی دانت اور جواہر کا کام عام دستی ہنرمندی خیال کیا

Marfat.com

جاتا تھا۔ امیر خسرو بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ دہلی کے معمار اور سنگ تراش پورے عالم اسلام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ علاؤ الدین خلجی نے سرکاری عمارات کے لئے ستر ہزار کاریگر کام پر لگائے تھے۔ فیروز تغلق نے چار ہزار غلاموں کو ان فنون میں تربیت دلانے کا اہتظام کیا تھا۔ دنیا بھر میں لکڑی کا بہترین کام برصغیر ہی میں ہوتا تھا۔ دروازے تخت' کھلونے' مسہریاں اور ظروف بنتے تھے۔ مونگے' نقلی موتی اور ہاتھی دانت کا بہترین کام گجرات میں ہوتا تھا۔ کنگن چوڑیاں اور شطرنج کے مہرے اعلیٰ درجے کی تیار ہوتی تھیں۔

(3) زراعت :

برصغیر کی پیداوار کا زیادہ تر دارومدار زراعت پر تھا نوے فیصد آبادی زراعت پیشہ تھی' گندم' دالیں' مٹر' جو' باجرہ' چاول' تیل کے بیج' گنا اور کپاس اہم پیداوار تھیں۔ پنجاب اور الہ آباد تک کا علاقہ زرخیز تسلیم کیا جاتا تھا۔ عام طور پر کھیتی باڑی کنوؤں کے ذریعے ہوتی تھی۔ بابر نے لاہور' دیپال پور سرہند میں کنوؤں کا ذکر کیا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں نہروں سے آبپاشی ہونے لگی۔ چنانچہ حصار اور فیروز آباد میں گندم' گنے' دالوں اور تیل کے بیج کی کاشت بڑھ گئی۔ گنگا کے میدانی علاقے آم کے پھلوں کے لئے مشہور تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے وسیع پیمانے پر باغات لگوائے۔ صرف دہلی کے قرب و جوار میں بارہ سو باغ لگوائے گئے۔ سلطان سکندر لودھی نے دعوی کیا تھا کہ جودھپور کے انار کا مقابلہ ایران کا انار نہیں کر سکتا۔ پھلوں میں انگور' کھجور' ناریل' کیلا' خربوزے' آڑو' سیب سنگترے' انجیر' کھرنی اور کٹھل کی کاشت عام ہوتی تھی۔ دیگر درختوں کی پیداور میں عود اور صندل کی لکڑی قابل ذکر ہیں۔ گرم مسالوں کی کاشت گجرات کے کچھ حصوں میں کی جاتی۔ پھولوں کی کاشت بھی عام تھی ان سے عطریات تیار کئے جاتے۔

(4) معیار زندگی :

برصغیر ایک دیہی معاشرہ ہے۔ اس لئے یہاں کا معیار زندگی عرصہ تک دیہی معیار رہا۔ گھر کے تمام افراد روزی کمانے میں مصروف رہتے۔ خریداریوں کے لئے کسان میلوں ٹھیلوں کا رخ کرتے۔ دیہی کاریگر بھی اپنے سماجی مرتبے کی وجہ سے ایک خاص حد سے آگے ترقی نہ کرپاتے تھے۔ پیداوار اور آمدن کا زیادہ حصہ لگان اور انتظامیہ کی لوٹ کھسوٹ کی نذر ہو جاتا۔ باقی جو کچھ بچتا' اس سے کسان اور ہنر مند سال بھر کا گزارا کرتے۔ اسی میں سے اپنی تقریبات پر خرچ کرتے اور اسی میں سے پجاری اور مندر کی نذر کرتے' جوان کے لئے بارش اور زرخیزی کی دعا کرتا۔ زراعت پیشہ لوگ اکثر ساہوکاروں کے مقروض ہوتے۔ لباس عام طور پر کم ہوتا۔ صرف شہروں میں امراء کا طبقہ ہی پورا بلکہ زائد لباس استعمال کرتے۔ عام لوگ تقریباً ننگے رہتے۔ فرنیچر بھی صرف امراء استعمال کرتے۔ معیار زندگی دو انتہاؤں غربت اور دولت پر منقسم تھا۔ امراء اور غرباء کے درمیان تیسرا درمیانی طبقہ موجود نہ تھا۔

Marfat.com

معاشرت :

معاشرتی امور میں عام گھریلو زندگی' آداب و رسوم اور تفریحات وغیرہ شامل ہوتی ہیں جن کا ذکر ذیل میں مختصر طور پر کیا جاتا ہے۔

(1) گھریلو زندگی :

دیہی معاشرے میں کنبہ داری کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تمام افراد مل کر ہی معاشی بوجھ کو اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ مشترکہ خاندان موجود تھے۔ خاندان کی سربراہی عمر میں بڑا شخص کرتا اور باپ کے بعد عموماً بڑا بیٹا خاندان کا سربراہ بنتا۔ خاندان عموماً ایک زوجی ہوتا تاہم بعض مسلمان امراء ایک سے زیادہ شادیاں کرتے۔ بچے خصوصاً لڑکے کی پیدائش پر خوشی کی تقریبات منائی جاتیں۔ نو سال تک لڑکپن کی عمر سمجھی جاتی تھی۔ شادی اور موت پر مختلف رسوم ادا کی جاتیں۔ سلطان کی موت کا سرکاری طور پر تین دن تک سوگ منایا جاتا اور ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی ہوتی۔

امراء کے ہاں نفیس فرنیچر اور سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال عام ہوتا تھا جسے سلطان فیروز تغلق نے سختی سے منع کیا۔ سواری کے لئے گھوڑے اور گدھے کا استعمال عام تھا۔ پالتو جانوروں میں طوطا اور کتا اہم تھے۔ لباس کے سلسلے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا فرق نمایاں تھا۔ ہند عموماً لنگوٹی اور دھوتی تک محدود رہتے۔ بعض ہندو امراء نے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی پورا لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔

کھانوں کی تیاری پر بڑی توجہ دی جاتی۔ برہمن اور مسلمان علماء دونوں کھانے کے زیادہ شوقین تھے۔ سلاطین اور امراء مہمان نوازی بھی کرتے۔ نرم غذا کھانے کا شوق زیادہ تھا۔ مسالہ اور گھی بڑی مقدار میں استعمال ہوتا۔ ان کے ساتھ اچار' چٹنیاں' پھل اور مٹھائیاں بھی استعمال ہوتیں۔ صبح کے ناشتے میں ہندو عموماً کھچڑی یا ابلا ہوا چاول اور دال کھاتے اور مسلمان روٹی اور کباب کھاتے ہندو سبزی خور تھا اور عام مسلمان روٹی اور گوشت کھاتا۔ سندھ کے سومروں نے ہندوؤں کے طریقے اپنا رکھے تھے اور وہ اپنی قوم کے علاوہ کسی کے ساتھ مل کر نہ کھاتے۔

(2) عورتوں کی حیثیت :

ہندومت میں عورتوں کی حیثیت ایک کمتر لونڈی سے زیادہ نہ تھی۔ عورتیں خود کو بھی کمزور' کنیز اور کم عقل سمجھتی تھیں۔ ان کے ازدواجی قانون میں طلاق نام کی کوئی شے نہ تھے۔ شادی عموماً بچپن میں ہو جاتی اور اگر شوہر فوت ہو جاتا تو عورت کو اس کی چتا کے ساتھ جل مرنا پڑتا۔ ہندو سماج میں عورت ہر وقت کسی نہ کسی کی محتاج تھی۔ بچپن میں والد کی نگرانی' جوانی میں بھائی' شادی کے بعد شوہر اور بڑھاپے میں بیٹا عورت کا نگران ہوتا تھا۔ ہندو عقائد کے مطابق

Marfat.com

لڑکے کو جنم دینا عورت کے لئے ضروری تھا۔ تاکہ جائیداد کا وارث پیدا ہو سکے۔

(الف) مسلمانوں کے اثرات : مسلمانوں نے عورتوں کی حیثیت بدل دی تھی' عورتیں اپنے معاملات' کاروبار اور جائیداد میں خاصی آزاد تھیں۔ خصوصاً ترک اپنے ساتھ یہ آزادی لے کر آئے تھے۔ البتہ ہندو مسلمان ہوتے ان کے ہاں عورت کا مرتبہ وہی رہا جو پہلے تھا۔ مسلمان ممالک خصوصاً شیراز کی خواتین ہفتے میں تین بار وعظ سننے کے لئے مسجد میں جاتی تھیں۔ ہرات میں بھی عورتوں پر پابندیاں نہیں تھیں۔ لیکن ایرانی اور ہندوستانی روایات میں عورت ناقابل اعتبار تھی۔ اس کا مشورہ تک نہ لیا جاتا۔ ہندوستان میں اسلام کے آنے سے عورتوں کی حیثیت میں رفتہ رفتہ تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ فیروز تغلق نے بنگال کے سلطان الیاس شاہ پر صرف اس لئے حملہ کیا تھا کہ اس نے عورتوں کا قتل عام کیا تھا' جو فیروز تغلق کے نزدیک کسی بھی مذہب میں جائز نہیں۔

امراء اور اعلیٰ طبقے کی عورتوں کو خصوصی طور پر بہتر حالات میسر تھے۔ وہ مہم جویانہ اور فوجی خدمات میں مردانہ لباس پہن کر باہر بھی جاتیں اور پولو بھی کھیلتیں جب کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں لڑتے ہوئے نیازی پریشان ہو گئے تو ان کی عورتوں نے مسلح ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ ایک دفعہ عورتوں نے دہلی کے قلعہ کو دشمنوں سے بچایا۔

(ب) پردہ : ہندوستان میں پردے کا رواج مسلمانوں سے پہلے تھا۔ اسلامی تعلیمات اور علماء کی تشریحات نے اسے مزید تقویت دی۔ لیکن یہ رواج متوسط طبقے ہی تک محدود رہ سکا۔ اگرچہ گھروں میں زنان خانے اور مردانے حصے الگ الگ تھے لیکن غریبوں کی عورتوں کو ان کے ساتھ کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنا پڑتا' اس لئے وہ برقع اوڑھ نہیں سکتی تھیں۔ البتہ گھونگھٹ یا ساڑھی کے پلو سے اپنے چہرے پر سایہ سا کر لیتی تھیں۔ امراء میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک جن کی عورتیں پردہ کرتیں اور دوسرے جن کی عورتیں عام طور پر گھر کے اندر رہتیں لیکن مزاروں اور تقریبات میں آجا سکتی تھیں۔ فیروز شاہ تغلق نے انہیں گھر سے باہر جانے سے روکا اور عورتوں کا پبلک مقامات پر جانا بند کیا۔

(ج) شادی : اسلام نے عورت کی شادی کرنے کے حقوق دیئے ہیں لیکن برصغیر میں اکثر ان حقوق کا استعمال نہیں ہونے دیا گیا۔ البتہ مسلمانوں میں شادی سے پہلے عورت کی رائے حاصل کرنے کا رواج عام تھا ہندو اپنی گھرت سے باہر مگر برادری میں شادی کرتے۔ ان کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی ذات برادری یا خاندان کے مساوی ہونے کے چکر میں پڑ گئے۔ عورت کو نامحرم کی نظر سے بچایا جاتا تھا۔ محمد تغلق جب حرم میں داخل ہوتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ کسی نامحرم عورت پر اس کی نظر نہ پڑے۔

(د) ستی : ہندوؤں میں شوہر کی موت کے بعد اس کی چتا کے ساتھ ہی بیوی کو بھی زندہ

Marfat.com

جلا دیا تھا یہ ستی کی رسم کہلاتی تھی۔ راجپوتوں میں اسے اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ پنجاب میں یہ رواج بہت قدیم زمانے سے تھا اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں تو ان سب کو ساتھ ہی جلنا پڑتا۔ اگر شوہر کہیں دور فوت ہوتا اور محض اس کی اطلاع آتی تو اس کے باوجود عورت کو جل مرنا پڑتا۔ اگر عورت ایسا نہ کرتی تو اسے بے وفا سمجھا جاتا تھا۔

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلاطین نے اس رسم کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ ستی ہونے کے لئے اجازت نامہ لینا پڑتا اور یہ اجازت نامہ اکثر اوقات دے دیا جاتا۔ ستی پر مکمل پابندی ہمایوں کے دور میں عائد ہوئی۔ شمالی ہند میں اسلام کے زیر اثر بہت جلد ستی کی رسم ختم ہو گئی لیکن جنوبی ہند میں عرصہ تک جاری رہی۔

(ر) **عصمت فروشی** : ہندومت میں دیوداسیوں کا کام ہی یہی تھا کہ وہ عصمت فروشی سے مندر کی آمدنی میں اضافہ کریں۔ اس لئے برصغیر میں عصمت فروشی ایک عام شے تھی۔ علاؤ الدین خلجی نے اسے محدود کرنے کیلئے ان کے لائسنس اور نرخ مقرر کئے اور بہت سی ایسی عورتوں کی شادیاں کر دیں۔

(3) سماجی اقدار :

(الف) **وفاداری** : برصغیر کی اخلاقی قدروں میں وفاداری کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اس کی حیثیت رسمی تھی۔ مالک یا حاکم سے وفاداری' دوست سے وفاداری' شوہر سے وفاداری' اپنے اقرار سے وفاداری' یہ خوبیاں اس معاشرے میں عام تھیں۔ مسلمان حکومت سے وفاداری کو اہمیت دیتے تھے۔ علماء نے سلاطین کی اطاعت کا جواء عوام کی گردن پر رکھ دیا تھا۔ غلام کے لئے اپنے آقا اور شاگرد کے لئے استاد یا گروہ سے وفاداری لازم تھی۔ اس کے لئے نمک حلالی اور جانثاری کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ دوستی اور رفاقت ایک اعلیٰ قدر تھی۔ برے اوقات میں دوستی ہی سماجی تحفظ کی ضامن ہوتی تھی۔ کسی کو حفاظت یا پناہ میں لینا اور اپنے اس عہد پر قائم رہنا جنگجو اقوام میں اہم تھا۔

(ب) **خیرات** : دوسری اہم قدر خیرات تھی۔ ہندو اور مسلمان بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے تھے۔ سلاطین اور امراء بھی اہم موقعوں پر خیرات کرتے۔ ہندوؤں اور انکی دیکھا دیکھی مسلمانوں کا بھی یہ عقیدہ بن گیا کہ اگر اصل رقم میں سے کچھ خیرات کر دی جائے تو باقی رقم نقصان سے محفوظ ہوتی ہے۔ یہ قدر اتنی شدت سے قائم تھی کہ صوفیائے بھی جو سلطنت کے مخالف تھی۔ خیرات گاہیں اور لنگر خانے قائم کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ امیروں اور غریبوں کے دونوں طبقوں میں بہت زیادہ فرق تھا اور ایک دوسرے کا خوف دونوں کو تھا۔ اس لئے خیرات کی رقم جاری رہی اور بھیک مانگنے والوں کی ایک وافر تعداد پیدا ہو گئی۔

Marfat.com

(ج) **مہمان داری** : مہمان کو خدا کی نعمت سمجھا جاتا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر شخص اپنے مقدر کے مطابق کھاتا ہے اس لئے غریب ہونے کے باوجود مہمان کی خدمت کی جاتی کہ شاید مہمان کا مقدر میزبان کو بھی حاصل ہو جائے خصوصا شاہی مہمان کی ہر درجہ خدمت ہوتی تھی۔ شاہی مہمان کو ہر منزل پر بہترین رہائش اور غذا پیش کی جاتی تھی اور دارالحکومت پہنچنے پر اسے ایک بڑی رقم پیش کی جاتی۔ حکومت کی طرف سے شاہراہوں پر مہمان خانے بنائے جائیں جن میں ٹھہرنے کا مفت انتظام ہوتا تھا۔

(د) **عیاشی** : برصغیر کے لوگوں میں ایک اور قدر بھی رائج تھی' جسے برا کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تھا عیاشی۔ یہ زیادہ شادیوں' شراب نوشی' افیون خوری' عصمت فروشی اور قماری جیسی بری عادتوں پر مشتمل تھی۔ سلاطین اکثر زیادہ شادیاں کرتے ان کی دیکھا دیکھی امراء نے بھی حرم قائم کر رکھے تھے جہاں بیویاں اور کنیزیں ہوتیں۔ شراب نوشی اور افیون خوری عام تھی۔ علماء کی ایک اچھی تعداد کے علاوہ اکثر لوگ نشے کے عادی تھے۔ سلاطین اور امراء بھی کھلم کھلا شراب نوشی کرتے صرف علاؤ الدین خلجی ایسا سلطان تھا جس نے شراب نوشی پر پابندی عائد کی اور اس کے لئے ایک محکمہ قائم کیا جو جاسوسی کا کام انجام دیتا تھا۔ افیون خوری بھی عام تھی۔ ہندوؤں میں حشیش (بھنگ) بھی رائج تھی' جسے مسلمان درویشوں نے بھی اپنا لیا تھا۔

(ر) **آداب** : دربار کی رسوم تو مصنوعی تھیں' عام معاشرے میں بھی رکھ رکھاؤ اور آداب پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی یہ امراء اور شہری حلقوں تک محدود تھے۔ وجاہت اور تکبر ان کی [illegible] عیات تھیں اگر کوئی امیر گھر سے نکلتا تو اپنے بہترین گھوڑے پر سوار ہوتے میزبان [illegible]

[illegible] اخلاقیات میں گفتگو [illegible] اپنے بزرگوں اور بیویوں کو بیان کرنا برا سمجھا جاتا۔ غیر مہذب زبان سے پرہیز کیا جاتا [illegible] کے عادی تھے خصوصا سپاہی لیکن امراء میں اسے اہم اخلاقی قدر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ آداب ہندوؤں میں بھی رائج تھے۔

(س) **عدم تشدد** : گجرات میں جین مت کے ماننے والے عدم تشدد کے فلسفے کا پرچار کرتے تھے اسے اہنسا کہا جاتا تھا۔ ان ہندوؤں کے نزدیک برصغیر میں جانوروں کو مارنا اور خون بہانا خوفناک اور نفرت آمیز نام تھا۔ اس میں انتہا پسندی یہ تھی کہ لوگ کیڑوں اور جانوروں کی جان بچانے کے لئے شکاریوں سے خرید لیا کرتے تھے۔ اس سے بعض چالاک لوگ فائدہ اٹھاجاتے۔ ایک مذہبی گروہ اپنے جسم میں جوؤں اور کیڑوں کی پرورش کرتا تھا مانگنے والوں کا ایک طبقہ بھی پیدا ہو گیا جو گجراتیوں کو خودکشی کی دھمکی دے کر مستقل خیرات وصول کرتا تھا۔

Marfat.com

(4) تفریحات :

(الف) عسکری کھیل : مسلمانوں میں نماز کے بعد عسکری تفریحات کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ فوجی مشقوں کی بے انتہا ضرورت تھی۔ عسکری کھیلوں میں شمشیر زنی، پولو، گھڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ، تیر اندازی اور نیزہ بازی کی اہمیت حاصل تھی۔ کشتی بھی پسندیدہ کھیل تھی۔ پہلوانوں کی سرکاری طور پر حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ قطب الدین ایبک نے پولو کھیلتے ہوئے وفات پائی تھی۔ یہ کھیل اتنا رائج ہوا کہ بعد میں راجپوت بھی اس کے ماہر ہوئے۔

(ب) شکار : شکار بھی اہم کھیلوں میں شامل تھا۔ جانوروں اور پرندوں کا شکار کھیلنا عام مشغلہ تھے۔ ہر اہم سلطان شکار کا شوقین رہا ہے۔ قطب الدین ایبک پرندوں کے شکار کے لئے مشہور ہے۔ بلبن موسم سرما کے دونوں میں شکار کرتا۔ سلطان محمد تغلق کے پاس دس ہزار ماہر شکاری تھے۔ فیروز تغلق ایک جانور کو تیر سے شکار کرتا، دوسرے کا پیچھا گھوڑے پر کرتا اور تیسرے پر باز چھوڑ دیتا۔ سکندر لودھی کا زیادہ تر وقت شکار اور پولو پر صرف ہوتا تھا۔ ہر سلطان نے میر شکار کا ایک عہدہ مقرر کر رکھا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے باقاعدہ ایک محکمہ شکار قائم کر دیا تھا۔ ہرن، بیل، گائے، گینڈے، چیتے اور شیر کا شکار عام طور سے کیا جاتا۔ شیر کا شکار کرنا سلطان کا حق تھا۔

(ج) جشن : سلاطین اور امراء جشن ضرور مناتے تھے۔ عید نوروز، تاجپوشی، شاہی مہمانوں کی آمد اور فتح کے موقع پر جشن منائے جاتے۔ ان میں متعدد تفریحی پروگرام ہوتے۔ قطب الدین ایبک، التمش اور بلبن جیسے سنجیدہ سلاطین بھی جشن کی تقریبات منعقد کرتے جس میں شراب کا اہتمام بھی کیا جاتا۔ مبارک شاہ خلجی اور جلال الدین خلجی کے جشن اپنے انتظامات کی وجہ سے مشہور ہیں۔

(د) عام کھیل : اندرون خانہ کھیلوں میں شطرنج، نرد اور تاش کو مقبولیت حاصل تھی۔ سلاطین عموماً شطرنج کے رسیا تھے۔ دیگر تفریحات میں کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی اور کتوں کی لڑائی عام تھی۔ علاؤ الدین خلجی نے تو اپنا کبوتر خانہ بنا رکھا تھا۔ اگرچہ علماء ان کھیلوں کی مخالفت کرتے تھے لیکن یہ کسی نہ کسی طرح عوام میں مقبول رہے۔ سپیرے، نٹ، بازی گر اور کرتب دکھانے والوں کا ایک گروہ وجود میں آچکا تھا، جسے سلاطین اور امراء ملازم رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ مسخرے اور نقال بھی ہوتے جو تقریبات کی رونق بڑھاتے۔

(5) مکانات اور متعلقہ ساز و سامان :

جب مسلمان برصغیر میں داخل ہوئے تو چونکہ تعمیر مکانات اور آرائش خانہ میں ان کا مذاق اہل ہند سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقے ہر اعتبار سے ترقی یافتہ تھے۔

Marfat.com

اس لئے اس ملک کے شہروں اور قصبوں میں ان کی بودوماند ہندوؤں سے بالکل الگ اور ممتاز تھی۔ بلا شبہ ہندوؤں کے شہر میں راجاؤں کے عالی شان محل تیرتھ۔مندر۔ تالاب وغیرہ موجود تھے۔ لیکن ہندوانی ذوق تعمیر وسعت و عظمت اور روشنی و ہوا کے نفوذ کے اعتبار سے بہت پست واقع ہوا تھا۔ مسلمانوں نے آتے ہی عالی شان مسجدیں تعمیر کیں۔ مدرسوں کی عمارتیں بنائیں۔ جن میں گنبد محراب۔ بلند دروازے اور مینار خصوصیت سے ممتاز تھے۔ شہروں اور قصبوں کی فصیلوں کو بھی جدید اسلوب سے تعمیر کیا۔ ان میں بے شمار برج اور گرگج بنائے اور اپنی ان جدتوں کی وجہ سے شہروں کی خوشنمائی میں اضافہ کیا۔

دارالخلافوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان اور خوب صورت عمارتیں قصر شاہی اور اس کے متعلقات' شاہی کارخانوں' حرم سراؤں اور مسجدوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ تاجداروں اور ان کے امیروں کے محلوں میں محل سرائیں دیوان خانے' باورچی خانے' غسل خانے' خواب گاہیں' کتب خانے' دالان' سائبان' برآمدے' تہ خانے' نشستگاہیں اور خدا جانے کیا کچھ ہوتا تھا۔ ان کی چھتیں بلند اور منقش ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ روشن دان بنائے جاتے تھے اور کمروں کے آس پاس کھلے صحن چھوڑے جاتے تھے تاکہ روشنی اور ہوا کی کمی محسوس نہ ہو۔ محل کی اندرونی دیواروں پر ریشمیں اور مخملیں پردے اور کشمیری شالیں آویزاں کی جاتی تھیں۔ جن کے کناروں پر زربفت کے حاشے اور جواہرات کی جھالریں ٹانکی جاتی تھیں۔ امیروں منصب داروں اور بڑے افسروں کی حویلیاں بھی ان کی استطاعت کے مطابق محل شاہی کا چربا ہوتی تھیں کیونکہ وہ لوگ اپنے ولی نعمت کی تقلید کو باعث سعادت سمجھتے تھے۔ ان محلوں اور حویلیوں میں حرم سراؤں کا حصہ خاص طور پر سلیقے کا ثبوت دیتیں۔ ایسے محلے اور ایسی حویلیاں بھی عام تھیں جن کے ایک طرف نہایت صاف شفاف حوض و تالاب اور دوسری طرف میوہ دار درختوں کے چھوٹے چھوٹے باغ اور پھولوں کی باصرہ افروز کیاریاں نہایت سلیقے اور طریقے سے لگائی جاتیں۔

ان مکانات کا فرنیچر بھی نہایت شاندار اور آرام دہ ہوتا تھا۔ پلنگ کرسیاں' دیوان مسہریاں' رومی و ایرانی قالین' گاؤ تکیے' یا انداز تخت۔ مسند' گلدان' گلدستے' مرقعے' طغرے ان کمروں کو آراستہ کرتے تھے۔ بستر کے سامان میں دری' لحاف' توشک' سوزنی' رضائی' پلنگ پوش' تکیے' گل تکیے' بوغبند' بستربند کے الفاظ ہی شاہد ہیں کہ ان کے مروج کرنے البتہ اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد دیواری تصاویر بنوائیں اور مصوروں کی ہمت افزائی کے لئے کافی روپیہ صرف کیا۔ التمش کے زمانے کا ایک مورخ تاج رضا لکھتا ہے کہ جب دہلی میں خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کا سفیر سلطان کے لئے خلعت لے کر آیا تھا تو اس کی پذیرائی کے لئے شہر کو آراستہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں بہت سی دیواری تصویریں بھی کھچوائی گئیں۔ کلکتہ آرٹ گیلری میں ایک مصور شاہ پور خراسانی کی کھینچی ہوئی ایک تصویر موجود ہے جس میں سلطان محمد بن تغلق کے دربار کی ایک مجلس موسیقی کا منظر دکھایا گیا ہے۔ زمانہ حال کے ایک نقاد فن نے اس

Marfat.com

تصویر کے متعلق لکھا ہے کہ "اس میں حسن فطرت سے سادہ مسرت حاصل کرنے اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صمیمانہ خواہش پائی جاتی ہے۔ اور یہ وہ خوبی ہے جس سے اجنتا کی تصاویر اور بور بندر کے مجسمے مالا مال ہیں۔" مصور کا بیان ہے کہ یہ تصویر حقیقت میں اصل تصویر کی "نقل" ہے۔ غالبا اصل تصویر دہلی میں کھینچی گئی ہو گئی جس کو خراسانی مصور نے نقل کیا۔

فیروز شاہ تغلق اپنی کتاب "فتوحات فیروز شاہی" میں لکھتا ہے کہ میں نے محلوں کی دیواروں پر جانداروں کی تصاویر کھینچنے کی ممانعت کر دی اور حکم دیا۔ ان کی جگہ باغات وغیرہ کی تصویریں بنائی جائیں۔ اس کا بیان ہے کہ سابق بادشاہ خلعت عطا کیا کرتے تھے۔ ان پر اور سازو یراق خیموں' پردوں' برتنوں اور فرنیچر پر بھی تصاویر کھینچنے اور کاڑھنے کا رواج عام تھا عفیف نے بھی اس زمانے کی دیواری تصویروں اور پیتل' تانبے' چاندی اور سونے کی چیزوں کی منقوشات کا ذکر کیا ہے۔ شاہی علموں کے پرچم بھی گوناگوں تصاویر سے مزین کیے جاتے تھے اور محلوں کی دیواری تصویروں کا سراغ تو خاندان غزنویہ کے سلاطین کے عہد میں بھی ملتا ہے۔

جہاں تک تیرھویں صدی تک کی ہندوستانی مصوری کا تعلق ہے۔ مسلمان سلاطین و امراء نے زیادہ تر ہندوستانی انداز ہی کو آگے بڑھایا اور دیواری تصاویر کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر بعض سلاطین نے احکام شریعت کی بنا پر جانوروں کی تصاویر کو ممنوع قرار دیا۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی مصوری کو جو لازوال تحفہ عطا کیا۔ وہ "کتابی تصویر" ہے۔ جسے انگریزی میں Miniature کہتے ہیں۔ اس میں اگرچہ جزئیات دقیق نہیں ہوتیں۔ لیکن منظر دور نما ہوتا ہے۔ قریبی نہیں ہوتا۔ مسلمان یہ فن ایران سے لائے۔ تیرھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک مسلمانوں نے اس فن میں کمال پیدا کیا اور بے شمار کتابیں تیار کیں۔ جن کے ایک ایک صفحے پر نقاشی و خطاطی اور مصوری کے کمالات کا اظہار کیا۔ والے مسلمان تھے۔ ہندوستان میں روشنی کا سامان بہت ہی کافی اور کثیف تھا۔ جس کا ذکر بابر نے اپنی تزک میں کیا ہے لیکن مسلمانوں کے محلوں اور مکانوں میں شمع۔ شمعدان۔ قندیل' جھاڑ فانوس' دو شاخہ' سہ شاخہ' پنجشاخہ قمقمہ' غرض روشنی کے بیسیوں سامان موجود ہوتے تھے۔ فرش فروش کے سامان میں بھی قالین' جاجم۔ شطرنجی' نمدے' سب مسلمانوں کے لائے ہوئے ہیں۔

متوسط الحال لوگ بھی اپنی توفیق و استطاعت کے مطابق اپنے گھروں کو کسی قدر ارزاں سامام آرائش سے آراستہ کر لیتے تھے ان میں مسلمانوں کے گھروں کا سلیقہ خاص طور پر ممتاز تھا۔ غریب آدمیوں کے مکانات ویسے ہی تھے۔ جیسے دیہات میں آج کل بھی نظر آتے ہیں۔ کچی دیواروں کا مکان' جس پر پھونس کا چھپر یا بانس کی چھت۔ اس کے نیچے ضرورت کے مطابق ستون۔ کچا فرش جس پر گوبر کی لپائی۔ کچھ چارپائیاں اور کھانے پکانے کے برتن گاؤں کے مکھیا۔ مقدم۔ نمبردار یا خوشحال زمیندار بھی زیادہ تر کچے مکانوں میں رہتے تھے۔ لیکن ان کا سازوسامان

Marfat.com

عام کسانوں سے بہتر ہوتا اور مکان بھی فراخ اور دو منزلہ ہوتے۔ باہر کھلا صحن' اس میں ایک چبوترہ جس پر زمیندار بیٹھتا اور پنچائتیں جمع ہوتیں۔

شہروں کے اہل حرفہ اور تاجر دیہات کی آبادی کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھے۔ اس لئے کہ سلاطین و امراء سرکاری حکام اور خوشحال شہری ہر وقت ان کی سرپرستی کرتے۔ اور حکومت کے بہترین اقدامات سے جو فلاح رعایا کے لئے کئے جاتے۔ براہ راست مستفید ہوتے۔ ان کے مکانات اکثر پختہ ہوتے اور ان میں سامان بہتر ہوتا۔

(6) مصوری و خطاطی :

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے ورود سے قبل فن مصوری نے خاصا عروج حاصل کر لیا تھا۔ جس کی ابتدا بھوج پتر اور کھالوں پر تصویر کشی سے ہوئی اور انتہا اجنتا اور باغ کی دیواری تصاویر کی صورت میں منصہ شہود پر آئی۔ ہندوؤں کے مندروں اور راج محلوں کی دیواروں پر بڑے بڑے باکمال مصور تصویریں کھینچتے تھے۔ یہ فن چتر ودیا کہلاتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چتر ودیا کے شاہکار زیادہ تر جنوبی ہند میں تھے۔ وادی گنگا اور وادی سندھ "یو۔پی اور پاکستان) میں اس فن کی ترقی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بلاشبہ متھرا اور گجرات میں سلطان محمود غزنوی نے ہندوؤں کے فنی اور تعمیری کمالات کا مشاہدہ بھی کیا اور مندروں اور محلوں میں سونے اور جواہرات کے مسرفانہ صرف پر حیرت بھی ظاہر کی' لیکن اس نے بھی دیواری تصاویر (میورل پینٹنگ) کا کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔ صرف دوسرے شواہد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان عمارتوں میں تصاویر بھی ہوں گی۔ گو فنی اعتبار سے وہ جنوبی ہند کے بودھ آرٹ کے مقابلے میں ہیچ ہی ہوں۔

(7) فن تعمیر :

مسلمانوں کے ورود سے قبل جنوبی ایشیا میں فن تعمیر کے بڑے بڑے شاہکار موجود تھے لیکن وہ زیادہ تر ہندوؤں اور بودھوں کے مندروں اور مٹھوں کی شکل میں تھے اور ان کی کثرت جنوبی ہند میں تھی۔ چونکہ ہندوؤں کی عمارتیں زیادہ تر مذہبی تھیں۔ اس لئے انہیں فن تعمیر قدیم روایات اور مذہبی ضروریات کی پیروی کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ ان کے مندروں کا اندازہ یعنی ان کا تعمیری خاکہ اور ان کی ساخت قریب قریب یکساں ہوتی تھی۔

فن تعمیر کسی قوم کی نفسیاتی' معاشری اور مذہبی خصوصیات کا بہت بڑا مظہر سمجھا جاتا ہے اور برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعمیرات کے درمیان جو تفاوت نمایاں ہے۔ وہ ان دونوں قوموں کی طبعی خصوصیات کو نہایت وضاحت سے ظاہر کرتا ہے۔ ہندوؤں کے مندروں میں تنگ مکانی' پراسراریت' تاریکی اور غور سے دیکھئے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مکانات اور ان کے حکمرانوں کے محلات میں بھی یہی کیفیت نظر آئے گی۔ ہندوؤں کے مکانات میں فراخی اور ہواداری کے بجائے کوٹھڑیوں اور کوٹھڑیوں کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ مسلمانوں کے مکان فراخ اور ہوا دار

Marfat.com

ہوتے ہیں۔ ہندو چوں کہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں اور ان کے پھول دریاؤں میں بہا دیتے ہیں۔ اس لئے فن تعمیر کا ایک شعبہ مقبرہ ان کے ہاں بالکل ہی معدوم ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تعمیرات میں عظیم مقبرے دنیا بھر کے فن تعمیر میں خاص مقام رکھتے ہیں۔

جنوبی ہند میں عرب کے مسلمان تاجروں نے اور سندھ میں محمد بن قاسم کے بعد حکومت کرنے والے والیوں اور بادشاہوں نے عمارتیں تو ضرور بنائی ہوں گی لیکن وہ امتداد زمانہ سے نابود ہو گئیں۔ آج ہم ان کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ سلطان محمود غزنوی نے جس حملے میں متھرا کو فتح کیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غزنی میں سنگ مرمر اور سنگ خارا کی ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ایک دارالعلوم کی عمارت بھی بنوائی۔ سلطان کے ذوق تعمیر سے اس کے امراء بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں یہ شہر عظیم الشان مسجدوں، فواروں حماموں اور محلوں کے اعتبار سے مشرق کا بہترین شہر بن گیا۔ غزنی کے کھنڈروں میں ایک دو مینار اب بھی نظر آتے ہیں جو کمال تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔

برصغیر میں مسلمانوں کے فن تعمیر نے جو نئی چیزیں پیدا کیں۔ ان سے ہندو بالکل بے خبر تھے۔ مثلاً" ایک تو برصغیر کے معمار چونے کا استعمال نہ جانتے تھے۔ مسلمانوں نے انھیں عمارت کو جوڑنے والے مسالے سے شناسا کیا۔ مینار محراب، گنبد، لداؤ والی چھتیں، نصب گنبد والے دوہرے پھاٹک، نقاشی، پچیکاری، کاشی کاری، منبت کاری، اور سب سے بڑھ کر خطاطی۔ یہ تمام خصوصیات مسلمان معماروں اور فنکاروں نے پیدا کیں۔ انھوں نے ہندو طرز تعمیر کی بعض خوبیاں بھی اختیار کیں اور ان کو اپنے فن میں ایسا سمویا کہ وہ اسی فن کا جزو لاینفک ہو کر رہ گئیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا ممزوج فن تعمیر مسلم فن تعمیری قرار پایا۔ ماہرین نے اس کو دنیائے اسلام کے فن تعمیر میں ایک خاص سکول کی حیثیت دے دی۔

قطب الدین ایبک نے دہلی میں مسجد قوۃ الاسلام تعمیر کرائی جس میں زیادہ تر ہندو عمارتوں کا مسالہ صرف ہوا او[illegible]ہندوستانی معماروں اور کاریگروں کی مدد سے یہ عمارت وجود میں آئی۔ مسجد کی ضروری خصوصیت تو اس میں موجود ہیں۔ یعنی صحن، مسقف دالان اور رواقیں۔ لیکن ہندوستانی معماروں [illegible] تفصیلات میں اپنا ملکی فن استعمال کیا۔ محراب سے وہ ناواقف تھے۔ پتھر کی ڈاٹ کو جانتے نہ تھے۔ جب مسجد بن کر تیار ہوئی تو سلطان کے لئے اس کی ہیئت بہت اجنبی معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے وسطی دالان کے آگے ایک منقش جالی لگوائی اور اس میں آیات قرآنی بخط طغرا ثبت کرائیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوستانی گل بوٹے بھی بنائے گئے۔ اس کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے اس میں بہت سے اضافے کئے اور ایسی توسیع اور آرائش کا انتظام کیا کہ مسجد مسجد نظر آنے لگی۔

لیکن قطب مینار کی تعمیر خالصتاً" اسلامی ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز قطب الدین ایبک کے عہد میں ہوا۔ التمش نے اس کو مکمل کیا۔ فیروز شاہ اور سکندر لودی کے زمانوں میں اس کی مرمت

Marfat.com

ہوئی۔ اس کا نام قطب مینار "حضرت قطب شاہ اوشیؒ" کے مقدس نام پر رکھا گیا۔اس مینار کا اسلوب تعمیراس کی نقاشی و خطاطی اور اس کی عظمت و مہابت اس کے خالص اسلامی تعمیر ہونے کے شاہد ہیں۔

یہ مینار مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ زمین پر اس کا قطر 48 فٹ چار انچ ہے۔ اور بلندی 242 فٹ۔ اس میں اوپر تلے چار بڑے بڑے چھجے یا شاہ نشین ہیں۔ پہلا 98 فٹ پر۔ دوسرا 148 فٹ پر۔ تیسرا 188 فٹ پر اور چوتھا 214 فٹ پر واقع ہے۔

مسجد کے صحن میں ایک لوہے کی لاٹھ کھڑی ہے جو صرف بیس انچ زمین کے نیچے ہے اور لاٹھ کی بلندی 22 فٹ ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ لاٹھ ڈیڑھ ہزار سال پرانی ہے۔ اور اس حقیقت کی شاہد ہے۔ کہ ہندو اس زمانے میں بھی لوہے کے استعمال میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ انھوں نے اتنی بڑی لاٹھ ڈھال لی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پندرہ صدیاں گزر جانے پر بھی بادوباراں کے ہزاروں طوفانوں کے باوجود اس کو زنگ نہیں لگ سکا اور اس کا کتبہ بدستور پڑھا جاتا ہے۔ غالبا" یہ لاٹھ بھی کسی پرانے راجا نے اپنی کسی فتح کی یادگار میں قائم کی ہو گی۔

مسجد کے شمال مغربی گوشے کے پیچھے سلطان التمش کا مقبرہ واقع ہے۔ اگرچہ اس کی چھت غائب ہو چکی ہے۔ لیکن تعمیر کے حسن میں کوئی کلام نہیں۔ یہ غالبا" برصغیر میں سب سے پرانا مقبرہ ہے۔ التمش کا انتقال 1235ء میں ہوا تھا۔

حسن تعمیر کا ایک اور نمونہ علائی دروازہ ہے۔ جو 1310ء میں علاؤ الدین خلجی نے تعمیر کیا تھا۔ یہ دہلی میں پٹھانوں کے طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ہندوستانی معمار اپنے نئے آقاؤں کے تعمیری تخیل کو سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ اس میں ہندوستانی تصور کے آثار بہت کم ہیں۔

اجمیر میں تاراگڑھ پہاڑی کے نیچے ایک عظیم الشان مسجد سلطان التمش نے تعمیر کرائی۔ جس کو اڑھائی دن کا جھونپڑا" کہتے ہیں۔ مرہٹوں کے زمانے میں یہاں اڑھائی دن کا ایک میلہ لگتا تھا۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کے دالانوں میں قوۃ الاسلام کی طرح ستونوں کی بہتات نہیں۔ گنبد اور ستون موزوں اور متناسب ہیں۔ چھت کی نقاشی بھی بہت خوب صورت ہے۔ صحن کے آگے سات محرابیں ہیں۔ مرکزی محراب بائیس فٹ دو انچ چوڑی ہے۔ ان محرابوں پر کوفی اور طغرا کی جو آرائش ہے وہ دور دور تک مثال نہیں رکھتی۔

اس کے بعد تغلق خاندان کا نمبر آتا ہے اس خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق ملتان کا حاکم تھا۔ خواجہ بہاؤ الدین ملتانیؒ کا مقبرہ اسی کا عہد میں تعمیر ہوا۔ جس کی ڈھلواں دیواریں دیکھنے ولوں پر مضبوطی اور استحکام کا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ انداز تعمیر اس کے بعد مدت تک مقبول عام رہا۔ غیاث الدین نے بادشاہ بن کر ایک نئی دہلی تعمیر کی جس کو تغلق آباد کہتے تھے۔ اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ تغلق آباد کی عمارتوں کی نمایاں خصوصیت سادگی ہے لیکن جس زمانے میں تغلق

Marfat.com

شاہ کی حکومت تھی۔ اور تغلق آباد کے شاہی محلات کے گنبدوں پر طلائی کام ہو رہا تھا۔ اس وقت ابن بطوطہ اس کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جب آفتاب بلند ہوتا تھا تو تغلق شاہی محلات کی چمک دمک اور درخشانی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اس پر آنکھ نہ ٹھیرتی تھی۔ غیاث الدین تغلق کا مقبرہ اس کے بیٹے محمد تغلق نے تعمیر کرایا۔ اس کی دیواریں بھی بہاؤ الدین ملتانی کے مقبرے کی طرح ڈھلوان ہیں اور اس پر بڑے بڑے برج بنائے ہیں۔ یہ عمارت سادہ متناسب اور دلکش ہے۔ اس میں سنگ مرمر سے منقش سرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔

محمد تغلق اگرچہ ہر نوع کی قابلیت رکھتا تھا۔ لیکن اندرونی بد نظمیوں نے اس کو فنون کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ تاہم اس نے عادل آباد کا قلعہ تعمیر کیا۔ ایک شہر "جہاں پناہ" کی بنیاد رکھی۔ جس میں اپنے لئے ایک محل بنایا۔ جس کا نام "ہزار ستون" رکھا۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں بے شمار مسجدیں، محلات، مقبرے بنوائے، نہریں کھدوائیں، اس کی تعمیرات زیادہ تر مقامی سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں لیکن طلا کاری اور آرائشی نقاشی کا سراغ بھی ملتا ہے۔ امتداد زمانہ اور مسالے کے نقص کی وجہ سے اس کی عمارتیں زیادہ تر ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں۔ مثلاً "حوض خاص" کے پاس کا دارالعلوم اور فیروز شاہ کا کوٹلہ۔ کوٹلہ کے محلات بہت شاندار تھے۔ عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان کا حال لکھا ہے۔ لیکن اب صرف جامع مسجد اور خان خاناں کا مقبول مقبرہ یہی دو عمارتیں باقی ہیں۔ "کوشک زریں مینار" بھی بڑی مضبوط عمارت ہے۔ جس کے اوپر اشوک کی لاٹھ نصب ہے۔

فیروز شاہ تغلق کو آثار قدیمہ سے بہت شغف تھا۔ چنانچہ جب اس نے سنا کہ اشوک کے زمانے کی ایک لاٹھ موضع توپرہ ضلع انبالہ میں اور ایک میرٹھ کے پاس موجود ہے تو اس نے حکم دیا کہ دونوں لاٹھیں نہایت حفاظت اور اہتمام سے دہلی لائی جائیں۔ کہتے ہیں کہ فوج شاہی کے سپاہیوں اور آس پاس کے باشندوں کو جمع کیا گیا۔ صدہا من ریشم جمع کر کے لاٹھ کے آس پاس بچھا دیا گیا تاکہ جب زمین کھودنے سے لاٹھ گرے تو اس کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔ جب لاٹھ اکھڑ آئی تو اس کو سرکنڈوں اور جانوروں کی کچی کھالوں میں لپیٹا گیا۔ بیالیس پہیوں کی ایک گاڑی بنائی گئی اور ہر پہیئے کو رسوں سے باہم پیوست کیا گیا۔ اس کے بعد لاٹھ کو گاڑی پر رکھ کر ہزاروں آدمیوں نے کھینچا اور جمنا کے کنارے پہنچا دیا۔ وہاں بڑی بڑی کشتیاں تیار تھیں۔ جن پر ہزاروں من غلہ بار ہوا کرتا تھا۔ ان کشتیوں کو باندھ کر ان پر لاٹھ رکھی گئی اور فیروز آباد پہنچا دی گئی۔ یہاں اس کو نہایت اہتمام سے ایک خاص عمارت میں رکھا اور برہمنوں کو حکم دیا گیا کہ اس کے کتبے کو پڑھیں، لیکن وہ نہ پڑھ سکے۔ دوسری لاٹھ بھی اسی طرح "کوشک شکار" تک پہنچائی گئی۔

سپری (ریاست گوالیار) میں اور خیر پور (پرانی دہلی) میں دو غیر معلوم مقبرے ہیں۔ جن کا حالات اور خاکے فرگوسن نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ ان سے پٹھانوں کے طرز تعمیر کا ارتقا محسوس ہوتا ہے۔ سادات اور لودھیوں نے اس طرز تعمیر کو اور زیادہ ترقی دی۔ اب مقبرے

Marfat.com

ہشت پہلو ہوتے تھے۔ درمیان میں اونچا اور نمایاں گنبد ہوتا۔ مقبرے کے ارد گرد چھتریاں اور کنگرے تعمیر کئے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ طرز تعمیر ترقی کرتے کرتے سہسرام میں شیر شاہ کے مقبرے تک پہنچا۔ یہ مقبرہ دنیا کی عظیم ترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑے تالاب کے وسط میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی بنیادوں کا خاکہ ہشت پہلو ہے۔ ہر پہلو کی لمبائی 56 فٹ ہے۔ اور عمارت کا قطر 135 فٹ ہے۔ گیلری دس فٹ دو انچ چوڑی اور گنبد کا قطر 71 فٹ ہے۔ سلیمن اس مقبرے کو آگرہ کے تاج محل پر بھی ترجیح دیتا ہے۔ لکھتا ہے کہ "یہ بھورے پتھر کی ایک شاندار عمارت ہے جو مردانہ طاقت اور ابدی سکون کی آئینہ دار ہے۔" "شیر شاہ کی مسجد کلاں" وہ ہے جو اس نے اپنے لئے قلعہ میں تعمیر کرائی تھی۔ اس کی روکار میں پانچ محرابیں ہیں۔ جن میں پچی کاری اور دوسری آرائشوں نے عمارت کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

جونپور کی قدیم ترین مسجد قلعہ میں ہے۔ اس مسجد کو فیروز شاہ تغلق کے جرنیل ابراہیم نائب باربک نے تعمیر کرایا تھا۔ شہر میں تین بڑی مسجدیں اب تک موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑی جامع مسجد ہے جس کو شاہ ابراہیم نے شروع کیا۔ اور حسین شاہ نے مکمل کیا۔ سب سے چھوٹی مسجد "لال دروازہ" کہلاتی ہے۔ ان مسجدوں میں بنیادی اصول تعمیر تو وہی مدنظر رکھے گئے ہیں جو اسلامی معیاروں اور ضرورتوں کے اعتبار سے لازمی تھے۔ لیکن بعض تفصیلات یقیناً ہندوانی ہیں کیونکہ ان کے نو مسلم معماروں نے دینی ضروریات کے سوا باقی امور میں اپنے آبائی اور وطنی مذاق سے انحراف ضروری نہیں سمجھا۔ ایک اور مسجد "اٹالہ مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ جو زیب اور خوشنمائی کے اعتبار سے دوسری مسجدوں پر فضیلت رکھتی ہے۔

گجرات جینیوں کا ملک تھا اور مسلمانوں کے تسلط سے پہلے اس کی ہندو سلطنت بھی متعدد مقامات پر ایسے مندر تعمیر کر چکی تھی۔ جو جین طرز تعمیر کے شاندار نمونے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے جو عمارتیں بنوئیں ان میں اسلامی تخیل کی وسعت کو جینی ذوق آرائش سے مخلوط کر کے ایک ایسا اسلوب قائم کیا جو آج تک ماہرین آثا قدیمہ اور سیاحوں کے لئے سرمایہ حیرت بنا ہوا ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کا پہلا پایہ تخت انلواڑہ تھا۔ اس کے بعد احمد شاہ نے احمد آباد تعمیر کیا اور اس میں بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ جن میں ممتاز ترین عمارت جامع مسجد ہے جو وسعت و جسامت کے اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن حسن و جمال کے لحاظ سے مشرق کی نہایت خوشنما عمارتوں میں سے ہے۔ اس کے علاوہ حلقہ مرزا پور میں رانی روپ ونتی کی "رانی کی مسجد" اور بعض دوسری مسجدیں بھی ہیں۔ جن کا طرز تعمیر جامع مسجد سے کسی قدر مختلف اور زیادہ مقامی واقع ہوا ہے۔

مانڈو میں ہوشنگ شاہ کی بنائی ہوئی جامع مسجد سادگی اور عظمت کا نمونہ ہے اس کو محمود شاہ اول نے 1454ء مکمل کیا تھا۔ مانڈو کے محل اس کی مسجدوں سے بھی زیادہ شاندار ہیں۔ ایک "جہاز محل" ہے۔ جو دو بڑے بڑے تالابوں کے درمیان جہاز کی طرح کھڑا ہے۔ یہ بہت بڑی

Marfat.com

عمارت ہے۔ اس کا مشرقی روکار تین سو ساٹھ فٹ لمبا اور چالیس فٹ اونچا ہے۔ جس کے درمیان سنگ مرمر کا ایک محرابی دروازہ ہے۔ محل کے مختلف حصے اس کے شہ نشین اور اس کے دریچے اگرچہ مغل عمارتوں کی سی نفاست و نزاکت نہیں رکھتے۔ لیکن ایک خود مختار اور جنگجو پٹھان سردار کے مسکن کی شان اس کے چپے چپے سے ظاہر ہے۔

ایک اور محل "باز بہادر کا محل" کہلاتا ہے جس کو ناصر الدین خلجی نے 1509ء میں تعمیر کرایا۔ یہ محل زیادہ کھنڈر ہو چکا ہے۔ لیکن اوپر پہاڑی پر "روپ متی کی چھتری" اب بھی زیادہ تر سلامت ہے۔ جامع مسجد مانڈو کے شمال میں ایک "ہنڈولہ محل" ہے۔ جو ایک مضبوط و مستحکم عمارت ہے۔ اس سے آگے "نہار جھروکہ محل" اور دلاور خان غوری کی مسجد واقع ہیں۔ ان کے علاوہ مانڈو میں اور یادگاری عمارتیں بھی موجود ہیں جو اپنے بانیوں کی ہمت اور اولوالعزمی کی افسانہ خواں ہیں۔

بنگال میں پتھر کمیاب ہے۔ اس کی عمارتیں عام طور پر اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ گوڑ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی ہندوؤں کی مشہور راجدھانی کا مرتبہ رکھتا تھا۔ اور اس میں سین اور پال خاندانوں کے راجاؤں نے بے شمار مندر' محلات اور عمارتیں بنا رکھی تھیں۔ یہاں ایک خاص قسم کا کالا پتھر ملتا ہے۔ جو ستونوں کے لئے کام دیتا تھا۔ باقی تعمیر اینٹوں سے کی جاتی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اہل بنگال ہندوستان کے دوسرے حصوں کے معماروں کی طرح شہتیری اسلوب کے قائل نہ تھے بلکہ ڈارٹ اور محراب کو جانتے تھے اور اینٹوں سے محراب سازی کا خوب کام لیتے تھے۔ قلعہ گوڑ کے جنوبی مشرقی دروازے پر "قدم رسول" کے نام کی ایک مسجد ہے جو اینٹوں کی بنی ہوئی ہونے کے باوجود نہایت مستحکم و استوار عمارت ہے اور اس کی چھت خمدار ڈاٹوں کی بنی ہوئی ہے۔

گوڑ میں سونا مسجد (یا بارہ دروازہ) بہت خوبصورت عمارت ہے۔ جس کا روکار پتھر کا ہے۔ ایک اور "بارہ سونا مسجد" قلعہ کے باہر شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس کو نصرت شاہ نے 1526ء میں تعمیر کرایا۔ پانڈوانیں ایک آدینہ مسجد ہے۔ جس کو سکندر شاہ نے چودھویں صدی کے وسط میں تعمیر کرایا۔ یہ بہت بڑی مسجد ہے۔ جس کا طول 507 فٹ اور عرض 285 فٹ ہے۔ اس سے دو میل جنوب مغرب میں "ایک لاکھی مسجد" ہے۔ جس کے متعلق اب تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ یہ مسجد ہے یا مقبرہ۔ اس پر کوئی کتبہ نہیں جس سے حقیقت حال معلوم ہو سکے۔ یا اس کی تاریخ تعمیر ہی معین کی جا سکے۔

گوڑ میں ان کے علاوہ اور بھی قابل دید عمارتیں ہیں۔ مثلاً" اس کے متعدد دروازے نہایت شاندار ہیں۔ جن میں داخلی یا سلامی دروازہ اور کوتوالی دروازہ بہت خوبصورت ہیں۔

راجشاہی میں چھوٹا سونا مسجد۔ ڈھاکہ میں مقبرہ بی بی پری دختر شائستہ خان۔ مرشد آباد' رنگپور' راج محل' مالدا کی بے شمار عمارتیں بنگال کے خاص اسلوب تعمیر کی مظہر ہیں۔ اس

Marfat.com

معاملے میں بنگال نے اپنی انفرادیت کو ہندوستان کے دوسرے تمام حصوں سے ممتاز و ممیز رکھا ہے۔

1347ء میں حسن گانگو بہمنی نے گلبرگہ (دکن) میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے جانشینوں نے اس سلطنت کو برار سے دریائے کرشنا تک اور وارنگل سے بحیرہ عرب تک وسیع کر دیا اور وارنگل اور وجے نگر کے ہندو راجاؤں کو اپنا باج گزار بنایا۔ گلبرگہ میں بہت سی عمارتیں بنائی گئیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل ذکر ایک مسجد ہے۔ جس کی ایک خصوصیت پورے ملک میں ممتاز ہے کہ یہ مسجد قرطبہ کی طرح ساری کی ساری مسقف ہے اور صحن موجود نہیں۔ چھت تریسٹھ چھوٹے چھوٹے گنبدوں پر مشتمل ہے اور مسجد کے درمیانی رقبے پر بڑا گنبد ہے۔ جس کا قطر چالیس فٹ ہے۔ چار صدیاں گزر جانے کی وجہ سے اس کی حالت بگڑ چکی ہے۔ ایک آدھ دفعہ مرمت کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن کوئی معتدبہ نتیجہ نہ نکلا۔ بہر حال یہ مسجد اپنے انوکھے طرز تعمیر کی وجہ سے کم از کم ہندوستان میں نظیر نہیں رکھتی۔

گلبرگہ میں 570 فٹ لمبا اور ساٹھ فٹ چوڑا ایک بازار بھی ہے۔ جس کے دونوں طرف 61 محرابیں بنی ہوئی ہیں اور دونوں سروں پر خوبصورت عمارتیں کھڑی ہیں۔ یہ بازار بھی مسلمانوں کی عمارتوں میں نظیر نہیں رکھتا۔ شہر گلبرگہ میں درگاہ خواجہ بندہ نواز کے سامنے ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ اور شہر کے مشرق میں سلاطین بہمنی کے عظیم اور ڈھلواں دیواروں والے مقبرے واقع ہیں۔

احمد شاہ نے 1428 میں بہمنی پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر میں منتقل کر دیا اور یہاں بہت سی عمارتیں بن گئیں۔ جن میں ممتاز ترین خواجہ محمود گاواں کا عظیم الشان مدرسہ ہے۔ جو 1481ء میں مکمل ہوا۔ یہ اس زمانے میں اپنی قسم کا ایک ہی مدرسہ تھا جو ہر اعتبار سے مکمل اور کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ عمارت اپنی وسعت و عظمت۔ محرابوں کی کثرت' سقفی گنبدوں کی افراط اور روکار کی کاشی کاری کے اعتبار سے یادگار زمانہ تھی۔ افسوس کہ اب زیادہ تر کھنڈر ہو چکی ہے۔

بہمنی اور برید شاہی سلاطین کے بہت سے مقبرے بھی شہر کے آس پاس موجود ہیں۔

ایک ترک یوسف عادل خان جس کو بعض لوگ ترکی سلطان مراد ثانی کا بیٹا بتاتے ہیں۔ بیدر میں امیر برید کے باڈی گارڈ میں ملازم تھا۔ یہ اپنی ہمت اور اولوالعزمی سے اس قابل ہو گیا کہ اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے بیجاپور میں خاندان عادل شاہی کی بنیاد رکھی۔ پہلے پچاس ساٹھ سال تک تو اس خاندان کو جنگ و پیکار سے اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ تعمیرات کی طرف متوجہ ہوتا۔ لیکن علی عادل شاہ کے زمانے سے عمارتیں بننے لگیں۔ (1557ء) عادل شاہیوں سے پہلے بھی بعض مسلمان فاتحین نے بیجاپور میں ایک دو مسجدیں تعمیر کیں' لیکن ان کا انداز وہی ہندوانی تفصیلات رکھتا تھا۔ جو پٹھانوں کے ابتدائی اسلوب تعمیر میں نمایاں ہے لیکن عادل شاہیوں کے زمانے میں بیجاپور سے تعمیری اعتبار سے اتنی ترقی کی کہ اس کی عمارتیں دہلی آگرہ سے لگا کھانے

Marfat.com

لگیں۔ ایک تو یہ سلاطین ترکی نسل سے تھے۔ دوسرے شیعہ ہونے کی وجہ سے ایران کے ساتھ گہرا رابطہ رکھتے تھے اور بہت سے ایرانی باکمالوں کو اس دربار میں پناہ مل گئی تھی۔ اس لئے بیجاپور کی تعمیرات ہندو اثر سے علی العموم پاک ہیں۔

علی عادل شاہ نے ایک جامع مسجد کی تعمیر شروع کی۔ جس کو اس کے جانشینوں نے جاری رکھا۔ لیکن تکمیل پہنچنے سے پہلے ہی یہ خاندان محروم اقتدار ہوگیا۔ یہ مسجد اگر مکمل ہو جاتی۔ تو 331 فٹ لمبی اور 257 فٹ چوڑی ہوتی۔ اس کی چھت میں بھی بے شمار چھوٹے گنبد ہیں۔ اسکے بنیادی خاکے میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ لیکن تفصیلات کی خوشنمائی اور آراستگی کے اعتبار سے یہ مسجد ہندوستان کی بہترین مسجدوں میں شمار کی جاتی ہے۔

تورانیوں میں یہ عجیب رسم ہے۔ کہ عام طور پر ہر بادشاہ اپنا مقبرہ خود ہی تعمیر کر لیتا ہے اور بعض اوقات وہ اس کی زندگی میں مکمل نہیں ہو پاتا۔ اور اس کے جانشین اس کو مکمل کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ علی عادل شاہ نے اپنا مقبرہ بنایا جو نامکمل رہ گیا۔ اس کے بھتیجے ابراہیم ثانی نے اپنا مقبرہ چھوٹے چھوٹے پیمانے پر شروع کیا۔ چونکہ اس کو کافی مہلت مل گئی۔ اس لئے اس نے اس کی آرائش و زیبائش پر بہت توجہ صرف کی۔ اسی مقبرے میں اس کی والدہ اس کی بیٹی زہرا سلطانہ' اس کی ملکہ تاج سلطانہ اور دو بیٹیوں کی قبریں بھی ہیں۔ اس مقبرے کے ساتھ ایک شاہی باغ فواروں اور کوشکوں سے آراستہ ہے۔ بیرونی حصے میں مسافروں کے لے سرائیں بنی ہوئی ہیں اور اندر ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔

اس کے جانشین محمد شاہ کا مقبرہ اپنی بعض تعمیری خصوصیتوں کی وجہ سے ہمیشہ ماہرین آثار کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس کا اندازہ بھی جامع مسجد ہی کا ہے۔ لیکن اس کی ساخت عظیم تر ہے۔ فرش سے 57 فٹ کی بلندی پر اس کے عظیم و جیم گنبد کا قطر 124 پانچ انچ ہے۔ اندرونی پیائش کے اعتبار سے یہ گنبد فرش سے 178 فٹ اور خارجی لحاظ سے بیرونی چبوترے سے 198 فٹ اونچا ہے۔ گنبد کی موٹائی آغاز میں دس فٹ اور چوٹی پر نو فٹ ہے۔ یہ پیائش اس قدر مرعوب کن ہے کہ بے اختیار بیجاپور کے باکمال معماروں کے بلند تخیل اور بے نظیر مہارت فن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ گنبد کی جسامت کے علاوہ اس عمارت کے فن تعمیر کے رو سے بعض دوسرے کمالات بھی ماہرین آثار کے لئے مرکز توجہ رہے ہیں۔ جن کا ذکر ان کی کتابوں میں موجود ہے۔

بیجاپور کی حکومتی تعمیرات میں بھی اسی جرات تصور اور مہارت تکمیل کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً "لگن محل" ایک دربار ہال ہے جس کو ایوان عام کہنا چاہئے۔ آثار مبارک (آثار محل) "سات منزلہ" بہت شاندار عمارتیں ہیں۔ بخارا مسجد۔ محمد شاہ کے مقبرے کی ملحقہ مسجد۔ عدالت محل سورج محل۔ یاقوت دہلی کا محل۔ خواص خان کا مقبرہ۔ چھوٹا چینی محل۔ عرش محل بہت نفیس عمارتیں تھیں۔ کن کو حکومت بمبئی نے سرکاری دفاتر میں منتقل کر دیا ہے۔

اسی طرح خاندیش کے فاروقیوں کا پایہ تخت برہان پور اور قطب شاہیوں کا صدر مقام

Marfat.com

گولکنڈہ بھی مسلمان سلاطین کی تعمیر کردہ مسجدوں اور مقبروں سے پٹے پڑے ہیں۔ سر سالار جنگ نے ان میں سے بعض کی مرمت بھی کرائی تھی۔ لیکن دوسری عمارتیں روز بروز دستبرد زمانہ کی نذر ہوتی جا رہی ہیں۔

بہر حال دکن بھی مسلمانوں کے کمالات تعمیر کے اعتبار سے کسی طرح شمالی ہندوستان سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ بیجاپور نے تو اپنا ایک علیحدہ تعمیری دبستان قائم کیا اور ترکی' ایرانی اور ہندوستانی تخیل کے امتزاج سے حیرت انگیز تعمیری کارنامے انجام دیئے۔

بنگال میں تو بارش کی کثرت اور زمین کے جوش نمو کی وجہ سے بعض قدیم عمارتوں میں کہیں کہیں روئیدگی ہو جاتی ہے۔ جو عمارتوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کے علاوہ عمارتوں کے گرد گھنے جنگل نمودار ہو جاتے ہیں اور وہ ان میں چھپ جاتی ہیں۔ سندھ کی کیفیت یہ ہے کہ بنگال کی طرح اس کی قدیم عمارتوں میں بھی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں کیونکہ پتھر کمیاب ہے۔ اس علاقے میں روئیدگی کی کثرت نہیں لیکن ناقص قسم کے پلستر اور زمین کے شور کی وجہ سے اینٹیں اکھڑ جاتی اور دیہاتی عوام ان کو لے جا کر اپنے مکانوں میں لگا لیتے ہیں۔ غالباً" یہی وجہ ہے۔ کہ سندھ میں پرانی عمارتیں کم ہیں جو چند عمارتیں ہیں۔ وہ شہر ٹھٹھہ کے پاس واقع ہیں جو ایک زمانے میں مسلمانوں کے اقتدار اور ان کے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ غالباً" سندھ میں سب سے پرانی عامرت جام نظام الدین کا مقبرہ ہے۔ جو 1508ء میں تعمیر کیا گیا۔ مسجد دگبیر 1509ء میں بنائی گئی۔ امیر خلیل خان کا مقبرہ 1572ء میں تعمیر ہوا۔

(7) موسیقی :

اس سے پیشتر کہ ہم مسلمان بادشاہوں اور بزرگوں کی ان مساعی کا تفصیل سے ذکر کریں جو انھوں نے موسیقی کے فن لطیف کی ترقی و تہذیب کے سلسلے میں انجام دیں۔ ہم ہندوستانی موسیقی کے ساتھ مسلمانوں کے عمومی شغف کے متعلق مولان ابوالکلام آزاد کی کتاب "غبار خاطر" کا ایک اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں :

اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لئے غیر ملکی نہیں رہے تھے بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے تغافل برتتے۔ چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں امیر خسرو جیسے مجتہدین کا پیدا ہونا اس حقیقت حال کا واضح ثبوت ہے۔ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ غالباً" مسلمان بادشاہوں سے پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ ملتان' ایودھن گور اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت اور قبولیت کے لئے اپنا اپنا جوہر کمال پیش کرتے تھے۔ خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدردانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ لیکن جس شاہی خاندان نے موسیقی سے بحیثیت فن کے خاص اعتنا کیا۔ وہ

Marfat.com

غالباً" جونپور کا شرقی خاندان تھا۔ اسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں کا اور پھر بیجاپوری بادشاہوں کا ذوق شوق نمایاں ہوتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ تو بقول ظہور اس اقلیم کا جگت گرد تھا اور اس کے شوق موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد وسماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے۔

مروت کروہ شہبابر تو سیر بام و در لازم
نمی باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں

مالوہ، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ گوڑ کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی دونوں کے سرپرست تھے۔ مالوہ کے بازبہادر کو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا اور موسیقی کا ماہر بھی۔ آج تک مالوہ کے گھروں سے اس کے دہروں کی نوائیں سنی جا سکتی ہیں۔

ہندوستانی موسیقی پر پہلی کتاب بنگال کے نامور شاعر جے دیو نے "گیتا گوندا" کے نام سے لکھی۔ یہ بارھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس کے بعد تیرھویں صدی عیسوی میں پنڈت سارنگ دیو نے "سنگیت رتناگر" تصنیف کی۔ لیکن باوجودیکہ ان کتابوں کی متعدد شرحیں اور تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن ہندو اور یورپین مصنفین کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ ان کتابوں کو سمجھنے والا کوئی آدمی موجود نہیں۔ لہٰذا ان باکمالوں کی محنت رائگاں گئی۔ جو کتابیں سمجھ میں آنے والی ہیں۔ وہ سب کی سب تیرھویں صدی کے بعد لکھی گئیں۔ اور ان سب میں سے موسیقی کی وہ صورت نمایاں ہے جو اس نے امیر خسرو کے بعد اختیار کی۔

اگرچہ سندھ میں عرب حکومت کے ماتحت موسیقی کے چرچے اور اس کی ترقی کے متعلق معتدبہ معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔ لیکن بنو امیہ کے زمانے کے خلفاء اور امراء کے ذوق موسیقی کو کون نہیں جانتا۔ کتاب الاغانی اور دوسری معاصر تصنیفات میں اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ محمد بن قاسم اور اس کے رفقاء اور اس کے بعد مقرر ہونے والے عرب گورنر یقیناً عربی و عجمی موسیقی کے رسیا ہوں گے۔ ہندوستانی موسیقی بھی سنتے ہوں گے۔ اور دونوں کے درمیان امتزاج کا غیر محسوس سا عمل مدت تک جاری رہا ہو گا۔

لیکن سلاطین دہلی کے ذوق و شوق کی داستانوں سے تو تاریخ کی کتابیں لبریز ہیں۔ غزنوی، غوری خاندان کو تو چھوڑ دیجئے۔ اس لئے کہ یہ ملک گیری اور کشور کشائی کا دور تھا۔ لیکن سلاطین بلبن کے عہد میں جب امیر خسرو کے زیر صدارت فنون ادب کی ترقی کے لئے مجلسیں قائم ہوئیں۔ اور شہزادہ محمد نے ان کی سرپرستی اختیار کی۔ تو سلطان کے دوسرے فرزند قراخان بغرا نے اپنے محل میں ایک مجلس کا آغاز کیا۔ جس میں قصہ گو۔ رقاص اور موسیقی دان شامل ہوتے تھے۔ اور اس مجلس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر امرائے دربار نے بھی شہر میں ایسی کئی مجلسیں برپا کر دیں۔

Marfat.com

جلال الدین خلجی کے زمانے میں بھی امیر خسرو شعر و نغمہ کی تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ اور مجالس سلطانی میں علم و فضل کے ساتھ ہی ساتھ موسیقی کا چرچا بھی رہتا تھا۔ اس زمانے کے بہترین گانے والے امیر خاصہ اور حامد راجا تھے۔ اور سازندوں میں محمود چونگی' فتوحا ناصر خان اور بہروز نہایت باکمال اور نامور تھے۔ امیر خسرو ہر مجلس میں اپنا کلام یا نغمہ سناتے اور ہر دفعہ انعام پاتے۔

یہ زمانہ موسیقی میں تجدید و اجتہاد کا زمانہ تھا۔ اور مجتہد امیر خسرو تھے۔ جنھوں نے ہندوستانی موسیقی میں عجم کا پیوند لگا کر اسے حیات تازہ بخشی۔ اور گزشتہ چھ سات سو سال کے دوران میں جو موسیقی ہندوستانی موسیقی کے نام سے مشہور زمانہ چلی آرہی ہے۔ اس میں غالب حصہ امیر خسرو کے اجتہاد سے متاثر ہے۔

فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں ہر جمعہ کو نماز کے بعد کوئی تین ہزار موسیقار' داستان گو اور جسمانی کرتب دکھانے والے قصر سلطانی کے سامنے جمع ہوا کرتے تھے اور سلطان انھیں انعامات سے نوازتا تھا۔

بیجاپور کے سلطان عادل شاہ کا ذوق موسیقی سب مورخین کے نزدیک مسلم ہے۔ وہ بہت سے ماہرین موسیقی کو وظائف و انعامات سے مالا مال کرتا تھا۔ لیکن اکثر کے مقابلے میں خود زیادہ ماہر تھا اور دو تین ساز خوبی و خوش اسلوبی سے بجا لیتا تھا۔ اس کے دربار میں ہندوستانی موسیقاروں کے علاوہ ایران' ترکستان اور روم تک سے اہل فن آتے اور شاہی قدردانی سے مستفیض ہوتے۔ اسماعیل عادل شاہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ خود بھی گانے بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اور باکمالوں کی قدر بھی کرتا تھا۔

امیر خسرو کے بعد ہندوستانی موسیقی کا بہت بڑا ماہر اور بہت بڑا محسن جونپور کا سلطان حسین شرقی تھا۔ جس نے موسیقی میں گراں قدر اضافے کیے۔ اور مختلف راگ راگنیوں کے تال میل سے نئے نئے راگ اور راگنیاں اختراع کیں۔ مثلاً" کانڑے کی دو قسمیں سلطان حسین شرقی نے ایجاد کیں۔ کلیان کی مشہور شاخ شام کلیان کی کوئی دس قسمیں سلطان ممدوح نے قائم کیں۔ یعنی شام کلیان کو مختلف راگوں کے ساتھ ملا ملا کر گور شام۔ بھوپال شام۔ گنبھیر شام۔ پوربی شام۔ بسنت شام وغیرہ پیدا کیں حجاز کے ساتھ یمن کو ملا کر ایک اور راگ۔ بنایا۔ ٹوڈی کے ساتھ دوسرے راگوں کو ملا کر کوئی چودہ قسمیں ایجاد کیں۔ مثلاً" ٹوڈی جونپوری۔ ٹوڈی رسولی وغیرہ۔ اسی طرح شدھ بھیرویں بھی سلطان حسین ہی کی ایجاد ہے۔ اس نے دھرپد کی جگہ خیال کو رادج دیا۔

دھرپد اور خیال کے فرق کو واضح کرنے کے لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ شاہد احمد دہلوی کے ایک مضمون "پاکستانی موسیقی" سے دو پیراگراف نقل کر دیں۔ وہ لکھتے ہیں :

دھرپد : جب گانے میں الفاظ داخل ہوئے تو تال اور لے کی قید سے کلام موزوں وجود میں آیا۔ اور ترقی پا کر دھورد چھند پد۔ کبت اور دوہا کہلایا۔ موسیقی نے جب ترقی کی۔ تو گانے میں

Marfat.com

شاعری بھی داخل ہو گئی۔ مجلسوں اور درباروں میں پہنچنے کے بعد فنی خوبیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ عام گانوں نے خاص خاص روپ دھارنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ دھورو اورپد کے امتزاج سے دھرپد پیدا ہوا۔ اور اگلے زمانے کے استادوں نے اس کے عملی اصول مقرر کئے۔ دھرپد کے چار تک یا حصے ہوتے ہیں۔ استھائی۔ انترہ۔ سنچائی اور ابھوگ۔ اس کے لئے تالیں بھی مخصوص ہیں۔ مثلاً" چوتالہ۔ سول فاختہ۔ جھپ تالہ وغیرہ۔ دھرپد ایک خاص قسم کا مردانہ گانا ہے۔ جس میں حمدوثنا اور شجاعت کے کارنامے یا دیوتاؤں کی توصیف بیان کی جاتی ہے۔ جب دھرپد جھپ تال میں گایا جاتا ہے۔ تو ساورہ کہلاتا ہے۔ اور جب دھمار میں گایا جاتا ہے۔ تو ہوری کہلاتا ہے۔ دھرپد کی ترقی اکبر اعظم کے زمانے میں ہوئی۔ تان سین۔ بلاس خان۔ درنگ خان۔ لعل خان وغیرہ نے اس کو چار چاند لگائے۔ شاہجہان کے دور سلطنت تک دھرپد کا عروج رہا۔ سورج خان۔ چاند خان اور کم و بیش دو سو موسیقاروں نے اس صنف میں اپنے اپنے کمالات ظاہر کئے۔

خیال : پندرھویں صدی عیسوی میں جونپور کے شاہاں شرقیہ میں سے سلطان حسین شرقی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا۔ اور اس کا نام خیال رکھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے۔ کہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت امیر خسرو نے منجملہ دیگر اختراعات کے خیال ایجاد کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ امیر خسرو ہی نے وضع کیا ہو۔ مگر خیال کی ترویج و ترقی کا سہرا سلطان حسین شرقی ہی کے سر ہے۔ خیال کو شروع میں دھرپد ہی کے کینڈے پر بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہی چار تک یا حصے رکھے گئے تھے۔ جو دھرپد کے ہوتے ہیں۔ بعد میں صرف استھائی اور انترہ باقی رہ گیا۔ اور سنچائی اور ابھوگ کو خارج کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دھرپد اور خیال میں نمایاں فرق تانوں کا رکھا گیا۔ دھرپد میں تانیں نہیں ہوتیں۔ تان کی صرف ایک شکل دھرپد میں ہوتی ہے۔ اور وہ گمک کہلاتی ہے۔ خیال کے لئے نئی نئی تانیں وضع کی گئیں۔ اور ان کی تعداد اتنی بڑھی۔ کہ شمار سے باہر ہو گئی۔ آج کل کے رواج میں صرف بارہ تانیں ہیں۔

خیال کے عروج کا زمانہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کا زمانہ ہے۔ ایجاد ہو جانے کے باوجود خیال کا چراغ تین سو سال تک دھرپد کے آگے نہ جل سکا۔ آخر محمد شاہ کے دو درباری فن کاروں نے خیال کو اتنا فروغ دیا۔ کہ دھرپد ماند پڑ گیا۔ شاہ سدا رنگ اور شاہ ادارنگ کی بنائی ہوئی چیزیں آج بھی فخر کے ساتھ گائی جاتی ہیں بلکہ راگ کی صداقت میں بطور سند پیش کی جاتی ہیں۔

ہندوستانی موسیقی میں علم و فن کے استاد کو پنڈت کہتے ہیں۔ اس کے بعد گنی کا درجہ ہے جو اس سے بڑھے۔ اس کو گندوپ یا گندھوب کہتے ہیں۔ پھر گائن۔ اور پھر نائک کا رتبہ ہے جو کمالات موسیقی کا بلند ترین رتبہ ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تان سین کو بھی نائک کا مرتبہ حاصل نہیں ہوا بلکہ وہ گندھرب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض کی رائے یہ ہے کہ اب تک ہندوستانی موسیقی میں سات نائک گزرے ہیں۔ اول امیر خسرو۔ دوم سلطان حسین شرقی۔ سوم چنچل سین۔ چھارم باز بہادر فرمانروائے مالوہ۔ پنجم سورج خان قوال۔ پاک و ہند میں موسیقی کی

Marfat.com

روایت کی مزید تفصیل جاننے کے لئے "مغل عہد کی موسیقی" کے باب کا مطالعہ کریں۔

Marfat.com

باب 14

مغلوں سے پہلے ادبی ارتقاء
(LITERARY DEVELOPMENT)

عرب اور ہند و پاکستان کے تجارتی تعلقات پرانے ہیں لیکن جب سندھ عرب حکومت کا ایک ماتحت صوبہ بن گیا تو عربوں اور اس سرزمین کے باشندوں (بالخصوص سندھیوں) کے درمیان گہری راہ رسم کا دروازہ کھل گیا اور پھر جب عباسیوں نے دمشق کی جگہ بغداد کو اپنا دارالحکومت بنایا تو "ہندو سندھ" سے عربوں کا علمی، مذہبی اور سیاسی مرکز اور بھی قریب ہو گیا۔ اس قرب سے خلفا سے بغداد نے بہت فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کی علمی ترقیوں سے اپنے آپ کو پوری طرح باخبر کیا۔ عرب اس وقت دنیا کی ساری قوموں سے سربلند تھے۔ چین کی سرحد سے اسپین کے ساحل تک ان کا پرچم لہرا رہا تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ دنیاوی تفوق حاصل کرنے اور حاصل کر کے اسے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ **"دع ما کدر خذ ما صفا"** کے اصول پر عمل ہو اور علمی ترقیاں جہاں کہیں بھی ہوں ان سے خبردار رہا جائے۔ ہندوستانی ان کے محکوم تھے لیکن انھوں نے محکوموں اور ماتحتوں سے سبق سیکھنے سے گریز نہ کیا اور کئی ہندوستانی کتب کو عربی میں نقل کر کے ان کے مطالب اخذ کئے۔

اردو کی ابتداء :

سندھ میں عربوں کی آمدورفت کے ساتھ ساتھ سندھی زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ شامل ہو گئے تھے۔ عربی سے سندھی زبان کو رسم الخط ملا۔ عرب فاتحوں اور تاجروں کے علاوہ ایرانی تاجر بھی سندھ میں آتے تھے۔ ان کی وجہ سے منصورہ، ملتان وغیرہ میں کچھ نہ کچھ فارسی زبان کا بھی اثر تھا۔ غزنوی فوجوں میں افغانی، ترک، ایرانی بلوچی اور ہندی سپاہی شامل تھے۔ ان کے آپس کے میل ملاپ سے رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ بول چال میں رائج ہونے لگے۔ پھر مقامی بولیوں سندھی، پنجابی، ملتانی کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ چنانچہ انہی زبانوں کی آمیزش اور اشتراک سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔

عربی سے متاثر سندھی اور فارسی متاثر پنجابی کا باہمی میل جول ملتان اور اس کے گردونواح میں ہوا۔ عربوں نے اس نئی زبان کو ہندوی کہنا شروع کیا۔ قطب الدین ایبک کے ساتھ یہ زبان دہلی پہنچی اور وہاں کی مقامی بولیوں کے ساتھ مل کر پہلے ہندی اور پھر اردو کہلائی۔

اردو گویا ایسی زبان تھی جو ملک کے رہنے والے بھی آپس میں بول چال کے لئے استعمال

Marfat.com

کر سکیں اور باہر سے آنے والے بھی سمجھ سکیں۔ اس لحاظ سے اردو کے آغاز اور اس کے مزاج سے یہ اندازہ لگانا غلط نہیں ہو گا کہ یہی وہ زبان تھی جس کی ابتدا محمود غزنوی کے دور میں لشکری بولی کے طور پر ہوئی۔

غزنوی عہد میں افغانی اور ہندوستانی لوگوں کے تعلقات بڑھنے لگے تھے۔ ہندوؤں کی ایک خاص فوج غزنی میں متعین رہتی تھی۔ پنجاب میں غزنوی دور حکومت قریبا پونے دو سو سال بنتا ہے۔ اس دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خاصے وسیع ہو گئے تھے۔ اکثر ہندوؤں نے فارسی پڑھی اور مسلمانوں نے ہندی۔

محمود کے زمانے میں کئی ترجمان غزنی میں مقیم تھے۔ اس طرح زبانوں کے ملاپ اور قوموں کے میل جول سے عام بول چال کی زبان اردو وجود میں آئی۔ یہ گویا اسلامی معاشرت اور حکومت کا ایک نہایت عمدہ تہذیبی عطیہ تھا جو برصغیر کے لوگوں کے حصے میں آیا۔

غزنویہ دور اور علم ادب :

غالباً" غزنویہ دور کا سب سے زیادہ قابل تعظیم عالم البیرونی تھا۔ اس نے کتاب الہند محمود کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد مرتب کی اور اپنی دوسری کتاب قانون مسعودی محمود کے جانشین مسعود کے نام معنون کی۔

محمود کی طرح اہل علم کا قدر دان تھا۔ اور اس کے دربار سے کئی اہل کمال وابستہ تھے۔ لیکن اس زمانے کی ایک قابل ذکر تبدیلی لاہور اور اہل لاہور کا علم و فن میں عروج تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی مختلف فتوحات سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ لاہور میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور چونکہ یہاں غزنی سے کئی اہل علم .سلسلہ ملازمت آکر آباد ہوئے۔ اس لئے ان کے فیض سے یہ شہر بھی اسلامی علوم اور مذہب اسلام کی اشاعت کا مرکز ہو گیا۔ شروع شروع میں تو یہاں اہل علم کا قحط تھا۔ چنانچہ جب داتا گنج یہاں تشریف لائے تو انھیں غزنی صحبتیں یاد آتی تھیں اور انھوں نے اپنی ایک کتاب میں شکایت کی ہے کہ یہاں آکر ناجنسوں میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ لیکن ابراہیم غزنوی کے زمانہ حکومت (1059ء-1098ء) میں لاہور علمی سرگرمیوں کا گہوارہ ہو گیا۔ اور بقول عوفی علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ ابراہیم کا ایک وزیر ابو نصر فارسی جو ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے ادیب مشہور ہے، علم و فضل کا مربی تھا۔ اس نے لاہور میں ایک خانقاہ قائم کی جو اہل علم اور دوسرے بزرگوں کی جائے پناہ تھی۔ اور آہستہ آہستہ لاہور بلخ و بخارا اور دوسرے ممالک سے اہل علم کھچ کر آنے لگے۔

ابراہیم غزنوی کے بعد اس کا بیٹا سلطان علاؤالدین مسعود تخت نشین ہوا۔ اس کے دربار کی ایک قابل ذکر ہستی مسعود سلمان ہے، جو پاکستان کا پہلا فارسی شاعر تھا۔ ایرانی تذکرہ نویسوں نے تو اسے ہمدانی اور جرجانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ خود اپنی جائے پیدائش لاہور بتاتا ہے اور وہاں سے دور ہونے پر افسوس کرتا ہے۔

Marfat.com

سلطان ابراہیم غزنوی کے دربار کا ایک شاعر ابوالفرج رونی تھا' جو بعض تذکرہ نوسیوں کے بیان کے مطابق مضافات لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ قصیدہ نویسی میں یکتائے زمانہ تھا۔ انوری نے کئی اشعار میں اس کی استادی کا لوہا مانا ہے۔

سلطان مسعود ابن ابراہیم کے بعد اس کے بیٹے بہرام نے شعراء کی سرپرستی کی۔ خسرو ملک جو غزنوی خاندان کا آخری حکمران تھا' بہرام کا پوتا تھا۔

مشہور شعرا اور مورخین کے علاوہ غزنیہ دور کی قابل ذکر ہستی داتا گنج بخش ہیں اس زمانے کے فن تعمیر کے نمونے پاکستان میں کوئی نہیں اور غالباً" اس کی وجہ یہ ہے کہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے پہلے ہندوستان میں بیشتر نائب السلطنت رہتے تھے۔ اور حکومت کا دارالخلافہ غزنی تھا۔

عہد غلاماں میں علم و ادب :

(۱) ہم غزنویہ خاندان کے شعرا اور نثر نگاروں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے آخری ایام میں لاہور اور ملتان علم و ادب کے دو اہم مرکز بن رہے تھے' لیکن جب سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کو سر کیا اور اسے تمام مقبوضات ہندو کا دارالسلطنت قرار دیا تو یہ شہر بھی اسلامی علوم کا بڑا مرکز بن گیا۔ قطب الدین ایبک کے زمانے میں ہی یہاں مدرسوں کے قیام کی اطلاع ملتی ہے۔ افسوس ہے کہ ان مدرسوں کے نام باقی نہیں اور یہ پتا چلتا ہے کہ وہ کس درجے کے تھے۔ لیکن عہد التمش میں دو بلند پایہ مدرسوں مغزیہ اور ناصریہ کے نام آتے ہیں۔ ان کا انتظام قاضی منہاج سراج مصنف طبقات ناصری کے سپرد تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں ایک اور دور دراز ملک میں مدرسے قائم ہونے کا ذکر آتا ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جب سلطان محمد غوری کے مشہور سپہ سالار بختیار خلجی نے بنگالہ اور بہار فتح کیا۔ تو اس نے شہر رنگ پور بسایا اور وہاں اور دوسرے شہروں میں کئی مدرسے تعمیر کرائے۔

سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں ایک دو شاعروں کے نام اور ان کا کلام ملتا ہے۔ ایک شاعر ملک الکلام بہاء الدین اوشی تھی جو بعد میں اوش چلے گئے اور وہاں کے شیخ الاسلام بنے۔ انھوں نے سلطان کی سخاوت کی ایک رباعی میں تعریف کی تھی۔

دوسرے اہل قلم تاج المآثر کے مصنف تھے جنھوں نے ہندوستان میں اقامت اختیار کی۔ ان کا نام نظام الدین حسن نظامی نیشاپوری تھا۔ تاج المآثر میں چھبیس سال کے حالات درج ہیں۔ اور قطب الدین ایبک اور شمس الدین کے عہد حکومت کے واقعات (بڑے انشا پردازانہ رنگ میں اور پیچ در پیچ طریقے سے) بیان ہوئے ہیں۔ مولنا حسن نظامی شاعر بھی تھے اور تاج المآثر میں موقع بہ موقع انھوں نے اپنا عربی و فارسی کلام درج کیا ہے۔

اس دور کے ایک اور قابل ذکر مصنف فخرالدین مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبر غزنوی

Marfat.com

ہیں۔ جن کی ساری عمر ہندوستان میں گزری۔ ان کی کتاب سلسلہ الانساب سلطان قطب الدین ایبک کے نام پر معنون ہے۔ شروع میں عہد قطبی کی مختصر تاریخ ہے جو تاریخ فخرالدین مبارک شاہ کے نام سے طبع بھی ہو گئی ہے۔ فخر مدبر کی دوسری اہم کتاب آداب الحرب ہے جو فارسی زبان میں فنون جنگ پر بہترین کتاب ہے۔ اور التمش کے نام پر لکھی گئی۔

(2) اسی زمانے میں سندھ کے گورنر ناصرالدین قباچہ کے زیر حکومت ملتان اور اچہ کی علمی محفلیں بھی رونق پر تھیں۔ مولنا منہاج سراج مصنف طبقات ناصری اور سعید الدین محمد عوفی جو ناصر الدین قباچہ کی شکست و وفات کے بعد شمس الدین التمش کے پاس دہلی گئے۔ پہلے قباچہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عوفی نے فارسی شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ دربار قباچہ میں تصنیف کر کے قباچہ کا نام زندہ جاوید کر دیا۔ قباچہ کے عہد حکومت میں ہی اچہ کے ایک اہل قلم نے سندھ کی پہلی تاریخ چچ نامہ ایک قدیم عربی کتاب سے ترجمہ کی۔ قباچہ کا وزیر عین الملک الشعری ادب کا بڑا قدردان تھا۔ عوفی اسے نظام الملک اور اسمٰعیل عباد کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔ اس کی معارف نوازی کی وجہ سے دربار میں علما اور فضلا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ 1227ء میں التمش نے قباچہ کو شکست دے کر سندھ کی خود مختار حکومت کا خاتمہ کیا اور اس کے ساتھ اچہ اور ملتان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

(3) سلطان قطب الدین ایبک کے عہد حکومت میں ہی کئی قابل ذکر اہل قلم ہندوستان آ گئے تھے لیکن سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں اس میں بہت اضافہ ہوا اور اس کی ایک وجہ چنگیزی تھا۔ جس کے ڈر سے ترکستان، ایران اور افغانستان کے کئی امرا و علما اپنے وطن عزیز سے ہجرت کر گئے۔ اور چونکہ اس طوفان کے مقابلے میں خطہ ہندو و پاکستان اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملجاد ماوے تھا اس لئے وہ کثرت سے اس سرزمین میں تشریف لائے۔

تاریخ فیروز شاہی کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ شمس الدین التمش نے نہ صرف بیرون ہند کے علما کی قدردانی کی بلکہ وہ بیرون ہندوستان سے اچھی اچھی کتابیں بھی منگواتا تھا اور اس ملک کے علمی خزائن کو مالا مال کرتا تھا۔

سلطان التمش کے عہد میں نہ صرف آداب السلاطین اور ماثر السلاطین جیسی کتابیں باہر سے منگائی گئیں بلکہ ہندوستان میں بھی کئی بلند پایہ کتب تصنیف یا ترجمہ ہوئیں۔ ایک معرکتہ کتاب آداب الحرب تھی جو سلطان شمس الدین کے نام پر تاریخ مبارک شاہ کے مصنف نے لکھی۔ عہد شمسی کا ایک اور فاضل موید جر جای تھا۔ جس نے بادشاہ وقت کے نام پر حجتہ الاسلام امام غزالیؒ کی احیا علوم الدین کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ التمش کا بیٹا رکن الدین فیروز ایک ناکام بادشاہ تھا، لیکن علم و ادب میں اس نے بھی دلچسپی لی اور امام رازی کی تالیف سر مکتوم کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔

التمش کے عہد میں کئی شاعر اور ادیب تھے۔ ایک شاعر تاج الدین تھا جو اپنی کوتاہ قامتی

Marfat.com

کی وجہ سے ریزہ یا سنگریزہ کہلاتا تھا۔ وہ سلطان شمس الدین اور اس کے جانشین سلطان رکن الدین کے عہد میں دبیر الملک کے جلیل القدر منصب پر مامور تھا۔ اور اس نے مختلف قلعوں کی تسخیریا اس طرح کے دوسرے موقعوں پر بادشاہ کی تعریف میں قصیدے لکھے۔

عہد شمسی کا ایک اور شاعر روحانی تھا۔ اس کا وطن بخارا تھا۔ لیکن جب یہ شہر چنگیز خاں کے ہاتھوں برباد ہوا تو وہ ہندوستان آگیا اور سلطان شمس الدی کے خوان نعمت سے فیضیاب ہوا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی شعرا عہد شمسی میں موجود تھے۔ ایک شاعر ناصری تھا۔ جس کے ایک قصیدے کا ذکر فوائد الفواد دوسرا شاعر بہاء الدین علی تھا جو صدر کے عہدے پر مامور تھا۔ اور پھر ترقی کرتا کرتا بڑے مدارج پر پہنچ گیا۔ وہ ایک کامیاب سپاہی تھا' اور خوش طبع شاعر بھی۔

تیسرا شاعر استاد الشعرا شہاب مہمرہ تھا۔ جسے آج کل بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن جس کی اپنے زمانے میں اتنی شہرت تھی کہ امیر خسرو اپنے اشعار میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس طرح مرزا غالب اپنے اشعار میں میر تقی میر کا۔

اس دور کے کئی شعرا مہمرہ کے شاگرد تھے۔ اور مشہور شاعر عمید بھی ان میں شامل تھا۔

(4) یہ شعرا اور ادبا تو وہ تھے' جو زیادہ تر دربار شاہی یا سلطنت کے کاروبار سے وابستہ تھے۔ لیکن ابتدا سے ہی ہندوستان میں فارسی ادب کی ایک ایسی شاخ نشوونما پانے لگی جس کی آبیاری بادشاہوں کی سرپرستی سے نہیں بلکہ اہل اللہ کی مسیحا نفسی سے ہوتی تھی۔ ہندوستان میں قدیم صوفیہ نے نہ صرف اشاعت اسلام کا کام اپنے ذمہ لیا بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی سب سے آگے تھے۔ ان کی اکثر تصنیفات کی قدر و قیمت آج اس وجہ سے کم ہو گئی ہے کہ حقیقت و معرفت کے جن مسائل کو انھوں نے اپنا موضوع قلم بنایا تھا۔ ان سے عہد حاضر کی مادی دنیا کی بہت دلچسپی نہیں۔ لیکن ان تصانیف کی دلچسپی ادب اور مذہب کے مورخ کے لئے برقرار ہے۔ ہندوستان میں شاید فارسی نثر کی سب سے پہلی تصنیف حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کی کشف المحجوب تھی اور اس کے بعد صوفیہ تصانیف کا یہ سلسلہ برقرار رہا۔

(5) سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد چند روز سلطان رکن الدین اور پھر رضیہ سلطانہ نے حکومت کی۔ اس کے بعد سلطان ناصر الدین محمود ابن سلطان الدین تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے کا ایک مشہور شاعر اور شعرا کا سرپرست شمس الدین دبیر تھا۔ جسے حضرت سلطان المشائخ کے استاد ہونے کا فخر حاصل ہے اور جو دبیری' منشی گری' ندیمی' ملکی کے مراتب طے کر کے ایک زمانے میں "مستوفی ممالک ہندوستان" (یعنی وزیر خزانہ) ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک اور شاعر عمید تھا جس کا پورا نام ملک الکلام امیر فخر الدین عمید سنامی تھا۔ وہ ہندوستان کے تمام صوبوں کا دیوان ہو گیا تھا۔ اس کے اشعار میں گرمی اور زور اور صفائی زیادہ ہے۔

عہد علائی میں علم ادب :

Marfat.com

خاندان خلجیہ کی کل مدت حکومت سال سے بھی کم تھی۔ لیکن جس طرح اس زمانے میں اسلامی حکومت کو انتہائی توسیع نصیب ہوئی۔ اسی طرح دور مغلیہ سے پہلے علم و ادب کو بھی سب سے زیادہ رونق انھی ایام میں تھی۔

دور خلجی کا پہلا بادشاہ (جلال الدین) خود شاعر تھا اور اسے شعروشاعری سے بڑی دلچسپی تھی بلکہ اس کے مخالفین کہا کرتے تھے کہ بادشاہ کو شعروشطرنج کے سوا کسی اور چیز سے رغبت نہیں اور اب وہ بادشاہت کے قابل نہیں رہا۔ ہندوستان کے اس پہلے شاعر بادشاہ کے کئی اشعار کتب تواریخ میں درج ہیں۔

سلطان جلال الدین کے بعد علاء الدین تخت نشین ہوا۔ وہ جابر اور خشک قسم کا دنیا دار بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے دربار سے شعر خوانی اور رقص و سرود کا سلسلہ اٹھا دیا۔ اس سے پہلے امیر خسرو کو مصحف داری کی خدمت سپرد تھی۔ لیکن یہ خدمت برائے نام تھی اور عطیہ شاہی کے لئے بہانہ۔ امیرفی الحقیقت "ملک الندما" تھے اور ان کا کام شاہی مجلسوں کو اپنے اشعار سے گرم کرنا تھا۔

علاء الدین نے برسر حکومت ہو کر حکم دیا کہ ہر ایک شخص اپنے فرائض پوری طرح ادا کرے اور معینہ خدمات بجا لائے۔ امیر خسرو بھی اس سے مستثنٰی نہ تھے۔ بادشاہ کی شعروسخن میں اس قدر دلچسپی تھی' لیکن خدا کی شان ہے کہ علم و ادب کی ترقی کے لحاظ سے یہ زمانہ عہد اکبری کا صحیح پیش رو ہے۔ امیر خسرو کا مشہور خمسہ اسی دور میں لکھا گیا اور امیر خسرو کے علاوہ امیر حسن اور ضیاء الدین برنی اس زمانے میں زندہ تھے۔

اسی طرح کئی شاعر اور مورخین تھے' جن کی تصانیف کا اب کچھ پتا نہیں چلتا مثلاً" کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی برنی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ عہد علائی میں بلکہ اس سے پہلے بھی دہلی میں کثرت سے اہل قلم موجود تھے۔ لیکن ہم اب ان کی تصنیفات اور احوال زندگی سے ناواقف ہیں۔ ہماری ابتدائی ادبی زندگی کا یہ افسوس ناک واقعہ ہے کہ اس عہد کے بیشتر کارناموں کو زمانے کی دستبرد نے صفحہ ہستی سے محو کر دیا۔ صرف صوفیہ کے تذکروں' بعض تاریخی کتب اور امیر خسرو کی تصنیفات کے ساتھ مروت کا سلوک ہوا ہے۔ اور ان سے ہم محروم نہیں رہے' لیکن شعروادب اور کتب تاریخ کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا۔

شعرا اور ادبا کے علاوہ برنی کا بیان ہے کہ عہد علائی میں مذہبی عالم بھی کثرت سے تھے۔ برنی نے کوئی چھیالیس علما کے نام گنائے ہیں۔ ان میں شاید ایک کی بھی کوئی علمی یادگار اس وقت نہیں۔ اور فی الحقیقت یہ بزرگ معلمین اور مدرسین کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عہد علائی میں حضرت سلطان المشائخ امیرخسرو' امیر حسن اور خود برنی کی موجودگی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علم و فضل کا معیار بہت بلند ہو گا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس زمانے کے حالات دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ عام علم دوستی اور اہل علم کی کثرت کے باوجود' فن طباعت کے رائج

Marfat.com

نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی کثرت نہ تھی اور صحت علمی اور تحقیقات کو بدرجہ کمال تک پہنچانا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اعتقاد و محبت کا زور تھا۔ تنقیدی نقطۂ نظر ابھی عام نہ ہو تھا۔ جو لوگ عبید منطقی کی طرح معقولات کے قائل تھے، وہ تخریبی کوششوں یا خیالی بوالعجبیوں میں گرفتار تھے اور عوام ہر بات پر آمنا صدقنا کہتے تھے. محدثوں کا طریقہ جس کے مطابق روایات کو کڑے تنقیدی نقطۂ نظر سے پرکھتے تھے۔ ابھی تک مذہبی حلقوں میں عام نہ ہو تھا۔

علما و مشائخ کے ضمن میں خواجہ ضیاء الدین سنامی کا ذکر یہاں ضروری ہے جو نصاب الاحتساب کے مصنف تھے اور شدت سے احکام شرعی پر عامل تھے اس زمانے کی ایک اور برگزیدہ ہستی جسے حضرت سلطان المشائخ کی روحانی عظمت نے مسخر کیا امیر حسن سجزی تھے۔ وہ امیر خسرو کی طرح شاعر تھے اور دونوں میں کمال دوستی تھی۔

آپ کی سب سے مشہور تالیف فواید القواد ہے جس میں آپ نے اپنے مرشد کے ملفوظات قلم بند کیے۔ جتنی شہرت اس کتاب کو ہوئی ہے۔ اسلامی ہندوپاک کے کسی ملفوظات کے مجموعے کو نصیب نہیں ہوئی۔ امیر حسن کا فارسی دیوان حیدر آباد دکن میں چھپ چکا ہے۔

عہد خاندان تغلق میں علم و ادب :

خاندان تغلق کا پہلا بادشاہ سلطان غیاث الدین تغلق تھا۔ اسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔ اور اس کے زمانے کے مشہور اہل قلم وہی تھے، جن کا ذکر ہم عہد علائی کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اس کی بے وقت وفات کے بعد محمد بن تغلق جانشین ہوا۔

شیخ عبدالحق محدث محمد تغلق کے زمانے میں علماء فضلا کی کمی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اس زمانے کی کئی ہستیاں قابل ذکر ہیں۔ مثلاً "ضیاء الدین برنی، ابن بطوطہ سیاح۔ ظہرالدین جو فن تعمیر کا ماہر تھا، شہاب الدین ابوالعباس احمد، جو فن خطابت میں بے نظیر تھا۔ مشہور ترین شاعر اور ملک الشعرا بدرچاچ تھا۔ وہ چاچ یعنی تاشقند کا رہنے والا تھا۔ سلطان نے اس کی بڑی قدر کی اور "فخرالزمان" کا خطاب دیا۔

سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا۔ اس نے ایک لازوال سفرنامہ تحریر کیا۔ اس زمانے ایک مشہور عالم مولانا معین الدین عمرانی تھے جنھوں نے کنز، منار، حسامی، تلخیص اور مفتاح پر حواشی لکھے۔

مولنا معین الدین عمرانی سے بھی زیادہ پائدار شہرت بدایوں کے ضیا نخشی کو نصیب ہوئی ہے۔ اپنی زندگی تو انھوں نے عزلت نشینی میں بسر کی، لیکن انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ جن میں بعض اب بھی رائج ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے گلریز رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے زیر اہتمام چھپی ہے۔ ایک اور مشہور تصنیف سلک السلوک ہے جس کا اردو ترجمہ اللہ والوں کی قومی دکان (لاہور) نے شائع کیا ہے اور اصل فارسی بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

Marfat.com

سلک السلوک سے بھی زیادہ شہرت طوطی نامہ نے حاصل کی' جس میں ایک طوطے کی زبانی باون کہانیاں سنسکرت سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ضیا کے طوطی نامہ کے ترکی' جرمن' انگریزی اور دکنی میں ترجمے ہوئے۔ اردو نثر کی کتاب طوطا کہانی' جسے حید بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر گراسٹ کی فرمائش پر مرتب کیا۔ اسی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔

مولنا ضیاء الدین نخشی شاعر بھی تھے۔ اور فن شعر میں بدایوں کے مشہور استاد شہاب الدین مہمرہ کے شاگرد تھے۔

سلطان محمد تغلق کا ایک اور ہمعصر اس زمانے کا بہترین مورخ ضیاء الدین برنی تھا' جس کی تاریخ فیروز شاہی اس زمانے کے حالات کا بیش قیمت خزانہ ہے۔

تاریخ فیروز شاہی اصل میں طبقات ناصری کا تکملہ ہے۔ اور اس میں سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی جلوس (664ھ) سے سلطان فیروز شاہ کے چھٹے سال جلوس (757ھ) تک کے واقعات ہیں۔ برنی منہاج کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپ واقعات کا بیان کرتا ہے۔ اور اس کا طرز تحریر بھی زیادہ شگفتہ ہے۔ اس لئے تاریخ فیروز شاہی طبقات ناصری کی نسبت زیادہ مقبول ہے۔

اس عہد کا ایک اور مورخ عصامی ہے' جس نے سلطان محمد بن تغلق کے آخری سال حکومت (1350ء) میں 12 ہزار شعر کی ایک مثنوی فتوح السلاطین لکھی۔ اس میں غزنویوں' غوریوں' خاندان غلاماں' خاندان خلجی اور خاندان تغلق کے (پہلے دو) بادشاہوں کی فتوحات اور واقعات زندگی نظم کئے ہیں۔

مشہور لغات قاموس کے مصنف مولنا مجدالدین فیروز آبادی اسی زمانے میں ہندوستان آئے۔ عہد فیروز شاہی کے تین اور قابل ذکر بزرگ مولنا احمد تھانیسری قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے استاد مولنا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر دہلوی تھے۔ مشائخ میں سب سے زیادہ مشہور مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ تھے۔ سلطان محمد بن تغلق نے ان کی بڑی بے ادبی کی تھی' لیکن فیروز شاہ نے ان کی قدر و منزلت کی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں علم و ادب کو بڑا فروغ ہوا۔ افسوس ہے کہ اس کی وفات کے بعد حکومت کو زوال آگیا۔ اور اس بدامنی کی وجہ سے جو حملہ تیمور کے دوران میں رونما ہوئی بہت سے اہل علم دہلی سے منتشر ہو گئے۔ اور اس زمانے کے علمی و ادبی حالات کہیں مرتب نہ ہوئے' لیکن معاصرانہ تذکروں اور اخبارالاخیار اور بدایونی میں جو منتشر اشارات ملتے ہیں' ان سے خیال ہوتا ہے کہ علم و فضل میں یہ زمانہ عہد علائی سے کم نہ تھا۔

اس زمانے میں کئی قابل ذکر شاعر تھے۔ ایک مسعود بک تھے' جن کو اقارب فیروز شاہ سے بتایا جاتا ہے۔ اور جن کا دیوان حیدر آباد دکن میں چھپ چکا ہے۔ ان کا اصل نام شیر خاں تھا۔ مسعود بک غالباً" خطاب تھا

دوسرا حمید قلندر تھا۔ جس نے حضرت چراغ دہلیؒ کے ملفوظات (خیرالمجالس) مرتب کئے۔

Marfat.com

تیسرا قابل ذکر شاعر ظہیر دہلوی تھا۔ جو صاحب دیوان تھا۔ اور جس کے بعض قصائد کا انتخاب بدایونی نے درج کتاب کیا ہے۔ امیر خسرو کے صاحبزادے امیر احمد بھی ایک خوش مذاق شاعر مانے جاتے تھے۔ انھی ایام میں ایک طبیب شہابی نے ایک مثنوی طب شہابی کے نام سے لکھی۔ لیکن اس زمانے کا بہترین شاعر مطہر تھا' وہ کڑہ (حوالہ آباد سے 40 میل شمال مغرب کو قدیم زمانے میں صوبے کا دارالحکومت تھا) کا رہنے والا تھا اور فیروز شاہ اور اس کے امرا سے عہد کا مداح تھا۔ اس کے ممدوحوں میں ایک امیر ملک الشرق ملک عین الملک تھا' جس کی انشا سے ماہر و مشہور ہے۔ مطہر خود ایک عالم تھا۔ اور اس کا نصاب' نصیب اخوان جو 776ھ میں تالیف ہوا' ہندوستان میں بہت مقبول رہا ہے۔

شعروشاعری کے علاوہ فقہ نے اس زمانے میں بڑا فروغ پایا۔ علاء الدین خلجی کو مذہبی علوم سے دلچسپی نہ تھی۔ اور اس کے زمانے میں اہل شرع کو کوئی قدرومنزلت حاصل نہ ہوئی' لیکن جب سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو شرع اور اہل شرع کو نیا وقار حاصل ہوا۔

اس کے بعد فقہی علوم اور ترویج شرع پر زیادہ توجہ ہوتی گئی۔ اور عہد فیروزی میں کئی قابل ذکر فقہی تصانیف کے نام ملتے ہیں۔ ہندوستانی فقہ کی قدیم کتابوں میں فقہ فیروز شاہی بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ کے ایک امیر خان اعظم تا تار خاں نے جس کی وفات 1251ء کے چند سال بعد ہوئی' علوم دینیہ میں دو مبسوط کتابیں مدون کرائیں۔ ان میں سے ایک تفسیر ہے۔ ''دوسری فقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں فقہ کے ہزار ہا مسائل فقہا کے اختلافات اور ہر مسئلہ کی نسبت ان کے فتاوے جمع ہیں۔

فیروز شاہ کے زمانے کا ایک اور قابل ذکر واقعہ سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس زمانے کی ایک دل چسپ کتاب فتوحات فیروز شاہی ہے' جس میں خود بادشاہ نے اپنے کارنامے گنائے ہیں۔ یہ کتاب تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہم ہے۔

سادات اور لودھی عہد میں علم و ادب :

علم و ادب کے حوالے سے سادات اور لودھی عہد کو ''تاریک عہد'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔

(1) سکندر لودھی کے زمانے میں ملتان کے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ دہلی تشریف لائے۔ انھوں نے درس و تدریس کے معیار کو بہت بلند کیا۔ انھوں نے قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم داخل نصاب کیں اور بہت جلد یہ کتابیں مقبول عام ہو گئیں۔

(2) سکندر لودھی کے زمانے میں مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز سے دہلی تشریف لائے۔ انھوں نے آگرے میں مدتوں درس حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔

(3) عہد سکندری کی ایک نہایت دل چسپ تصنیف معدن الشفا یا طب سکندری ہے۔

Marfat.com

اس کا مصنف بھوہ امرائے سکندری میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے علم طب پر بھی پانچ سو صفحوں کی کتاب تالیف کی' جس میں ایک ہزار ایک سات امراض اور ان کے لئے مناسب ادویہ کا ذکر تھا۔

(4) سکندر خود شاعر تھا اور گلرخی تخلص کرتا تھا۔ عہد سکندری میں سب سے اہم ادبی شخصیت شیخ جمالی کی ہے۔ ان کا اصلی نام جلال خاں تھا۔ شروع میں نام کی رعایت سے جلالی تخلص کرتے تھے۔ شیخ کی تصانیف میں ایک اولیا تذکرہ بعد العارفین ہے۔ اس میں حضرت خواجہ اجمیری سے اپنے مرشد مولانا سماء الدین تک مشاہیر مشائخ کے حالات دیئے ہیں۔ جمالی نے اہل تبریز کی فرمائش پر شیرازی عہد اور شہزادہ ماہ کی داستان محبت نظم کی ہے۔

Marfat.com

باب 15

سلاطین کا نظام تعلیم

(SYSTEM OF EDUCATION)

1- **محمود غزنوی** : محمود غزنوی کا دور حکومت 997ء میں شروع ہوا اور 1030ء میں اس کے انتقال پر ختم ہوا۔ اس نے پاکستان کے شمالی حصے یعنی سرحد اور پنجاب کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ یہ بڑا رحم دل اور منصف مزاج حکمران تھا۔ راجپوتوں کو انکی بہادری کی وجہ سے بہت پسند کرتا تھا۔ اس کے دفتروں میں ہزاروں ہندو بطور ترجمان کے ملازم تھے جن میں تلک بھی تھا جو بعد میں محمود کی راجپوت فوج کا جو غزنی میں مقیم تھی سپہ سالار بنا۔

محمود علم دفن کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے غزنی میں ایک یونیورسٹی (مدرسہ) قائم کی تھی جس کا ڈائریکٹر مشہور سائنسدان عنصری تھا۔ اس ادراہ میں طلباء کو تعلیم طعام اور قیام کی سہولتیں مفت مہیا کی گئی تھیں۔

محمود کے دور حکومت میں عظیم سائنسدان' اور مورخ ابوریحان محمود بن احمد البیرونی ہندوستان آئے جن حالات میں البیرونی ہندوستان آئے وہ خوشگور نہیں تھے۔ وہ خوارزم کے حکمران کا (جو محمود کا قریبی عزیز تھا) وزیر تھا۔ خوارزم کی شکست کے بعد اس خاندان کے شہزادگان مع البیرونی ہندوستان میں نظر بند کر دیئے گئے۔ لیکن ایک عظیم سائنسدان ہونے کی وجہ سے البیرونی کو نظربندی میں بھی کافی آزادی حاصل تھی جس کا اس نے بہت اچھا استعمال کیا اس نے سنسکرت سیکھی اور ہندوؤں کی تہذیب اور علوم پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب الہند" ہے۔

البیرونی نے جن علوم پر تحقیقی کام کئے ان میں فلکیات' ریاضیات' تاریخ' ریاضیاتی جغرافیہ' طبیعات' کیمیا' اور علم عدنیات شامل تھے۔ اس کا خیال تھا کسی زمانے میں برصغیر کا پورا خطہ زیر آب تھا۔

محمود کے بعد اس کا لڑکا مسعود اور اس کے جانشین اپنی علم دوستی کے لئے مشہور تھے۔ البیرونی کی کتاب قانون مسعودی اس کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔ غزنوی دور کے آخری حصے میں غزنوی کی حکومت پنجاب تک محدود ہو کر رہ گئی تھی لہاور (موجودہ لاہور) ان کا پایہ تخت تھا۔

2- **محمد بن سام** : 1186ء تک محمد بن سام (المعروف بہ شہاب الدین غوری) نے غزنویوں کو لاہور ملتان اور اچھ سے نکال کر انہیں اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ خواجہ معین

Marfat.com

الدین چشتیؒ اسی کے دور حکومت میں ہندستان آئے اور اجمیر میں قیام کیا۔ محمد بن سام نے اجمیر پر قبضہ کر کے وہاں دو مدرسے قائم کیے۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس نے اپنے غلاموں کو بہت اچھی تعلیم دلوائی جن میں سے چار اس کے انتقال کے بعد مختلف حصوں کے حکمران ہوئے۔

3- **غلام حکمران اور تعلیم** : تقریباً تمام غلام حکمرانوں نے اچھی تعلیم پائی تھی ان کے دور حکومت میں بے شمار مسجدیں تعمیر ہوئیں' جن کے ساتھ کتب اور مدرسے تھے۔ ناصر الدین محمود ایک درویش صفت حکمران تھا' وہ کلام پاک لکھ کر اس کی آمدن سے اپنے اخراجات پورے کرتا۔ ہر عالم جو اس کے دربار میں پہونچتا اسے اس کے علم کے لحاظ سے وظیفہ دیا جاتا۔

غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ملک میں بہت سی علمی و ادبی سوسائٹیاں قائم ہو گئی تھیں کیونکہ اس کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد نے ایک علمی و ادبی سوسائٹی دلی میں قائم کی تھی جس کی نشستیں اس کے محل میں ہوتیں' مشہور صوفی بزرگ امیر خسرو دہلوی ان مجالس کی صدارت کرتے بلبن کا دوسرا لڑکا بغرا خان رقص و سرور کا بہت شائق تھا' اس کے محل میں ان فنون کے ماہرین کے جلسے ہوتے۔ اس زمانے میں دلی میں علمی و ادبی ذوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ امیر خسرو کے قول کے مطابق دلی رشک بخارا بن گیا تھا۔

4- **خلجیوں کے عہد میں تعلیم** : جلال الدین خلجی علمی و ادبی ذوق کا انسان تھا' علما کی صحبت میں بیٹھا کرتا۔ اس نے امیر خسرو کو اپنی لائبریری کا ناظم مقرر کیا تھا' اس کے عہد حکومت کا افسوسناک واقعہ سید مولا کا قتل ہے۔ جو ایک عالم اور بزرگ انسان تھے۔ جلال الدین کو ان پر شبہ تھا کہ وہ اس کی حکومت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے چند روز بعد جلال الدین کو خود اس کے بھتیجے نے قتل کر دیا۔

برصغیر کی اسلامی عہد کی تاریخ میں علاؤ الدین خلجی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں میں وہ پہلا اور آخری ان پڑھ حکمران تھا۔ اس نے نظام حکومت میں اصلاحات کے سلسلے میں تمام جاگیروں پر قبضہ کر لیا۔ جن میں تعلیمی اداروں کے اوقاف بھی شامل تھے جس سے مکتبوں اور مدرسوں کو کوئی نقصان اٹھانا پڑا۔

شراب کے نشے میں امرا حکومت کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیتے تھے۔ اس لئے علاؤ الدین نے شراب پینے کی سختی سے ممانعت کر دی۔ اپنی فوجوں کی ضرورت سے اس نے بازاری اشیاء پر کنٹرول لگا دیا جس سے تمام چیزیں سستی ہو گئیں۔ جس سے عوام کو بڑی آسودگی حاصل ہوئی' اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے کام میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے زمانے میں دلی میں جتنے تعلیم یافتہ افراد اور علماء تھے اتنے اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔

علاؤ الدین کو ہر وقت تعلیم یافتہ وزراء اور افسروں ہی سے کام پڑتا جس کی وجہ سے اسے

Marfat.com

اپنے جاہل ہونے کا احساس ہر وقت ستاتا رہتا' چنانچہ اس نے پوشیدہ طور پر تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور جلد ہی فارسی زبان پر مہارت حاصل کر لی۔ اس کے بعد اس کا رویہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ بہتر ہو گیا۔

علاؤ الدین کا جانشین قطب الدین مبارک شاہ ایک عیاش حکمران تھا لیکن اس نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ تمام جاگیریں واپس کر دیں جس کی وجہ سے تعلیمی اداروں اور علماء کی آمدنی کے ذرائع انہیں واپس مل گئے۔

5- **تغلقوں کے عہد میں تعلیم** : سلطان غیاث الدین تغلق خود تعلیم یافتہ تھا اور علماء و فضلا کی صحبت کا بھی شائق تھا۔ اس نے علماء کو فیاضانہ وظائف دیئے۔ محمد تغلق "فصیح البیان تھا' اور عربی اور فارسی' منطق' فلسفہ اور ریاضیات میں اسے فضیلت حاصل تھی شراب سے گریزاں تھا جس نے دلی کے کتنے حکمرانوں کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ پاک زندگی بسر کرتا تھا۔ اور بہادری میں مشہور تھا۔" تاریخ کی کتابیں پڑھنے کا اسے شوق تھا' اس کا ذہن اتنا تیز تھا کہ تاریخ کی ہر بات ان کے واقع ہونے کی تاریخ کے ساتھ اس کو یاد رہتی تھی۔ اس کا ادبی ذوق اور علماء کے ساتھ اس کی دریا دلی غیر ملکوں سے بہت سے علماء کو اس کے دربار کھینچ لائی تھی۔ ابن بطوطہ اور ضیا الدین برنی دو مشہور مورخ اس کے دربار میں تھے۔ محمد تغلق ایک اچھا مصنف بھی تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی سوانح عمری بھی لکھی تھی جو ضائع ہو گئی۔

محمد تغلق نے دولت آباد میں ایک نیا دارالحکومت تعمیر کیا' لیکن اس کے حالات میں کہیں کسی مدرسے کا ذکر نہیں ملتا اس کے باوجود مورخوں کا خیال ہے کہ اس نے ضرور مدرسے بنوائے ہونگے۔

فیروز تغلق کا عہد اپنی اصلاحات' آباد کاری اور تعلیمی اقدامات کے لئے مشہور ہے۔ ہر سال اس کے خزانے سے علماء کی ایک بڑی تعداد کو پنشن ملتی تھی۔ اس نے بہت سے کالج قائم کئے تھے۔ جن کی تعداد فرشتہ تیس بتاتا ہے اس کے علاوہ اس نے پرانے مدرسوں کی مرمت کرا کے انھیں پھر سے جاری کیا۔ غلاموں کو صنعت و حرفت کی تعلیم دینے کا اسے خاص طور سے شوق تھا۔ تقریباً بارہ ہزار غلام شاہی کارخانوں میں کام کرتے تھے اور تقریباً اٹھارہ ہزار زیر تربیت تھے۔ اس کام پر خزانہ سے ایک بڑی رقم خرچ کی جاتی تھی اور اس کے انتظام کے لئے وزیر اعظم کی نگرانی میں ایک علیحدہ محکمہ قائم تھا۔ وہ اپنی سوانح عمری فتوحات فیروز شاہی کا مصنف بھی بتایا جاتا ہے۔

6- **سیدوں کے زمانے میں تعلیمی حالت** : تیمور نے ملک کو اس قدر تباہ کر دیا تھا کہ سید نہ تو ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کر سکے اور نہ علم و فن کی سرپرستی کے لئے وقت نکال سکے۔ علاؤ الدین عالم شاہ نے بہر حال بدایوں میں علم و فن کی سرپرستی کر کے اسے علم و فن

Marfat.com

کا مرکز بنا دیا تھا۔

7- **لودھیوں کے زمانے میں تعلیم** : بہلول لودھی کا سارا وقت حکومت کو مضبوط بنانے اور دلی کے اقتدار اعلیٰ کو دوبارہ قائم کرنے میں گزر گیا۔ لیکن وہ خود تعلیم یافتہ تھا۔ علماء کی سرپرستی کرتا تھا' اس نے بہت سے مدرسے بھی قائم کئے تھے۔

سلطان سکندر لودھی نے اچھی تعلیم پائی تھی۔ وہ خود شاعر تھا اور علما کا قدر دان۔ اس نے اپنا دارالسلطنت دلی سے آگرے منتقل کر دیا۔ یہاں اس نے علماء کی حتی الامکان قدر افزائی کی تاکہ وہ اس کے نئے دارالحکومت میں آئیں۔ اس کی علم دوستی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو گا کہ اس نے ایک حکم کے ذریعہ فوجیوں کا تعلیم یافتہ ہونا لازمی قرار دیدیا تھا۔ اس حکم سے سماج کے نچلے طبقوں میں تعلیم کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا۔

اس کے حکم سے کئی کتابیں فارسی میں تالیف و ترجمہ کی گئیں۔ ایران سے درآمد کردہ بہت سی طبی کتابوں کی مدد سے طب کی ایک نئی کتاب تیار کی گئی جس کا نام طب سکندری رکھا گیا۔

فرشتہ نے لکھا ہے کہ سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے بڑی تعداد میں فارسی پڑھنی شروع کی تھی۔ (غالباً" فوجی قانون کے تحت) جس سے ایک نئی زبان اردو وجود میں آگئی۔

نظام تعلیم :

عہد سلاطین میں ہندوستان کے اندر تعلیم حاصل کرنے کے تین بڑے ذریعے تھے۔

(i) مکتب و مدرسے
(ii) مساجد اور خانقاہیں
(iii) نجی طور پر گھروں میں

ان میں سے ایک ذریعہ سے مندرجہ ذیل منزلوں کی علی الترتیب تعلیم ہوتی تھی۔

(i) اعلیٰ تعلیم :

جس میں گریجویٹ یا گریجویٹ کے بعد کی تعلیم شامل ہوتی۔

(ii) ثانوی تعلیم :

جو آج کل کے گرامر سکولوں' ہائی سکولوں اور پرائیویٹ اکیڈیمی میں ہوتی تھی۔

(iii) ابتدائی تعلیم :

جس میں ابتدائی معلومات شامل ہوتی ہیں۔

(iv) غیر رسمی اور بے ضابطہ طریقے :

Marfat.com

تعلیم کا مقصد دوسرے غیر رسمی اور بے ضابطہ طریقوں سے بھی پورا ہو جاتا تھا۔ جس کا علم کی اشاعت میں کچھ کم حصہ نہ تھا۔

(i) **اعلیٰ تعلیم** : مسلمانوں کے عہد حکومت میں اعلیٰ تعلیم کے متعلق "Imperial Gazetteer India Vol-4" میں حسب ذیل بیان ملتا ہے۔

"پہلے زمانہ میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم بڑے لائق لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو نوجوانوں کی تعلیم پر بڑی محنت اور توجہ صرف کرتے تھے۔ مسجدوں اور مقبروں سے ملحق مدرسے ہوا کرتے تھے۔ جنہیں حکومت نقد یا جاگیر کی صورت میں مدد دیتی تھی یا پھر وہ نجی امداد سے چلتے تھے۔ لائق اساتذہ کو بھی حکومت کی طرف سے امداد ملتی اور بڑے بڑے صاحب جائداد اور امراء مشہور علما کی امداد اور خدمت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ ہندوستان کے متعدد قصبے اور شہر مثلاً "گوپامئو اور خیر آباد اور اودھ میں اور جونپور صوبہ آگرہ میں مختلف وقتوں میں علم و فن کے بڑے مرکز رہے ہیں جہاں ہندوستان کے تمام حصوں بلکہ افغانستان اور بخارا تک سے طلباء مشہور اساتذہ کے درس میں شرکت کے لئے آتے تھے---- لائق اساتذہ کے حلقہ درس نے بعد میں جدید قسم کے مدرسوں اور کالجوں کی شکل اختیار کر لی جو مقدس بزرگوں کی فیاضیوں سے قائم ہوتے۔"

(ii) **ثانوی تعلیم** : ثانوی تعلیم عموماً" مسجدوں اور خانقاہوں میں ہوتی تھی۔ خانقاہیں تمام ہندوستان میں موجود ہوتیں دراصل یہ درگاہیں ان بزرگوں کے مزارات ہوتے تھے جو اپنے علم و تقویٰ کی وجہ سے لوگوں میں بہت محترم اور مقدس ہوتے اور ان کے مرشد اور روحانی پیشوا سمجھے جاتے تھے ان میں بہت مشہور بزرگ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ ہیں جو غزنی سے تشریف لائے اور دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اور 1325ھ میں یہیں مدفون ہوئے۔ دوسروں بزرگ حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ جو حضرت نظام الدین اولیاؒ سے پہلے تشریف لائے تھے اور اجمیر میں مقیم ہوئے جہاں آپ نے 1265ھ میں وصال فرمایا اور اس وقت سے آپ کا مزار زیارت گاہ خواص و عوام ہے لہٰذا ہندوستان میں بہت سی مقدس ہستیوں نے اپنی زندگیوں میں خانقاہیں قائم کیں جس کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔ ان میں مذہب اور تصوف کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علم اور تقویٰ کے یہ مرکز ان مکتبوں اور مدرسوں کی تعلیمی کمی کو بڑی حد تک پورا کرتے تھے جو حکومت کی طرف سے قائم ہوتے تھے۔

(N.N.Law: Promotion of learning in India)

(iii) **ابتدائی تعلیم اور طریقہ تعلیم** : ابتدائی تعلیم، ابتدائی مدرسوں اور نجی طور پر

Marfat.com

گھروں پر دی جاتی تھی۔ تعلیم کا جو طریقہ رائج تھا۔ وہ بہت سیدھا سادا اور تقریباً وہی تھا جو آج رائج ہے۔ ایک طالب علم کو سب سے پہلے حروف تہجی (Alphabet) اور ان کا صحیح تلفظ (Pronunciation) گنتی اور حساب وغیرہ بھی سکھایا جاتا۔ حرف تہجی کے [illegible] چھوٹے جملے پڑھائے اور لکھائے جاتے۔ ہر روز [illegible] مشقیں [illegible] جاتیں [illegible] وہ پڑھنا اور [illegible] تختی پر لکھنا اور اس طرح وہ [illegible] اور لکھنا [illegible] ضروری وسائل پورے [illegible] تو [illegible] سکولوں اور کالجوں [illegible] علوم و فنون کی تحصیل کرتے

(iv) غیر رسمی اور سیدھا سادا طریقہ :

تعلیم کے [illegible] باضابطہ [illegible] طریقوں سے بھی پورا ہو جاتا تھا جس [illegible] کی اشاعت [illegible] کہ [illegible] پڑھ سکتے تھے، [illegible] تھے اور [illegible] بیٹھے تھے۔ اکثر [illegible] خطبہ دینے یا وعظ کرنے کی غرض سے [illegible] جاتے اور خطبہ اور وعظ کو [illegible] کرتے [illegible] تھا۔

مقاصد تعلیم :

سلاطین کے عہد میں تعلیم کا مقصد طلبہ کی مخفی صلاحیتوں کو ابھارنا ان کی [illegible] تربیت کرنا اور ان کی اخلاقی اور مادی ترقی کے لئے جو چیز ضروری ہے [illegible] دوسرے لفظوں میں سیرت کی تشکیل رہی ہے۔ تعلیم زندگی کی تیاری اور [illegible] آگلی زندگی کی تیاری کا نام تھا۔ چنانچہ مذہب تمام تعلیم کی بنیاد ہوتا تھا۔ طلبہ [illegible] بغیر کسی نسلی و مذہبی فرق و امتیاز کے ساتھ ساتھ تعلیم پاتے تھے اور نصاب میں مسلمانوں اور ہندوؤں' دونوں کا قومی ادب شامل ہوتا تھا۔

ذریعہ تعلیم :

ذریعہ تعلیم فارسی ہوتی تھی جو سرکاری زبان تھی اور عربی جو قرآن پاک کی زبان تھی' وہ ہر مسلمان کے لئے لازمی تھی۔ قرآن پاک ہمیشہ سے ابتدائی تعلیم رہا ہے جس کی مسلم بچے اور بچیاں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ طلباء التی پالتی مار کر فرش پر بیٹھتے اور اپنے استادوں سے سبق لیتے جو یا تو منبر پر بیٹھتا یا اپنے شاگردوں کے سامنے کھڑے ہو کر مختلف علوم و فنون میں درس دیتا۔

نصاب تعلیم :

Marfat.com

ابتدائی منزل میں نصاب تعلیم پڑھنے لکھنے اور معمولی حساب پر مشتمل ہوتا تھا اور ثانوی اور اعلیٰ منزلوں میں حسب ذیل مضامین شامل ہوتے تھے۔

اخلاقیات' آلہیات' علم ہیت (Astronomy) انتظام مملکت' حساب' الجبرا' علم ہندسہ' طبیعیات' طب' فلسفہ' خطابت' قانون' ارکان' عبادت' زراعت' معاشیات اور تاریخ۔ ہندو طلباء کے لئے ان کی اپنی مذہبی کتابیں ہوتیں جو ان کی اپنی تہذیب و روایات کے مطابق ہوتیں تھیں۔

ہندوستان کی تمام اسلامی درسگاہوں میں ایک نصاب ہی نہیں چلتا تھا لیکن پھر بھی اکثر مضامین آپس میں ملتے جلتے تھے۔ کوئی مضمون کسی کو زبردستی نہیں پڑھنا ہوتا تھا۔ بلکہ طالب علم کو خواہش کے مطابق ہوتی تھی جس کی وجہ سے طالب علم کا وقت اور صلاحیتیں بے کار ضائع نہیں ہوتیں تھی۔

مسلمانوں کے نصاب تعلیم میں جہاں تک ذہنی پہلو کا تعلق ہے' سائنس کی طرف بہ نسبت فلسفہ کے زیادہ توجہ رہی ہے لیکن انسان کی ذہنی ضرورتوں کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔

خوش نویسی اور خطاطی :

اس وقت خوش نویسی اور خطاطی کی بہت قدر ہوتی تھی اور خوش نویسی ایک شخص کے علمی کمالات کا ضروری جزو سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ فی زمانہ اس کی اتنی زیادہ قدر نہیں لیکن اس زمانے میں یہ ایک اہم فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں خطوط نویسی اور خوش نویسی دونوں کی بڑی قدر ہوتی تھی۔

فنون لطیفہ کی تعلیم :

اس دور میں صرف ادبی تعلیم پر ہی زور نہیں دیا جاتا تھا بلکہ ایسے فنون لطیفہ کی تحصیل مثلاً" مصوری' اور موسیقی خطاطی اور خوش نویسی کے لئے طلباء اپنے پسند کے اساتذہ کے گھروں پر جاتے اور ان سے ان فنون کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

صنعتی تعلیم :

صنعتی تعلیم یا کسی پیشہ یا ہنر کے سیکھنے کے لئے وہ کسی بڑے استاد یا ماہر فن کے ساتھ بطور امیدوار کے کام کرتے' ہزاروں کارخانے ہوتے تھے جہاں لڑکے اکثر ماہر کاریگروں کے ساتھ مخصوص کام سیکھنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

تجارت و کاروباری تعلیم :

جو لوگ تجارت یا کاروباری تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے' ان کے لئے تجارت اور کاروباری تعلیم کا بھی انتظام ہوتا تھا تاکہ وہ تجارت اور کاروبار کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ کاروباری طبقہ کے لوگوں کے اپنے الگ سکول ہوتے جن میں وہ اپنے بچوں کی لکھنے پڑھنے کی تعلیم کے

Marfat.com

ساتھ کاروبار اور حساب کتاب کی تعلیم (Accountancy) کا بھی انتظام کرتے تھے۔

امتحانات کا طریقہ :

امتحانات کے ضابطے قاعدے ایسے نہ تھے جن سے تعلیم کا مقصد ختم ہو جاتا ہو بلکہ تعلیم کو اپنی ذات کی ترقی کے لئے حاصل کیا جاتا تھا۔ امتحانات پاس کرنے کے لئے کسی وقت کی قید نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی بہت سے بے جا امتحانات ہوتے تھے۔

جو استاد پڑھاتا' وہی اپنی جماعت کا امتحان بھی لیتا اور کامیاب طلباء کو اگلی منزل میں ترقی دیتا۔ سند اور سرٹیفکیٹ کے علاوہ اچھے طلباء کو ان کی قابلیت کے اعتبار سے وظائف' انعامات اور تمغے وغیرہ بھی دیئے جاتے تھے۔ امتحانات کا یہ طریقہ بہت سیدھا سادہ' نمائشی کم اور کار آمد زیادہ ہوتا تھا۔

درباری امتحانات :

درباری امتحانات سے مراد درباری مقابلے ہیں جو بڑے بڑے درباروں کے لئے دلچسپی اور تفریح کا سامان فراہم کرتے تھے' وہ تعلیمی قدروقیمت سے خالی نہ ہوتے تھے۔ سلاطین اور امراء کی طرف سے جو بڑے بڑے انعامات اور بیش بہا خلعتیں عطا ہوتی تھیں' ان سے شعراء اور اہل علم کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی جو اپنے اپنے علمی کمالات میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

درباری مشاعروں میں مشہور شعراء سامعین کو اپنے کلام سے محفوظ کرتے۔ ان شاعروں میں شعراء کے کمال فن کا اصل امتحان ہوتا تھا جہاں ان کو سیم و زر میں تولا جاتا تو دوسری طرف شعر و سخن کی ترقی ہوتی تھی۔ سب سے بڑے شاعر کو ملک الشعراء کا خطاب ملتا جو ہر ایک کے لئے قابل رشک ہوتا۔

سزاؤں کا طریقہ :

جو سزائیں آج کل کے زمانے میں رائج ہیں ویسی سزائیں اس زمانہ کے طالب علم کو دی جاتیں۔ جو طالب علم مدرسے سے بھاگ جانے کے عادی ہوتے یا جرائم کے مرتکب ہوتے ان کے ہاتھوں پر بید لگتے تھے لیکن سب سے عام سزا "مرغا" بنانا ہوتی تھی۔ عام دستور کے مطابق استاد بچوں کو ہر قسم کی سزائیں دے سکتا تھا۔

Marfat.com

باب 16

سلاطین کا نظام عدلیہ

(SYSTEM OF JUDICIARY)

[illegible] کے ماتحت ہوتی تھی جو اس تمام عہد میں سلطنت کا قاضی [illegible] مرکز میں [illegible] پر بعد میں بحث کی جائے گی۔ پہلے یہ ضروری [illegible] سلطان بہ حیثیت نافذ قانون و سربراہ مملکت تین طرح [illegible] شہری کے ساتھ متعدد اعتبارات سے ہوتا تھا۔ وہ حاکمِ [illegible] ہوتا تھا۔ وہ عمالِ حکومت کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ افواج [illegible] وہ "دیوانِ قضا" کے ذریعے انصاف پروری کرتا تھا، دوسری حیثیت میں "دیوانِ مظالم" کے ذریعے اور تیسری حیثیت میں وہ خود یا اس کے اعلیٰ فوجی عہدہ دار فوجی عدالت کی حیثیت سے باغیوں کے مقدمات سنتے تھے، اگرچہ ان کے متعلق قانونِ فقہا سے فتویٰ لینا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ محمد بن تغلق کو، جس نے غالباً اتنے لوگوں کو [illegible] دہلی کے باقی اور سلاطین نے مجموعاً بھی اتنے آدمیوں کو سزائے موت نہ دی ہو گی، ایک علیحدہ محکمہ "دیوانِ سیاست" منظم کرنا پڑا تھا، کیوں کہ مقدمات کی تعداد اتنی کثیر ہو گئی تھی [illegible] فقہا کو اس خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ محمد بن تغلق نے کسی [illegible] کو اس وقت تک سزائے موت نہیں دی جب تک کہ فقہا کو اپنے دلائل سے مطمئن نہیں کر لیا۔ اگر تاریخ [illegible] اور کچھ کم عالم و فاضل ہوتا تو فقہا کے لئے کامیابی کا زیادہ موقع ہوتا۔ اس دیوان میں دو قسم کے عہدہ دار ہوتے: "مفتی" جو فتویٰ دیتا تھا، اور "مستحص" جو واقعات کی تحقیقات کرتا تھا۔ ان کے علاوہ انتظامی عہدہ دار اور محرر بھی ہوتے جو "امیر" اور "متصرف" کہلاتے تھے۔ اس کی کوئی تحریری شہادت نہیں ہے کہ فوجی حاکم نافرمانی اور بغاوت کے ارتکاب پر کس حد تک سزا دینے کا اختیار رکھتے تھے۔ چوں کہ جنگی قیدی اور باغی اکثر دارالحکومت بھیج دیئے جاتے تھے، اس لئے یہ نہیں معلوم ہوتے ہوں گے۔ بہرحال، صدر مقام سے ہدایات موصول ہونے پر بعض اوقات دشمنوں اور باغیوں کو صوبوں ہی میں قتل کر دیا جاتا تھا۔

دیوان مظالم :

دیوان مظالم ایک منظم ادارے کی حیثیت سے حضرت علی کے وقت سے جاری ہے۔

Marfat.com

عباسی خلفا یا خود سماعت کرتے تھے یا اپنے وزرا کو ایسا کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ہندو بھی اپنے تاج داروں کا یہ فرض سمجھتے تھے کہ شکایات کی سماعت دربار عام میں کریں۔ طبقات ناصری کے بیان میں یہ امر مضمر ہے کہ دیوان مظالم کی صدارت امیر داد کرتا تھا۔ یہ اسی صورت میں ہوتا ہو گا کہ سلطان خود موجود نہ ہو۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ محمد بن تغلق ہر پیر اور جمعرات کے دن شکایات سنتا تھا۔ پہلے عرض داشت ان حاجبوں میں سے جو اس خدمت پر مامور تھے' کسی حاجب کے پاس جاتی تھی۔ یہ بات اس [illegible] سے خالی نہ ہو گی کہ فیروز' جو بعد میں تاج و تخت کا وارث بنا [illegible] حاجب تھا۔ اگرچہ مستغیث کی داد رسی نہیں ہوتی [illegible] وہ قاضی [illegible] آخری [illegible] سلطان سے ہوتا تھا۔ ایسا معلوم [illegible] کہ سلطان کی [illegible] کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتی تھی اور سلطانوں سے شکایات [illegible] فرض [illegible] قرض داروں [illegible] سمجھتے تھے۔ [illegible] مظالم کی ایک عدالت کا حال [illegible] تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد محافظ رہتے تھے سپاہی اور عہدہ دار [illegible] قانونی مشورہ دینے کے تاج دار کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ جب نقیبوں نے عدالت کے کھلنے کا اعلان کیا تو مستغیث آگے بڑھے اور اپنے اپنے استغاثے وصول کرتے تھے اور انہیں صدر حاجب کے پاس بھیج دیتے تھے جو ان استغاثوں کو سلطان کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ سکندر لودی کے ماتحت وزیر عدالت مظالم کا صدر ہوتا تھا۔ قاضی قانونی مشورہ دیتا تھا اور اس کی مدد کے لئے بارہ فقہا ہوتے تھے۔ جب سلطان کی سواری باہر جاتی تھی تو اس وقت بھی فریادی اسے عرضیاں پیش کر سکتے تھے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ایلتتمش کے محل سے ایک گھنٹی تھی جس میں زنجیر بندھی ہوئی تھی تاکہ فریادی اسے بجا سکے۔ صوبوں کے حاکموں کا بھی یہ فرض تھا کہ وہ عدالت مظالم کی حیثیت سے اجلاس کریں۔ صاحب دیوان اور قاضی ان کی مدد کرتے تھے۔ مظالم کی عدالتیں فیصلہ کر دیتے تھے۔ اس قسم کی صورتوں میں فریقین کو اس کی اجازت ہوتی تھی کہ اگر وہ فیصلے سے غیر مطمئن ہوں تو معمولی عدالتوں سے رجوع کریں۔

دیوان قضا :

سیاست اور مظالم کے محکموں سے دیوان قضا کے روابط ہوتے تھے مگر اس کا خاص تعلق دیوانی مقدمات سے ہوتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قضا کا معاملہ عام قانون سے ہوتا تھا اور مظالم و سیاست کا انتظامی حقوق و فرائض سے۔ دیوان قضا کا سربراہ قاضی ممالک ہوتا تھا جو "قاضی القضا" بھی کہلاتا تھا۔ سلاطین دہلی کے ماتحت وہ تقریباً ہمیشہ صدر الصدور بھی ہوتا تھا اور اس کا شمار اہم ترین عہدہ داروں میں ہوتا تھا۔ کثرت کار کے باعث' جو اس کے فرائض کی نوعیت کا نتیجہ تھی' اس کی مدد کے لئے ایک نائب ہوتا تھا اور وہ بھی ایک اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ محمد بن تغلق کے ماتحت قاضی القضاۃ کو ساٹھ ہزار ٹنکے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تمام شرعی نظام اور انتظام امور مذہبی

Marfat.com

اس کے ذمے ہوتا تھا۔ وہ ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف مرافعوں کی سماعت کرتا تھا اور مقامی قاضی مقرر کرتا تھا۔ شروع شروع میں وہ دہلی کی عدالت ابتدائی کا اجلاس بھی کرتا تھا مگر بعد میں دارالحکومت کے لئے ایک علیحدہ قاضی مقرر کر دیا گیا۔ اس ماتحت عہدے پر ابن بطوطہ کا تقرر ہوا تھا اور اسے بارہ ہزار ٹنکے سالانہ کی تنخواہ دی گئی تھی۔ چونکہ وہ امام مالک کے مذہب کا پیرو تھا اور دہلی کے باشندے حنفی تھے اور وہ دہلی والوں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اس لئے دو اور قاضی اس کی مدد کرتے تھے۔ دارالحکومت کے قاضی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ سلطان نے ابن بطوطہ کو خود یہ عہدہ تفویض کیا تھا اور اسے سیدنا و مخدومنا کہہ کر خطاب کیا تھا۔

قاضی :

ہر شہر میں، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، ایک قاضی کا ہونا اس قدر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ سب سے پہلے انتظامی کاموں میں قاضی کا تقرر ضرور شامل ہوتا تھا۔ مسلم سلطنت کے آغاز میں قاضی کا کام صرف یہ تھا کہ تنازعات کا تصفیہ کرے مگر بعد میں اس کا دائرہ اختیار بہت زیادہ وسیع ہو گیا اور اس میں یتیموں اور پاگلوں کی جائداد کا انتظام و انصرام، وصیتوں پر عمل درآمد اور اوقاف کی نگرانی بھی شامل ہو گئے۔ وہ لاوارث بیواؤں کے لئے مناسب شوہر تلاش کرنے میں بھی مدد دیتا تھا۔ سڑکوں کی مرمت اور دیکھ بھال کرنے اور شوارع عام کھلے میدانوں پر نجی حدود کے تجاوزات کو روکنے کی آخری ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی تھی۔ تمام جائداد متنازع فیہ کا قاضی یا اس کے نام زد کئے ہوئے اشخاص کی تحویل میں امانتاً" جمع ہونا ضروری تھا۔ مقامی حاکموں اور عہدہ داروں کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ شرع کا احترام برقرار رکھنے میں قاضی کی مدد کریں اور غلط کاروں کے ہوش درست کرنے کے لئے اس کے ساتھ تعاون کریں۔ قاضیوں کا تقرر براہ راست مرکز سے ہوتا تھا اور وہ حاکموں کے دائرہ اختیارات سے کاملا" آزاد ہوتے تھے۔ قاضی کو شرع اور عادہ یا اصول معدئت و قیاس استقرائی کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ مقدمات میں سمجھوتا کرنے کی بھی اجازت ہوتی تھی بہ شرطے کہ سمجھوتا شرع کے خلاف نہ ہو۔ تمام مسلمان قابل اعتماد گواہ سمجھے جاتے تھے، یہ جز ان لوگوں کے جنہیں بڑے جرائم یا دروغ حلفی کی سزا مل چکی ہو یا جن پر جنبہ داری کا شبہ کیا جاتا ہو۔ قاضی کسی تازہ شہادت یا خود اپنی طرف سے کسی معقول استدلال پر اپنے فیصلے کو آپ بدل سکتا تھا۔

امیر داد :

انصاف سے متعلق ایک اور عہدہ دار بھی ہوتا تھا جسے امیر داد کہتے تھے۔ دارالحکومت میں امیر داد کا عہدہ اہمیت رکھتا تھا اور وہ اتنا با اختیار ہوتا تھا کہ اعلیٰ سیاسیات میں حصہ لے سکتا تھا۔ مثلا" علی اسماعیل اس جماعت کا قائد تھا جس نے التتمش کو دہلی کے تخت کا دعویٰ کرنے کی دعوت دی تھی۔ سلطان کی غیر حاضری میں امیر داد ہی مظالم کی عدالت کا مسند نشین ہوتا تھا اور

Marfat.com

تاج دار کی موجودگی میں وہ عدالت کے انتظام و انصرام اور اس کے فیصلوں پر عمل در آمد کرانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ عموماً" کوئی اعلیٰ مرتبے اور دانستہ علم و تقوے کا آدمی اس عہدے پر مامور کیا جاتا تھا اور اسے کثیر تنخواہ دی جاتی تھی' کیوں کہ اسے حاکموں اور اعلیٰ کمان کے عہدہ داروں کے خلاف مقدمات کی سماعت کرنی پڑتی تھی۔ محمد بن تغلق اپنے امیر داد کو پچاس ہزر ٹنکے ادا کرتا تھا۔ امیر داد کے مددگار عہدہ دار صوبوں میں بھی ہوتے تھے اور فوج میں بھی اس کا محکمہ قاضیوں کی عدالتوں کے انتظام میں اہم کردار ادا کرتا تھا۔ امیر داد عدلیہ کے تعمیلی پہلو کا نگران ہوتا تھا یہ اس کا فرض ہوتا تھا کہ قاضیوں کے فیصلوں پر عمل در آمد کرائے۔ ان عدالتوں میں وہ نہ قانون کے متعلق کوئی فیصلہ کرتا تھا اور نہ واقعات کے متعلق۔ اس کا فرض تو یہ ہوتا تھا کہ جو سزا دی جائے اسے نافذ کر دے۔ اگر وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ کسی معاملے میں بے انصافی کی گئی ہے تو وہ یا تو قاضی کی توجہ اس طرف مبذول کرا سکتا تھا یا اس فیصلے پر عمل در آمد میں اس وقت تک تاخیر کر سکتا تھا جب تک کہ کوئی اور زیادہ مکمل یا اعلیٰ عدالت معاملے پر دوبارہ غور نہ کرے۔ امیر داد مسجدوں' پلوں اور دوسری عمارات عامہ' نیز شہر کی دیواروں اور دروازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا ذمہ دار بھی ہوتا تھا۔ وہ کوتوال' پولیس اور محتسب کا نگران ہوتا تھا۔ قاضی کی عدالت میں جن دستاویزات کا اندراج کرایا جاتا تھا امیر داد ان کی نقول رکھتا تھا' اس کا یہ فرض ہوتا تھا کہ جو معاہد شرعی حدود سے تجاوز کرتا ہو اس کی ممانعت کرے۔

بین الادیانی تنازعات :

غیر مسلم رعایا کے مابین تنازعات کے جو مقدمات ہوتے تھے ان کا فیصلہ معمولی عدالتوں میں کیا جاتا تھا۔ صرف یہ فرق ہوتا تھا کہ ان کا فیصلہ رواجی قانون کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مقدمات کا فیصلہ اصول ،عدلت کے مطابق کیا جاتا تھا۔ ایسے مقدمات جن میں فریقین ہندو ہوتے تھے بہت کم عدالتوں تک آتے تھے' کیوں کہ دیہاتی پنچایتیں برطانوی عہد تک کام کرتی رہیں اور ذات پات کی پنچایتیں آج بھی ذی اثر ہیں۔

انصاف کی روح :

قانونی عدالتوں کی تنظیم سے زیادہ اہم وہ روح تھی جو ان پر حکومت کرتی تھی۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا : ایک لمحہ جو انصاف کرنے میں صرف ہوا ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ سیاست نامہ کا قول ہے' "سلطنت باوجود کفر کے باقی رہ سکتی ہے مگر بے انصافی کی موجودگی میں اس کی بقا ممکن نہیں ہے۔" سلاطین دہلی انصاف پروری کو اپنا بنیادی فرض سمجھتے تھے۔ قرون وسطیٰ کی کوئی حکومت رشوت اور بے انصافی کو بالکل ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی مگر سلطنت دہلی نے ایک اچھی طرح منظم محکمہ انصاف کا بندوبست کیا تھا۔ اس نے تمام عدالتی کارروائیوں کو عام کر کے اور ذمہ داری اور اختیارات کو مختلف عہدہ داروں میں تقسیم

Marfat.com

کر کے انضباط و توازن کا موثر نظام قائم کر دیا تھا۔ عہدہ دار عموماً" اپنی علمیت اور تقوے کی بنا پر منتخب کیے جاتے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے فرائض کو عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ جب علاؤ الدین خلجی نے ایک قاضی القضاۃ کا تقرر عام خدمات کے صلے میں کیا اور اہلیت کا [illegible] نہیں کیا تو یہ تقرر عام طور پر بہت غیر مقبول ثابت ہوا۔ بعض سلاطین نے انصاف [illegible] کیا۔ [illegible] نے ایک حاکم کو، جس نے نشے کی حالت میں قتل کا ارتکاب کیا [illegible] محمد بن تغلق ایک قاضی کی عدالت میں ملزم کی حیثیت سے حاضر ہوا اور [illegible] خلاف ثابت ہو گیا تو اس نے سزا پر اصرار کیا۔ فی الحقیقت ابن بطوطہ [illegible] تغلق جیسے تخت تاج دار [illegible] قاضی کی عدالت میں [illegible] سلطان [illegible] قاضی کے سامنے حاضر ہوا اور اسے بڑے احترام کے ساتھ سلام [illegible] خلاف ہوا اور اس نے امیر کو خون بہا ادا کیا۔ قاضی کو پہلے سے یہ ہدایت [illegible] سلطان عدالت میں داخل ہو تو وہ کھڑا نہ ہو۔ ایک اور موقع پر ایک شخص [illegible] سلطان پر اس کا روپیہ قرض ہے۔ تاج دار قاضی کے سامنے حاضر ہوا اور قرض ادا کیا۔ فیروز شاہ نے اپنے ایک مقرب کو جو قتل کا مرتکب ثابت ہوا تھا سزائے موت دینے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ ایک کم عمر طالب علم، جو مملکت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے بچوں کو پڑھاتا تھا، اس [illegible] کے محل میں کسی عورت کے ساتھ آشنائی کا مرتکب ہوا، جس پر اس عہدہ دار نے اس طالب علم کو قتل کر دیا۔ فیروز شاہ نے مملکت کے اعلیٰ عہدہ دار کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی اور اسے قتل کے جرم میں سزائے موت پانے سے گریز نہیں کرنے دیا۔ سلطان نے باوجود اس نفرت کے جو اسے سزائے موت سے تھی یہ سختی اختیار کی۔ جب جلال الدین خلجی نے سیدی مولا سے، جس پر سازش اور بغاوت کا شبہ کیا جاتا تھا، یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لئے آگ میں گزرے، تو فقہا نے اس خیال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ آگ بے گناہ اور مجرم کے درمیان امتیاز نہیں کرتی۔ سلطان نے اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اگرچہ بعد میں اس نے سیدی مولا کے قتل پر بعض فقیروں کو اکسایا اور ان کے جرم سے چشم پوشی کی۔ اگرچہ ہر شخص سازش اور بغاوت کے الزام کو سچا سمجھتا تھا، تاہم سلطان کے افعال کی تحریری شہادت موجود ہے مگر اس قسم کے واقعات حکومت کی حقیقی روح کے منافی ہیں۔

حسبہ :

محتسب سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خلاف شرع اعمال کا سدباب کرے گا اور غلط کاروں کو سزا دے گا۔ اسے شائستگی عامہ کا حامی اور طاقت وروں کے خلاف کم زوروں کے حقوق کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا یہ فرض تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ مساجد میں نماز باجماعت بہ طریق مناسب ادا کی جاتی ہے: کوئی شخص مقامات عامہ پر مدہوش نہیں پایا جاتا، منکرات و منشیات کو

Marfat.com

بنایا یا عام طور پر بیچا نہیں جاتا کوئی شخص دوسروں کے ساتھ جعل یا فریب کرتا۔ وہ قمار بازی' ناجائز ازدواج اور ناشائستہ حرکات کو روکتا تھا۔ اسکا ایک اور فرض یہ تھا کہ وہ قرض داروں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے قرض ادا کریں' بشرطے کہ وہ قرض کا وجود تسلیم کرتے ہوں اور ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں' اگر مدعا علیہ قرض سے انکار کرتا تھا یا یہ کہتا تھا کہ اس میں ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہے' تو مقدمہ قاضی کی عدالت میں جاتا تھا کیونکہ محتسب فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوتا تھا۔ فقہا اس کے دائرہ اختیارات کو صرف ان صورتوں تک محدود کرتے ہیں جو صریحاً" غلط کاری پر مبنی ہوں۔ قرضوں کے معاملے میں وہ صرف اسی حد تک مدافعت کر سکتا تھا کہ بالقصد اور شرارت آمیز نادہندگی کو روکے۔ وہ معاہدوں اور کاروباری معاملات میں بھی مداخلت نہیں کر سکتا تھا' بہ جز اس کے کہ کوئی ظاہر و باہر فریب کیا گیا ہو۔ قاضی اور محتسب کے فرائض میں ایک اور اہم فرق یہ تھا کہ محتسب کو بروقت مداخلت کا فوری اختیار حاصل تھا اور قاضی فریقین مقدمہ کے مرفعے کے بغیر کوئی کاروائی نہیں کر سکتا تھا۔ محتسب انتظامی عہدہ دار ہوتا تھا اور قاضی جج ہوتا تھا۔ محتسب کا فرض ہوتا تھا کہ وہ غلاموں اور ملازموں کے ساتھ بدسلوکی نہ ہونے دے۔ وہ آقاؤں کو روکتا تھا کہ اپنے خادموں سے بہت زیادہ کام نہ لیں۔ گھریلو جانور بھی اس کی حفاظت میں ہوتے تھے تاکہ ان پر بہت زیادہ بوجھ نہ لادا جائے' ان سے ان کی قوت سے زیادہ کام نہ لیا جائے' ان پر ظلم نہ کیا جائے۔ وہ لاوارث بچوں کی پرورش و پرداخت کا انتظام کرتا تھا۔ جو اساتذہ اپنے شاگردوں کو بری طرح مارتے تھے ان کو تنبیہ کی جاتی تھی اور کبھی کبھی سزا بھی دی جاتی تھی۔ وہ مفاد عامہ کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا۔ پانی کی بہم رسانی' شہر کی دیواریں' مسافروں کے لئے آسائشیں اور عمارات عامہ کی دیکھ بھال' یہ تمام امور اس کی توجہ کو جذب کرتے تھے۔ وہ شوارع عامہ کی نگرانی کرتا تھا' جو مکانات گرنے والے ہوتے تھے ان کے انہدام کا حکم جاری کرتا تھا' ہم سایوں کا پردہ قائم رکھنے کے لئے نئی عمارتوں کی بلندی پر احتساب کرتا تھا اور جس عمل سے دوسروں کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہوتی تھی اسے روک دیتا تھا۔ کشتیوں کے دریا میں روانہ ہونے سے قبل وہ ان کا معائنہ کرکے یہ اطمینان کر لیتا تھا کہ ان پر حد سے زیادہ بوجھ تو نہیں لادا گیا ہے اور وہ محفوظ ہیں۔ یہ دیکھنا اس کا فرض ہوتا تھا کہ عمارات عامہ میں شوارع عام پر روشنی ہو رہی ہے' منڈیوں' مسافر خانوں اور سرایوں کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے اور حفظان صحت کا انتظام قابل اطمینان ہے۔ مختصر یہ ہے کہ محتسب شہری زندگی میں باقاعدگی اور شائستگی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

Marfat.com

باب 17

مغلیہ معاشرہ اور کلچر

(MUGHALS SOCIETY)

مغل دور میں بادشاہ معاشرتی طبقات کے علاوہ عام معاشرہ تین طبقوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ سب سے اونچا امراء کا طبقہ تھا دوسرا اہل قلم ہنر مندوں اور تاجروں کا درمیانی طبقہ تھا اور تیسرا کسانوں اور مزدوروں کا طبقہ تھا۔ سلاطین کے دور کے بعد برصغیر معاشرے میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ سب سے پہلے پورا ہندوستان ایک حکمران کے ماتحت ہو گیا اور حکومت نسبتاً مستحکم ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ سلطنت تبدیل ہو کر بادشاہت بلکہ شہنشاہت کا روپ دھار گئی۔ استحکام کے باعث عوام کی معاشی اور معاشرتی حالت میں تبدیلی آنا شروع ہوئی نتیجے میں اسلامی اصلاحی تحریکوں کو بھی ابھرنے کا موقع ملا یہ تمام باتیں بیان کرنے کے لئے تفصیلی جائزے کی ضرورت ہے تاہم یہاں مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(1) شہنشاہ :

سلطان خود کو خلیفہ کا جانشین قرار دیتا تھا لیکن مغل سلاطین نے اس حیثیت سے انکار کر دیا انہوں نے خود کو بادشاہ کہلانا پسند کیا۔ چنانچہ سلطنت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی بلکہ قدیم ایرانی شہنشاہیت کا دور واپس آگیا اور ایرانوں کا دعویٰ تھا کہ سلطان زمین پر خدا کا نائب ہے اور خود غلطی نہیں کر سکتا چنانچہ مغلوں نے خود کو شہنشاہ قرار دے دیا۔ ہمایوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ عوام کے سامنے آتا تو اس کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا جاتا اور پھر وہ اٹھتے ہی حاضرین پکار اٹھتے "مغل الٰہی کی تجلی کا مشاہدہ کرو" ابوالفضل نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اکبر کو خدائیہ روپ دے دیا جب اکبر عوام کے سامنے آتا تو کہا جاتا "اللہ اکبر" دوسرا شخص جواب دیتا "جل جلالہ" پہلے شخص کا مطلب ہوتا "اللہ اکبر ہے یا اکبر اللہ ہے" اور دوسرے کا مطلب ہوتا' خدا اس کا رتبہ بلند کرے۔

ان حالات میں شہنشاہ خود کسی قانون کا پابند نہیں ہو سکتا تھا۔ شہنشاہ کی خواہش قانون بن جاتی تھی۔ اسلام کی وہ صرف اتنی خدمت کرتا کہ وہ دین پناہ تھا۔ اس لحاظ سے وہ شرک اور الحاد کو سختی سے دبانے کا پابند تھا اور خدا ترس لوگوں کا عدلیہ پر تقرر اس کی ذمہ داری تھی اپنے ان مذہبی فرائض کو ادا کرنے کے لئے اس نے شیخ الاسلام اور صدر الصدرو جیسے فرض منصب قائم کر دیئے تھے جن کی اسلام میں گنجائش نہ تھی اکبر نے تو سیاسی نظم و نسق اور اسلام کو دو مختلف

Marfat.com

چیزیں بنا دیا۔ چنانچہ اسلام کے ایک ہزار سال پورے ہونے پر اسلام کو اس کی صحیح حالت پر لانے کی توقعات زور پکڑ گئیں۔

(2) طبقہ امراء :

یہ طبقہ سپہ سالاروں اور جاگیرداروں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ کی خدمات انجام دینے پر انہیں جاگیریں عطا ہوتیں اور خفا ہونے یا فوت ہونے پر یہ جاگیریں ضبط ہو جاتیں۔ چنانچہ امراء کی حیثیت موروثی نہ ہوتی بلکہ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر آگے بڑھتے مثلاً" شاہجہاں کا وزیر سعد اللہ خان ایک محرر سے وزیر کے عہدے تک پہنچا تھا۔ یہ امراء بھی دوبارہ منعقد کرتے اور صوبائی یا علاقائی حکومتیں قائم کرتے اکثر امراء اہل علم اور اہل ہنر کی سرپرستی کرتے فنون اور دستکاریوں پر انعامات دیتے ان امرا کو باقاعدہ عہدے اور خطابات دیئے جاتے۔ خان کا عہدہ سب سے بلند تھا۔ اس کے بعد ملک کا عہدہ تھا۔

امراء کے بھی تین طبقے تھے۔ پہلا طبقہ ان جاگیرداروں کا تھا جن کی آمدنی سالانہ دس ہزار روپے سے زیادہ ہوتی تھی یہ لوگ دربار میں خصوصی تقریبات پر حاضر ہوتے۔ یہ حکمران کے خاندانی مشیر ہوتے دوسرا طبقہ پانچ ہزار روپے سالانہ سے زیادہ آمدنی رکھتا تھا انہیں ہر وقت دربار میں حاضر رہنا پڑتا ان میں سے فوجدار اور فوجی افسر مقرر ہوئے۔ تیسرا طبقہ پانچ ہزار روپے سے کم آمدنی کا مالک تھا انہیں زمین ۔ ٹے پر ملتی تھی انہیں جاگیردار کی بجائے ٹھیکے دار کہنا مناسب ہو گا۔

(3) درمیانی طبقہ :

امراء کے بعد علماء صوفیا' تاجران اور ہنر مندوں کا طبقہ تھا۔ جن کے پاس زمینداریاں تو نہیں تھیں لیکن ان کی معاشی حالت بہتر تھی۔ مغل عہدہ حکومت میں فراغت اور خوشحال ہو گئے۔ تاجر اپنی بے انداز دولت کی وجہ سے معزز سمجھے جاتے تھے اور علماء اور اساتذہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے محترم تھے دربار میں ان کو رسائی حاصل تھی۔ ان کے ساتھ ساتھ سرکاری افسر اور عہدیدار بھی تھے جو خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ سلاطین کے دور کی نسبت شہنشاہی دور میں درمیانی طبقے کو پھلنے پھولنے کا بہتر موقع ملا۔

(4) عوام :

عام کسان' مزدور' سپاہی' محرر اور نوکر پیشہ لوگ اس طبقے سے شامل تھے ان کا کام اوپر والے طبقات کی خدمت کرنا تھا۔ ملازمت ان کا پیشہ تھا زراعت اور تجارت کو فروغ کی وجہ سے ملازمتیں عام تھیں سیلاب' قحط اور لوٹ مار کے باعث مصیبت زدہ لوگوں کے سے حکومت کی طرف سے لنگر خانے جاری کیے جاتے ان کا مالیہ اور ٹیکس معاف کر دیے جاتے اور اگلی فصل

Marfat.com

کے لئے بلا سود قرضے دیئے جاتے چنانچہ عوام بھی خوشحالی سے زندگی بسر کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں کے تین سوسالہ دور حکومت میں کسی قسم کی انقلابی تحریک یا سیاسی بے چینی پیدا نہیں ہوئی۔

معاشرت :

برصغیر کی معاشرتی صورت حال واضح طور پر دو قسم کے معاشروں میں تقسیم تھی۔ مسلم معاشرہ اور ہندو معاشرہ۔ دونوں الگ الگ معاشرے تھے۔ اس لئے ان کا الگ الگ ذکر کرنا ضروری ہو گا۔

(1) مسلم معاشرہ :

مغل عہد تک مسلمان دس کروڑ کی آبادی میں سے صرف ڈیڑھ کروڑ تھے۔ گویا وہ اقلیت میں تھے اگرچہ حکومت ان کی تھی چنانچہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں مسلمانوں کی زندگیاں ڈھل رہی تھیں دولت اور خوشحالی نے ان سے فقراء اور قناعت کی دولت چھین لی تھی' لیکن خوش ذوقی' بلند ہمتی اور بلند اخلاقی ان کے اندر موجود تھی۔ تفریح میں بھی حصہ لیتے تھے۔ شکار اور سیاحت ان کے عام مشغلے تھے۔ ہندوؤں کے برعکس مسلمانوں میں ذات پات کی تمیز نہ تھی۔ لیکن سیدوں کی عزت برہمنوں ہی کی طرح الگ ذات کی حیثیت سے ہوتی۔ معاشی طبقات کا لحاظ بھی رکھا جاتا۔ عام کارکن امراء کے برابر اٹھ بیٹھ تو نہیں سکتے تھے مگر مسجد میں یہ امتیاز ختم ہو جاتے تھے۔ مسلم معاشرے کو اس کی اصل صورت لانے کے لئے حضرت مجدد الف ثانی کی کوشش اورنگ زیب کے زمانے میں رنگ لائیں اور اُس نے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش کی۔

(2) ہندو معاشرہ :

مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت کے باوجود ہندو اکثریت میں ہے۔ اس کی وجہ سلاطین کا نرم رویہ اور مغل حکمرانوں کی نرمی اور رواداری تھیں اکبر نے ہندو مسلم کو ملا کر نئی ثقافت کو رواج دیا۔ اسے اس نے دین الٰہی کا نام دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہندو اور مسلمان الگ الگ ثقافتیں اور تہذیبیں اپنائے رہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے زیر اثر ہندوؤں نے بھی دھوتی چھوڑ کر پاجامہ پہننا شروع کیا اور ہندو عورتوں نے برقعے کا استعمال شروع کر دیا' لیکن مسلمانوں کی طرح گوشت کھانے سے پرہیز رکھا ہندوؤں کے نزدیک گھر ناپاک چیز ہوتا ہے اسے صرف گائے کا گوبر ہی پاک کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کھانے کی جگہ یا چولہے اور ارد گرد کی جگہ پر گوبر کا لیپ کرتے ہیں یہ رسم اس زمانے میں بھی تھی۔ چھوت چھات اور ذات پات کا امتیاز ہندو معاشرے کی بڑی پہچان تھی جو قائم رہی البتہ مغل عہد میں ستی کی رسم کو قانوناً ممنوع کر دیا گیا لیکن اورنگ زیب کے عہد تک ختم نہ ہو سکی تھی۔ ہندوؤں میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں جن

Marfat.com

میں بھگتی تحریک اور سکھ مت اہم ہیں۔
مغلوں کے عہد میں ہندو حکومت کے بہت سے عہدوں پر قابض ہو گئے اکبر کا راجہ ٹوڈرمل اور اس کے بعد کائستھ قوم کے ہندو زمینداری اور مالیات کے محکموں پر قابض تھے۔ شاہجہان کے عہد میں تجارت اور مالیات ہندوؤں کے قبضے میں جا چکی تھی۔ اس وقت کے حاصل ہوتے ہی ہندوؤں نے شدھی تحریک کا آغاز کیا انہوں نے مسلمانوں کو شدھ (پاک) کرنا شروع کیا۔ یعنی انہیں پھر سے ہندو بنانے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ ایسی تحریکیں پورے مغل دور میں چلتی رہیں۔ اکثریت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ساتھ جارحیت سے بھی پیش آئے۔ مسلمانوں کے ساتھ مل بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ دونوں کے مسافر خانے' ہوٹل (سرائیں) کھانے پینے کے برتن اور کپڑے الگ الگ ہوتے تھے۔

(3) عورت کا مقام :

مغل دور میں عورت کا مقام اور حیثیت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی تھی۔ اگرچہ ہندو معاشرے میں عورت کو ماں کی حیثیت سے عزت حاصل تھی اور مسلم معاشرے میں نکاح' شادی اور جائداد کے معاملات میں بھی اس کو مقام حاصل تھا۔ مغل دور میں انہیں اعلیٰ تعلیم اور جائداد اور سیاسی امور میں خدمات انجام دینے کی آزادی اور مواقع بھی حاصل ہو گئے تھے۔ نورجہاں' ممتاز محل جہاں آرا بیگم' روشن آرا بیگم اپنے زمانے میں بادشاہوں کی مشیر تھیں۔ ہمایوں کے دور میں شاہی حرم کی خواتین اپنے مرد دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ آزادی سے ملتی جلتی تھیں۔ بعض اوقات مردانہ لباس پہن کر باہر جاتی تھیں۔ پولو کھیلتی تھیں' شعر و ادب اور موسیقی سے دل بہلاتی تھیں۔ مغل خواتین میں عزت اور خودداری کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ عام گھریلو خواتین بھی اس قدر پردہ کرتی تھیں جس حد تک انہیں ضرورت ہوتی تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین چادر سے ڈھکی رہتیں۔ اگرچہ عورتیں نسبتاً" آزاد تھیں لیکن ان سے پاک دامنی اور عفت کا تقاضا کیا جاتا تھا چنانچہ ضروری تھا کہ وہ نامحرموں سے پاس آنے جانے سے اجتناب کریں اس سے بہتر تھا کہ پردہ کریں۔ چناچہ عورتیں اس لحاظ سے از خود گھروں میں رہتیں یا مردوں کی محفلوں سے دور رہتیں۔ یوں انہیں تقدس اور عزت بھی حاصل ہوتی جو بازاری عورتوں' طوائفوں اور رنڈیوں کو حاصل نہ تھی۔

(4) تقریبات اور تہوار :

تفریحات اور تہواروں کے سلسلے میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں واضح اختلاف موجود تھا۔ مسلمان عسکری کھیلوں' گھڑ سواری شکار' پولو' کشتی' کبڈی وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ہندو شطرنج اور قمار بازی کے رسیا ہوتے جا رہے تھے۔
مسلمانوں میں سماجی تہوار نہیں تھے البتہ مذہبی تہوار تھے۔ مثلاً" جمعہ عیدیں ان کے ساتھ

Marfat.com

ساتھ ایرانی تہوار نوروز وغیرہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ شب برات کا تہوار بھی منایا جاتا تھا۔ اس میں آتش بازی کی جاتی محرم کو منائے اور تعزیے نکالنے کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا البتہ محرم کے دس دن شہدائے کربلا کے حالات پر مجلسیں قائم کی جاتیں۔ سرحد' پنجاب' سندھ اور بنگال میں صوفیوں کے مزاروں پر میلے لگتے یہ میلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ ہوتے سندھ میں چاند کے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں ماکلی پہاڑ پر کسی صوفی کے مقبرے پر جمع ہو جاتے۔ ایسے مقامات تعداد میں بارہ تھے۔

ہندوؤں کا معاشرہ تہواروں کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ ہر موسم اور موقع پر جشن مناتے۔ ان کے اہم تہوار بسنت' پنچمی ہولی' دیوالی اور شیور اتری تھے ان کے علاوہ کرشن اور رام وغیرہ دیوتاؤں کے یوم پیدائش اور مقامی تہوار بھی شامل تھے۔ بسنت ماگھ کے مہینے میں موسم بہار کا تہوار تھا۔ شودروں کے لئے ہولی کا تہوار اہم تھا یہ پھاگن کے مہینے میں ہوتا۔ شیورا تری ماہ کے مہینے میں 29 ویں شب کو ہوتا۔ اس رات عبادت کی جاتی اور آتش بازی کی جاتی۔ دوسرے تہواروں میں آگ جلانا رقص کرنا' رنگ پھینکنا اور نشہ کرنا اہمیت رکھتے تھے۔ کھتری کا تہوار سہرہ تھا جو جیٹھ کے مہینے کی دس تاریخ کو ہوتا۔ برہمنوں کا تہوار پورن ماشی تھا جو ساون کے مہینے میں پورے چاند کی رات کو ہوتا تھا دیوتاؤں میں سے کرشن کا تہوار سب سے بڑا تھا۔ کرشن کے مسلک میں رقص کو اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ گھنگھرو باندھ کر رقص کیا جاتا۔ غرض یہ کہ ہر طرح سے تہوار منانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

معیشت :

مغل دور میں معیشت کا دارومدار زراعت' صنعت اور تجارت پر تھا زراعت اسی قدیم جاگیردارانہ نظام کے تحت ہوتی تھی۔ صنعت کا انحصار دستکاریوں اور حرفتوں پر تھا۔ یہ مشین سے ناآشنا تھی اور تجارت پر سکون دور میں خوب پھلتی پھولتی ہے۔ اس پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ مجموعی طور پر عوام خوشحال تھے یہ خوشحالی یورپ کے کسی بھی صنعتی ملک سے زیادہ تھی بابر نے برصغیر کو فتح کرنے کی چار وجوہات بیان کی تھیں۔

(1) ملک کی وسعت
(2) زمین کی زرخیزی
(3) سونے کی فراوانی
(4) ہنر مندوں کی افراط

(1) زراعت :

برصغیر کی زیادہ آبادی زراعت میں لگی ہوئی تھی۔ سوائے جنوبی ہند کے کچھ علاقوں کے دیگر ہر طرف امن اور سکون تھا۔ اس لئے زراعت کی طرف توجہ عام تھی۔ زیادہ تر فصلیں ہی کاشت ہوتیں۔ جن میں اکبر کے دور میں تمباکو بھی شامل ہو گیا تھا۔ پھلوں میں آم مقبول ترین تھا۔ بابر نے ان آموں کی تعریف کی ہے۔ اس نے اپنے ملک سے خربوزے منگوا کر آگرے کے

Marfat.com

باغ میں لگوائے تھے۔ اہم پیداوار' گندم' دالیں' باجرہ' جو' مٹر' چاول' تلی اور تیل کے بیج' گنا' کپاس' تمباکو تھے۔ پھلوں میں آم' انگور' کھجور' انار' کیلا' دیسی خربوزے' آڑو' سیب' سنترے' انجیر' لیموں اور جامن تھے۔ پھولوں میں تلسی' گیندا اور گلاب کے علاوہ بعض دیسی جڑی بوٹیوں ادرک اور گرم مصالحے کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔ زرعی پیداوار سے گڑ' عطیات اور عرق بھی بنائے جاتے۔ مغلوں نے اپنے دور میں باغات لگوائے' ان کی دیکھا دیکھی امراء نے بھی باغات کی طرف توجہ دی۔ چونکہ جاگیریں موروثی نہیں ہوتی تھیں اس لئے جاگیردار کھیتوں سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ لگان بڑھتا اور زیادہ کھیتوں پر کاشت ہوتی لیکن عام زرعی جھگڑے نہیں ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسان کا گزارا بخوبی ہو رہا تھا۔ سیلاب یا قحط کی صورت میں حکومت مالیہ معاف کر دیتی تھی۔ شاہی لنگر کھول دیئے جاتے۔ بیج مفت تقسیم کئے جاتے اور کسانوں کو بلا سود قرضے دیئے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ اہل مغرب نے برصغیر کا رخ کرنا شروع کر دیا اور مغل دور میں سمندری ساحلوں پر اپنی تجارتی کوٹھیاں تعمیر کر لیں۔ وہ یہاں سے اناج اور مصالحے خرید کر یورپ میں بھیجتے تھے۔

(2) **صنعت و حرفت** :

مغلوں نے صنعت و حرفت میں بے تحاشا ترقی کی۔ سب سے بڑی صنعت کپڑے کی تھی۔ اس دور میں زندگی پر تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے قسم قسم کے کپڑے بننے لگے تھے۔ اکبر نے لاہور' آگرہ' فتح پور اور احمد آباد میں عمدہ کپڑے کے کارخانے لگوائے اور اس کے لئے چین سے کاریگر منگوائے۔ دہلی کے علاوہ گجرات اور بنگال میں ریشمی کپڑے کے کارخانے تھے۔ جہاں ہزاروں کاریگر کام کرتے تھے۔ زر بفت' اطلس' سنجاف' فر' کمبل اور قالین پیداوار تھیں۔

دوسری بڑی صنعت دھات کی تھی' لوہا' پیتل اور کانسی سے تلواریں' توپیں' بندوقیں' پیالے اور دیگر برتن تیار ہوتے تھے۔ اکبر کے دور میں دھاتوں کی صنعت میں نفاست پیدا ہوئی۔ خصوصا" زرگری +میں عمدہ کارکردگی ظاہر ہوئی۔

ان کے علاوہ چمڑے' لکڑی اور پتھر کا کام بھی بہت عمدہ ہوتا تھا۔ چٹاگانگ میں بحری جہاز بنانے کے کارخانے بھی قائم ہو گئے تھے لیکن ان صنعتوں کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ یہ ابھی تک دستکاری ہنر اور حرفت پر قائم تھیں۔ مشین سے کام بہتر' زیادہ اور نفیس ہوتا ہے۔ مغلوں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ یورپی تاجر مشینیں لے کے اکبر کے دربار میں آتے لیکن اس نے انہیں کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہ دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر صنعتی میدان میں مشینی صنعتوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ان کے اوزار بھی توپوں اور پرانی بندوقوں تک محدود رہے اور یورپی فوجوں کے اوزاروں کا مقابلہ نہ کرنے کے قابل ہو سکے۔

(3) **تجارت** :

Marfat.com

زراعت اور صنعت کے فروغ کا دارومدار تجارت پر ہوتا ہے اور تجارت کے لئے پرامن ماحول درکار ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے مغل دور حکومت میں امن اور سکون تھا۔ ذرائع آمدورفت ترقی کر رہے تھے۔ سڑکیں محفوظ تھیں۔ چنانچہ اناج اور مصنوعات کی برآمد بڑے آرام کے ساتھ ہو رہی تھی۔ تجارت کو اتنا فروغ ملا کہ اٹھارویں صدی عیسوی تک برصغیر دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بن گیا۔ مغلوں نے غیر ملکی تاجروں کی حوصلہ افزائی کی جس کے نتیجے میں ایران' عرب' چین اور انڈونیشیا کے تاجروں کے علاوہ پرتگال' فرانس' اٹلی اور انگلستان کے تاجر اپنے بحری جہازوں پر بیٹھ کر برصغیر کا رخ کرنے لگے۔

برصغیر کی برآمدات زیادہ تھیں اور درآمدات کم۔ درآمدات میں بھی مصنوعات کم اور جانور مثلاً" گھوڑے وغیرہ زیادہ اہم تھے۔

ملک کے اندر لاہور' ملتان' دہلی اور گجرات تجارت کے اہم مراکز تھے۔ خشکی کے راستے غیر ملکی تجارت' کوئٹہ' پشاور اور کشمیر کے راستوں مثلاً" شاہراہ ریشم کے ذریعے ہوتی تھی۔ یہ تینوں مقامات اب پاکستان میں شامل ہیں۔ اکبر سے اورنگ زیب کے عہد تک تجارت کو پرسکون حالات کی وجہ سے بہت فروغ ملا۔ کسٹم کی شرح بھی کم ہو گئی تھی۔ اس سے تاجروں کی حوصلہ افزائی ہوئی خصوصاً" غیر ملکی تاجر برصغیر کے ساحلوں پر لنگر انداز ہونے لگے۔

اکبر کے دور تک وزن کے پیمانے ادلتے بدلتے رہتے تھے۔ سیر کا وزن بھی مختلف رہا جسے اکبر نے معیاری بنایا۔ من کا وزن بھی اکبر کے دور میں چالیس سیر مقرر ہوا۔ اس دور میں ایک ٹن چالیس من کے برابر ہوتا تھا جسے انگریزوں نے 27 من کے برابر کر دیا۔

معیار زندگی بڑھنے کی وجہ سے مغل دور میں سکے کی قیمت سلاطین کے دور کی نسبت کم ہو گئی تھی لیکن یہ 1857ء کے بعد کی قیمت خرید سے کئی گنا زیادہ تھی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل دور حکومت معاشرتی اور معاشی طور پر اپنے سے پہلے کے دور سلاطین اور بعد کے دور زوال اور انگریزی دور کی نسبت بہتر تھا۔

فن (ART) :

سترھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے اوائل تک پورے ہندوستان پر مغل فن مسلط ہو گیا۔ سولھویں صدی کے اواخر سے فتح پور سیکری کا مخلوط ہندو مسلم طرز تعمیر مختلف راجپوتی درباروں میں اختیار کیا گیا (مثلاً" امبر' بیکانیر اور نور پور وغیرہ) اور مناسب تصرف کے ساتھ ہندوؤں کے مندروں میں بھی استعمال کیا گیا (مثلاً" متھرا' بندرابن' بنارس وغیرہ) پھر شاہجہان اور اورنگزیب کا سنگ مرمر والا شاہی اسلوب پہلے پہل امبر' بیکانیر' بوندی اور جودھ پور کے مقامات پر اختیار کیا گیا اور تخمیناً" 1700ء سے پورے راجستھان (جے پور' جودھ پور' اودے پور اور بیکانیر)' ہمالیہ کے علاقے (تراسو جان پور' نوداؤں' چمبہ' منڈی' کلو اور بعد میں کھٹمنڈو میں

Marfat.com

بھی)' مرہٹہ ریاستوں (بالخصوص پونا'گوالیار' اجین اور ناگ پور) اور حتیٰ کہ تنجور اور منڈورا تک پہنچ گیا' اگرچہ اس طویل عمل کے دوران میں اس میں ہندوانی رنگ بڑھتا گیا۔ اسی طرح بعد کی راجستھانی کانگڑے اور مرہٹہ ریاستوں کی مصوری کی اصل کا اپنی ترکیب کے اعتبار سے معیاری مغلیہ فن ہی مبدا تھا اگرچہ جمالیاتی اعتبار سے وہ مختلف مزاج رکھتی ہے۔ اکثر دوسری صنعتیں بھی اسی طرح مسلمانوں سے مستعار لی گئیں۔

Marfat.com

باب 18

عہد مغلیہ کا ادب

(الف) فارسی ادب :

بابر نے آخری لودی بادشاہ کو شکست دے کر 1526ء میں مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اس کے بیٹے ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور شاہ ایران سے فوجی امداد طلب کرنے کی خاطر اس نے ایران میں کئی سال گزارے۔ 1555ء میں اس نے دوبارہ دہلی کا تخت حاصل کر لیا لیکن اسی سال اس کی وفات ہو گئی اور مغلیہ سلطنت کو مستحکم کرنے کا کام اس کے بیٹے اکبر کے حصے میں آیا جس نے 1556ء سے 1605ء تک حکومت کی۔ ہمایوں اور شاہ ایران کے فوجی اور سیاسی اتحاد نے ایران اور ہند پاکستان برصغیر کے مابین ادبی' علمی اور فنی اتحاد کا ایک نیا باب کھول دیا۔ ہمایوں جب واپس آیا تو اس کے ساتھ صرف ایرانی سپاہی ہی نہیں تھے بلکہ ایران کے شعرا اور علماء بھی تھے اور ہمایوں کے زمانہ سے شروع ہو کر یہ سلسلہ عہد مغلیہ کے اختتام تک جاری رہا۔ نووارد ایرانی فارسی ادب میں ایک نئی زندگی پیدا کرتے رہے اور ان کی وجہ سے بول چال کی فارسی زبان بھی منجھتی اور نکھرتی رہی۔ اس سے پہلے فارسی اس برصغیر میں افغانستان اور ترکستان کے راستے سے آئی تھی لیکن اب لسانی اور ادبی دھارا سیدھا ایران سے ہندوستان بہنے لگا۔

ان نئے حالات پر بحث کرنے سے پہلے دو شاعروں کا ذکر کرنا مناسب ہو گا جن کا فن نئے حالات اور نئے اثرات کے بروئے کار آنے سے پہلے ہی پختہ ہو چکا تھا اور جن کو ہم اس برصغیر کی قدیم ادبی روایت کا نمائندہ سمجھ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک بیرم خاں' ہمایوں کا یار وفادار' مشیر با تدبیر اور فلسفی اور اکبر کا اتالیق تھا۔ اس کا دیوان بہت مختصر ہے لیکن اشعار میں فصاحت اور جذبات نگاری ہے' دوسرا دربار اکبری کا ملک الشعرا فیضی تھا۔ عرفی اور دوسرے نووارد ایرانی شعرا سے اس کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے لیکن وہ شاعری کی پرانی روایت کو ہی برتتا ہے۔ وہ کہتا ہے :

روح فیاض خسرو حسن است   وگر از بیر من نظر جوئی

فیضی حقیقت میں عالم تھا اور ہمیں اس کے اشعار میں خسرو کا تغزل نہیں ملتا۔ لیکن وہ ایک بڑے عہد کا سچا نمائندہ ہے۔ اکبری عہد محض اسی لئے مشہور نہیں ہے کہ مغلیہ سلطنت کی حدود بہت وسیع ہو گئیں یا ملک میں بہت اہم تعمیری اصلاحات نافذ کی گئیں۔ اس زمانے کے مذہبی مناظرے بھی یادگار ہیں۔ فیضی کے اشعار میں کامرانی کا سرور اور خود اعتمادی کا اطمینان ہے۔ اس کا کلام ایک اقبال مند زمانہ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اس کا دل مذہبی تشکیک سے بے

Marfat.com

چین ہے اور اکبر کے دربار کے مناظرے اور فیضی کاکلام معاصرانہ زندگی کے اس پہلو کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ فیضی کی کلیات ابھی شائع نہیں ہوئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہند پاکستان برصغیر کے شاعروں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ تہران یونیورسٹی نے جو فارسی ادب کی تاریخ شائع کی ہے اس میں لکھا ہے کہ فیضی کے کلام نے آل عثمان کے عہد حکومت میں ترکی میں بہت رواج پایا اور اسی کے اثر سے ترکی میں فارسی ادب بہت مقبول ہو گیا۔

اکبر کے طویل عہد کے شعرا میں فیضی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے لیکن شاعری کی مقبول طرز وہ تھی جس کو ایران کے نووارد شعرا نے رائج کیا۔ ان شعرا کی فہرست میں عرفی نظیری اور ظہوری جیسے مشہور نام ہیں۔ عرفی کی شہرت قصیدہ نگار کی حیثیت سے ہوئی گو وہ غزلیں بھی خوب کہتا ہے۔ باقی شعرا نے زیادہ تر غزلیں ہی کہی ہیں۔ یہ لوگ فغانی کی طرز میں غزلیں کہتے تھے جس نے ایک ذہنیاتی اور دقیق قسم کی شاعری کو فروغ دیا اور اپنے ذاتی واردات کی ترجمانی سے شاعری کا دائرہ وسیع کرنے یا نئے موضوعات اختیار کرنے کے بجائے پرانے موضوعات ہی میں موشگافیاں کیں اور ان کے دوراز کار اور غیر مانوس پہلوؤں کو نمایاں کر کے امتیاز حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عرفی' نظیری اور ظہوری کی شاعری بہت بلند قسم کی ہے۔ خود ایران میں بھی ان کا کوئی معاصر شاعر ان کا ہمسر نہ تھا۔ نظیری کی شاعری بالخصوص نہ صرف زبان کی شستگی بلکہ عشق و محبت کی مختلف نفسی کیفیات کی ترجمانی کے لئے بھی ممتاز ہے جسے اصطلاحاً ''معاملہ بندی'' کہتے ہیں۔ فغانی کا طرز رائج ہونے سے بہت بڑے نتائج پیدا ہوئے' سوزوگداز کی بجائے نزاکت خیال اور لہجہ میں خلوص کی جگہ تصنع اور تکلف نے لے لی ہے۔ یہ لے بڑھی تو بالاخر ناصر علی سر ہندی اور غنی کشمیری کی خیالی بھول بھلیوں تک پہنچی۔ بیدل جو اورنگ زیب کے عہد کا شاعر ہے ناصر علی اور غنی سے بھی زیادہ ادق اور پیچیدہ شعر کہتا ہے۔ لیکن وہ کم از کم اپنی دماغی کاوشیں فلسفیانہ مضامین پر تو صرف کرتا ہے۔ اسی لئے اس کی نظم میں حکیمانہ دقت نظری ہے اور خیالات اور طرز ادا میں ندرت ہے۔ آج بھی افغانستان میں اس کا شمار مقبول ترین شاعروں میں ہے اور ایک زمانہ میں ترکیہ کے ان حلقوں میں بھی نہایت مقبول تھا۔ جن میں فارسی شعروسخن کا چرچا تھا۔

مغلیہ عہد میں اکثر نووارد شاعروں کا اس خطہ سے خاص تعلق تھا جس کو اب پاکستان کہا جاتا ہے۔ اکثر شاعر تو پیدا ہی یہیں ہوئے تھے۔ عرفی نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن بھی ہوا۔ بعد میں ایک درویش نے اس کی قبر کو غلطی سے اپنے بھائی کی قبر سمجھ کر کھودا اور اس کی ہڈیاں مشہد لے جا کر دفن کر دیں۔ جہانگیر کا ملک الشعرا طالب آملی لاہور کے مشہور بزرگ شاہ ابوالمعالی کا شاگرد تھا۔ اس نے لاہور کی تعریف میں بہت سے اشعار بھی کہے ہیں' اکبر اور جہانگیر کے عہد میں یہ شہر دوسرا دارالسلطنت تھا۔

مقامی شعرا نے بھی شاعری کا ایک بلند معیار قائم رکھا۔ مغلوں کے زمانہ میں فارسی زبان

Marfat.com

میں شعر و شاعری اتنی عام تھی کہ لاہور کے ایک ہندو شاعر نے جو برہمن تخلص کرتا تھا فارسی میں پورا دیوان تیار کیا۔ اس کی زبان میں خامیاں ہیں لیکن کلام سادہ اور پر اثر ہے اور اس زمانہ کے تصنع اور تکلف کے مقابلہ میں تو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ برہمن کے تتبع ہیں اور بہت سے ہندوؤں نے بھی فارسی میں شاعری کی اور اٹھارویں صدی میں تو اس کی مقدار اتنی زیادہ ہو گئی کہ بچھی نرائن شفیق نے اس پر ایک مستقل تذکرہ موسوم "تذکرہ گل رعنا" ترتیب دیا۔ اس بناء پر ڈاکٹر سید عبداللہ جنہوں نے اس موضوع یعنی ہندوؤں کا حصہ اپنے مسلمان ہم وطنوں کے برابر تھا"۔

اس عہد کا غالبا" سب سے مقبول مثنوی غنیمت نے لکھی ہے جو پنجاب کے ضلع گجرات کے ایک گاؤں کنجاہ کا رہنے والا تھا۔ اٹھارویں صدی میں پنجاب کے اکثر شاعروں نے ہیر اور رانجھا کے متعلق فارسی میں مثنویاں لکھیں جن کی داستان محبت پنجابی کی مشہور و معروف نظم ہیر وارث شاہ کا موضوع ہے۔ اس صوبے کا ایک بڑا شاعر واقف تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے واقف کے کلام سے متاثر ہو کر اس کو کابل بلایا۔ وہاں تھوڑا عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ بہاولپور چلا آیا اور باقی عمر 1776ء تک یہاں کے نواب کے درباری شاعر کے طور پر بسر کی۔

عہد مغلیہ میں سلطنت کے گوشہ گوشہ میں فارسی ادب پڑھا لکھا جا رہا تھا۔ شمال مغرب میں پشتو کا مشہور شاعر خوشحال خاں خٹک فارسی میں بھی شعر کہتا تھا اور اس کے پشتو دیوان میں بہت سی فارسی غزلیں شامل ہیں' ایرانی شاعروں پر اس برصغیر کے دوسرے حصوں کی گرمی بہت گراں گزری تھی اس لئے کشمیر کی خوشگوار آب و ہوا اور حسین مناظران کے لئے بہت کشش رکھتے تھے۔ چنانچہ کچھ مشہور ایرانی شاعر مثلا" کلیم' سلیم' شیدا اور طغرا نے اپنی زندگی کے آخری دن یہیں گزارے۔ ظفر خاں احسن' والی کشمیر شعر و سخن کا بہت قدر دان تھا' اس لئے بہت سے مقامی شاعر مثلا" غنی' فانی اور ندیم وغیرہ نے فارسی شاعری میں امتیاز پیدا کیا۔ صوبہ سندھ میں ٹھٹھہ' بھکر اور سہوان فارسی ادبی سرگرمیوں کے خاص مرکز تھے۔ ٹھٹھہ کے علی شیر قانع اور بھکر کے محمد معصوم جنہوں نے فارسی میں تاریخ سندھ بھی لکھی ہے' صوبہ سندھ میں فارسی علم و ادب کے بڑے روشن چراغ تھے۔

عہد مغلیہ کا سب سے برا فارسی شاعر سلطنت کے زمانہ انحطاط میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی آنکھوں سے آخری مغل تاجدار کو دہلی سے جلا وطن ہوتے دیکھا۔ ہمارا مطلب مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہے جو 1796ء میں آگرہ میں پیدا ہوا لیکن اوائل عمر ہی میں دہلی چلا آیا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا لیکن اسے فارسی سے زیادہ لگاؤ تھا اور اس کا زیادہ پختہ اور سنجیدہ کلام فارسی ہی میں ہے۔ اس نے شاعری کا آغاز بیدل کی تقلید سے کیا لیکن بعد میں عرفی اور نظیری کے اسلوب پر زیادہ توجہ دی۔ ان شعرا کی ایک خصوصیت معاملہ بندی تھی جو عشق و محبت کی چند روایتی کیفیتوں تک محدود تھی۔ غالب نے اپنے خداداد بلکہ شاعری سے کام

Marfat.com

لے کر "معاملہ بندی" کو زندگی کے ہر پہلو اور عشق کی ہر کیفیت کا مطالعہ بنا دیا۔ مغلیہ عہد میں فارسی شاعری میں جتنے مختلف طرز ایجاد ہوئے غالب کی شاعری ان سب کی بہترین خصوصیات کا نچوڑ ہے۔ اس کی شاعری کی بنیاد ٹھوس خیال پر ہے لیکن چونکہ وہ ایک پیدائشی فنکار ہے اس لئے وہ فلسفیانہ حقیقتوں کو شاعرانہ حسن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کا کلام محض اس کے ذاتی واردات کا حسین اظہار نہیں ہے بلکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا بھی آئینہ دار ہے۔

تاریخ : مغلیہ عہد میں تاریخ کے تمام شعبوں میں کام ہوا۔ کچھ' مثلاً" اکبر نامہ اور شاہجہاں نامہ' درباری تاریخیں ہیں' ایسی تاریخوں کے نقص ہر شخص جانتا ہے لیکن عام طور پر ان کتابوں میں بڑی فنی مہارت پائی جاتی ہے۔ ابوالفضل جو درباری مورخوں کا امام ہے' ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو سندھ سے آیا تھا۔ وہ اور اس کا بھائی فیضی اوئل عمر ہی میں اکبر کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے بہت جلد شہنشاہ کا احترام اور اعتماد حاصل کر لیا۔ حالانکہ سرکاری طور پر وہ محض دیوان کا سر دفتر تھا۔ پروفیسر رالنسن' ابوالفضل کی مورخانہ حیثیت سے خوبیاں بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔ "اس عہد کے تمام مورخین میں ابوالفضل یکتا ہے اور کوئی مورخ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا"۔

ابوالفضل کا ضخیم اکبر نامہ' جس کا "آئین اکبری" محض ایک حصہ ہے' ہندوستان میں لکھی ہوئی تمام تاریخی کتابوں سے زیادہ اہم ہے۔ پہلے حصہ میں شہنشاہ اکبر کے چھیالیس سال تک خاندان تیموری کی تاریخ ہے۔ باقی کتاب میں ملک کے نظم و نسق کا بیان ہے۔ کتاب کے موضوعات یہ ہیں: شاہی محل اور دربار' فوجی اور سرکاری ملازمتیں' عدلیہ اور انتظامیہ شعبہ جات' مالیہ اور خراج' ہندوؤں کی معاشرتی' مذہبی اور ادبی خصوصیات اور اکبر بادشاہ کے فرمودات و ارشادات۔

ظاہر ہے کہ درباریوں کی لکھی ہوئی تاریخی کتابوں میں عموماً" بر سر حکومت بادشاہ پر تنقید یا نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی کچھ اہم مستثنیات ہیں مثلاً" منتخب اللباب اورنگ زیب کے ایک عہدہ دار خافی خاں کی لکھی ہوئی تاریخ ہے۔ اس کے مصنف نے بہت ذمہ داری اور سنجیدگی سے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ وہ اورنگ زیب کی حکومت کی خامیاں بیان کرنے سے نہیں چوکتا اور نہ اورنگ زیب کے دشمنوں اور باغیوں مثلاً" شیواجی کی خوبیاں بیان کرنے میں تامل کرتا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے۔ جابجا اس عہد کی مذہبی اور ادبی زندگی کی طرف اشارے کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے خشک سیاسی واقعات کے بیان میں ایک پر لطف تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔

بدایونی کی منتخب التواریخ اس سے بھی زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اسلام کے ہند پاکستان برصغیر میں آنے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا بیشتر حصہ اکبر کے عہد کے واقعات کی سرگزشت ہے اور اس میں ہمعصر شاعروں' ادیبوں' عالموں اور فقیہوں کے مکمل حالات ملتے ہیں۔

Marfat.com

باوجودیکہ وہ اکبر کا درباری تھا لیکن اپنے مذہبی عقائد میں شہنشاہ سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی بدعتوں کی خاموش اور محتاط زبان میں بہت شدت اور سختی سے مزمت کی ہے۔ بدایونی کے رائے سے اختلاف ممکن ہے لیکن فن تصنیف میں اس کی مہارت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بہت ہی مختصر الفاظ میں کئی معاصر شخصیتوں کے خاکے پیش کئے ہیں۔ مناسب جزئیات کے انتخاب میں اس کی نگاہ بہت تیز تھی' جاندار الفاظ پر اس کو قدرت تامہ حاصل تھی' اکثر مقامات پر دل کے زہر نے زبان کی تلخی بن کر تصویروں میں جان ڈالدی ہے۔ بدایونی نے اپنی لفظی تصویروں کو اکثر جگہ خط و خال گھٹا بڑھا کر پیش کیا ہے لیکن درحقیقت وہ دربار مغلیہ کے مصوروں کی طرح ایک بڑا فنکار تھا جو موقلم کی چند چا بکدست جنبشوں سے تصویر کو اجاگر کر کے اس میں جان ڈالنے کا ملکہ رکھتے تھے۔

اس عہد کی ایک اور اہم تاریخی تصنیف سیرالمتاخرین ہے جس کو غلام حسین طبا طبائی نے لکھا۔ یہ کتاب اس برصغیر کی اورنگ زیب کے سال وفات یعنی 1757ء سے لے کر 1781ء تک کی تاریخ ہے۔ اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کے سیاسی معاملات میں اپنی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی اور مصنف نے کمپنی کے متعلق بہت گہری باتیں کہی ہیں۔ میکالے نے اس کی کتاب سے کئی حوالے سند کے طور پر پیش کئے ہیں اور مصنف کے اعلیٰ معیار کی تعریف کی ہے۔ جنرل برگس (General Briggs) سیرالمتاخرین کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ایک "ذاتی یاداشت" کے طور پر لکھی گئی ہے۔ یہی تاریخ کی سب سے کارآمد اور دلچسپ شکل ہے۔ سوائے چند خصوصیات کے جو مصنف کے مسلمان کردار اور عقیدہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ کتاب یورپ کی کسی تاریخی یاداشت سے کم درجہ نہیں رکھتی۔ اگر ڈیوک دسولی' لارڈ کلیرنڈن یا شپ برنٹ اس کتاب کے مصنف ہوتے تو انہیں ایسی کتاب کا مصنف ہونے سے کوئی عار نہیں ہو سکتی تھی۔

سیرت اور تذکرے : عہد مغلیہ تذکروں میں بھی اتنا ہی مالا مال ہے جتنا تاریخی کتابوں میں۔ آزاد بلگرامی نے جو ایک بہت محتاط عالم اور شاعر تھے' شعرا کے کئی تذکرے بہت خوبی سے لکھے' ان ہی میں سے ایک سرو آزاد ہے۔ معاصرالامرا اور معاصر رحیمی امرا کے یاد گار تذکرے ہیں۔ مذہبی تذکرے بدستور بیشتر توجہ کے مرکز بنے رہے اور عالمانہ صلاحیت اور فنی مہارت رکھنے والے کئی مصنفین نے اس صنف ادب میں اہم اضافے کئے۔

عہد مغلیہ کے سب سے مشہور تذکرے بابر اور جہانگیر کی خود نوشت سوانح عمریاں ہیں واقعات بابری دراصل ترکی زبان میں لکھی گئی لیکن اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خانخاناں نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اسی ترجمہ نے عام طور پر رواج پایا۔ پارے دکورترے ای جس نے بابر کی سرگزشت کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ کتاب جسے "سینٹ آگسٹائن اور روسو کے خود نوشت' اعترافات' اور گبن اور نیوٹن کی خود نوشت سرگزشتوں کی ہم

Marfat.com

پلہ سمجھا جاتا ہے" ہندپاکستان برصغیر میں لکھی گئی یا اس پر نظر ثانی اس ملک میں ہوئی۔

تزک جہانگیری میں اتنی بے ساختگی نہیں ہے۔ اس میں لکھنے والوں کی شخصیتوں کو بھی دخل ہے۔ تزک جہانگیری کا ہیرو اتنی پہلودار اور دلکش شخصیت کا مالک نہیں تھا جتنا سلطنت مغلیہ کا بانی۔ پھر بھی یہ بہت مفید اور دلچسپ کتاب ہے اور تاریخی تفصیلات کے علاوہ خود جہانگیر کے مزاج اور مذاق پر بہت روشنی ڈالتی ہے۔ اخبارالاخیار بزرگان دین کے تذکروں میں نہایت ہی معتبر اور عمدہ ترتیب سے لکھی ہوئی کتابوں میں سے ایک ہے۔ غالباً ہندپاکستان برصغیر میں لکھی ہوئی کوئی کتاب اس معاملے میں اتنی مفید نہیں۔ یہ کتاب عہد جہانگیر کے مشہور بزرگ اور عالم شیخ عبدالحق محدثؒ نے لکھی ہے۔ افراد کی سوانح عمریوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر شیخ احمد سرہندی کی سوانح عمری زبدۃ المقامات ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے اکبر کی مذہبی پالیسی کے خلاف اسلامی شریعت کے ردعمل کو تقویت پہنچانے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ داراشکوہ نے دو کتابیں سکینتہ الاولیا سفینتہ الاولیا لکھیں۔ پہلی کتاب میں اس کے مرشد کے حالات ہیں اور دوسری میں پرانے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ یہ دو کتابیں اپنی صنف میں بہت دلچسپ اضافے ہیں۔

مکتوبات : اس عہد میں مکتوبات کے سب سے اہم مجموعے مرتب کیے گئے۔ ابوالفضل کے مکتوبات تاریخی حیثیت اور طرز انشا کی وجہ سے ایک عرصہ نصابات میں شامل رہے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ فطری، سادہ اور مؤثر، اورنگ زیب کے خطوط ہیں۔ چنانچہ رقعات عالمگیری بھی نصاب کی حیثیت سے بہت مقبول رہی ہے۔

بزرگان دین کے مکتوبات میں بلاشبہ سب سے بہتر مکتوبات امام ربانی ہے۔ یہ شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر خطوط مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں اس بزرگ نے اپنے فلسفہ وحدت الشہود اور دیگر روحانی عقائد کی تشریح کی ہے۔ بہت سے خطوط اکبر اور جہانگیر کے امرا کے نام ہیں جن میں بہت پرجوش زبان اور پیرایہ میں امرا کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ الحاد و بدعت کی بڑھتی ہوئی رو کو روکیں اور اسلام کی عظمت کو زندہ کریں۔

متفرقات : عہد مغلیہ میں ادبی سرگرمیاں بہت وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی تھیں اور ایک مختصر خلاصہ میں ان کا پوری طرح ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے صرف چند ادبی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور قابل ذکر کتاب دبستان مذاہب ہے جس کا امریکی مصنفین نے ترجمہ کیا ہے اور اس کا نام (School for Manners) یعنی کتاب الاداب رکھا ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب مختلف مذاہب کی تاریخ ہے جسے سترہویں صدی میں ایک آزاد خیال مسلمان نے لکھا اور جس میں زرتشتیوں کے مختلف فرقے، ہندو فلسفہ کے مختلف مکاتیب، بدھ، یہود اور نصرانیوں کی تعلیمات اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا حال لکھا گیا ہے۔

(ب) اردو ادب :

Marfat.com

سولھویں اور سترھویں صدی میں اردو ادب کا مرکز بیجاپور اور گول کنڈہ کی حکومتیں تھیں۔ وجہی اور غواصی نے اردو مثنوی کا انداز فارسی مثنوی سے ملا دیا۔ وجہی کا سب رس جو درباری عشق کی ایک رمزیہ داستان عشق ہے' اردو میں بیانیہ نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ دکنی اردو کا سب سے بڑا شاعر ولی (1668ء-1744ء) ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی فتح دکن کے بعد مغل لشکر کی مروجہ اردو بول چال سے واقف ہوا۔ ولی نے دکنی محاورات کو شمال کی شائستہ تر اور فارسی سے متاثر بولی سے آمیزش دے کر اردو شاعری کے ایک نئے اور ترقی یافتہ مکتب کی بنیاد رکھی جس کا آغاز مغلیہ دارالسلطنت دہلی سے ہوا۔ ولی کے ساتھ علاقائی اردو ادب ختم ہو گیا اور اس روایتی شاعری کی ابتدا ہوئی جس کی نشوونما ایک صدی سے زائد تک شمالی ہند کے مرکزوں یعنی دہلی اور لکھنؤ میں ہوئی۔

دہلی میں اردو شاعری سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آئی۔ اس دور کا تذکرہ ڈاکٹر پرسیول اسپیر نے اپنی کتاب (THE TWILIGHT OF THE MOGHALS) میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس تمام پر آشوب دور میں دہلی ہی مسلم تہذیب کا گہوارہ رہی اور دہلی ہی میں بہترین اردو ادب پڑھا لکھا جاتا رہا۔

اس زمانہ میں میر (1724ء1808ء) نے جذباتی و داخلی اور ان کے ہم عصر سودا (1713ء1780ء) نے اپنے عہد و رجال پر طنزیہ شاعری کی۔ میر نے اردو غزل میں شیرینی' نرمی اور گھلاوٹ پیدا کی اور اسے جذبات و محسوسات کا آئینہ بنا دیا۔ ذیل کے اشعار سے ان کی ان صفات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:

دل پر خول کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے
جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج
رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

○

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند

Marfat.com

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو تم ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

سودا میر سے مختلف اور قدرے سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ ان کا مزاج ایک طرح پر یورپی شاعر ڈبیلے سے ملتا ہے۔ اگرچہ خاص طنز میں وہ ڈرائڈن سے قریب تر ہیں۔ میر و سودا کے ایک ہم عصر مشہور درویش صوفی خواجہ میر درد 1720ء-1884ء تھے جو اپنے عہد و ماحول کے انتشار کی تاب نہ لا کر باطن کی پاکیزگی اور روحانی مسرت کے سر چشمہ یعنی تصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔

نمونہ کلام:

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلہ کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً" لیکن
میں نے پوچھا تو کہا خیر' یہ مذکور نہ تھا
محتسب آج تو میخانہ میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا
درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانے
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

○

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

Marfat.com

اس کے بعد مصحفی (1750ء1824ء) نے غزل کی اصلاح کی اور کہیں کہیں وہ زاہدانہ عشق میں لطافت پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔

اسی اثنا میں دہلی کا سیاسی و معاشرتی انتشار اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ دہلی کے شعرا بہ شمول میر، سودا و مصحفی مجبور ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں توابان اودھ اپنی تنزل پذیر ریاست کو زندہ رکھنے میں پورے اہتمام سے مشغول تھے۔ دہلی کے ایک اور شوخ طبع شاعر انشا (1757ء1817ء) بھی لکھنؤ پہنچ گئے۔ ان سے اور مصحفی سے جو طبعاً" سنجیدہ تھے، بزلہ سنجی اور مزاح کے میدان میں بعض بڑے دلچسپ معرکے رہے۔ دربار اودھ کی سرپرستی میں ایک نئی قسم کی شاعری کو فروغ حاصل ہوا جس کی خصوصیت دہلی کی صفائی کے مقابلہ میں انداز بیان اور موضوع سخن میں نسائیت تھی۔ اسی کے ساتھ ناسخ (متوفی 1838ء) کی سرکردگی میں صفائی زبان کی تحریک کا آغاز ہوا۔ عملی اعتبار سے اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرز بیان میں ایک طرح کی یکسانیت آگئی اور زبان میں جمود سا پیدا ہو گیا۔ حالانکہ فطری اور تاریخی لحاظ سے اردو میں ہر قسم کے خیالات اور انداز بیان کے جزب ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔

مگر لکھنؤ اسکول کی شاعری کا ایک خوش آئند پہلو بھی ہے۔ اس کی نمائندگی خواجہ آتش (1778ء1846ء) کرتے ہیں جو کبھی کبھی اس اسکول کی رکیک اور پست سطح سے بلند ہو کر حقیقی شاعری کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ان کا شاعرانہ بیان لکھنؤ کے عام اساتذہ کی روش کے خلاف انتہائی پر خلوص ہو جاتا ہے۔ مثلاً" ان کی یہ غزل مشہور ہے:

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکالے تھے دو چاند اس نے مقابل
وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا
عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرحناک تھی روح دل شادماں تھا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

اسی کے بعد لکھنؤ کے نسبتاً" نو شعرا میں ایک مذہبی تحریک شروع ہوئی۔ ان میں دو شاعر زیادہ مشہور ہوئے انیس (1802ء1874ء) اور دبیر (1803ء1875ء) جنھوں نے شہادت حسینؓ کو اپنا موضوع بنایا۔

اب دہلی کی فضا میں کچھ مکدر سا اطمینان پیدا ہو گیا تھا۔ آخری مغلیہ سلاطین کے بعد جن

Marfat.com

کی حکومت لال قلعے کے نواح تک محدود ہو کر رہ گئی تھی' ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ حالات کچھ سنبھل گئے۔ اس آخری دور کی شاعری خاصی بامزہ ہے۔ مومن (1799ء1851ء) نے بڑے خلوص کے ساتھ مادی عشق کا ترانہ گایا۔ سودا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ذوق نے قصیدہ کی زمین کو آسمان پر پہنچا دیا۔

لیکن اس دور کا سب سے بڑا شاعر غالب (1796-1869) ہے۔ ابتدا میں ان پر سترھویں صدی کے مشہور ہندی نژاد فارسی شاعر' بیدل کا اثر تھا۔ غالب کے لئے یہ طرز صرف ایک نقطۂ آغاز کا کام دیتا ہے جہاں سے انھوں نے ایک مکمل اشاریت کے ذریعہ اپنے تخیل کا اظہار سیکھا۔ غالب کے کلام میں ہمیں کسی مستقل فلسفہ کا اظہار نہیں ملتا۔ بقول پروفیسر احمد علی "انھوں نے انگریزی کے مابعدالطبیعیاتی شعرا کی طرح مختلف النوع خیالات کو بڑی تندی کے ساتھ ربط دے دیا ہے' انھوں نے احساس اور تخیل کے امتزاج سے ایک نئی موسیقی اور ترکیب پیدا کی جذبہ میں تخیل اور تخیل میں جذبہ کی ہم آہنگی کوئی غالب سے سیکھے۔ انھوں نے ان خیالات و تصورات کا جو تخیل کی رسائی سے بھی پرے ہیں تجزیہ کیا اور انھیں بڑے اثر کے ساتھ ادا کیا"۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہی راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غالب کے ساتھ ایک عہد ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی ذات سے رسمی شاعری بے جان معلوم ہونے لگی۔ اور ایک نئی طرز کی بنیاد پڑی جس سے بعد کے تمام شعرا متاثر ہوئے۔ غالب نے کہا تھا:

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے!

چنانچہ انھوں نے غزل کی تکنک اور طرز بیان میں ایک انقلاب برپا کر دیا بعد میں ایک اور زبردست انقلاب آیا جس نے اردو شاعری کا موضوع' مزاج اور کیفیت ہی بدل دی۔

ہمارا اشارہ 1857ء کے ہنگامہ کی طرف ہے۔ آزادی کی راہ میں پہلی غیر مربوط اور بے

Marfat.com

اصول فوجی جدوجہد جس نے سارے برصغیر کو ہلا دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے زوال پر مہر لگا دی۔ اب ان کی دو ہی راہیں تھیں۔ یا تو وہ آہستہ آہستہ صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں یا کم از کم ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے زندہ رہنے کی غرض سے فاتح قوم کی تہذیب اپنے اندر جذب کر لیں۔ دہلی اس آگ کی لپیٹ میں آگئی اور برائے نام آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر (1775ء1862) جو خود شاعر تھے برما میں جلا وطن کر دیئے گئے۔ ظفر کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

اس کے بعد برصغیر ملکہ وکٹوریہ کے زیر سلطنت آگیا اور اردو ادب میں وکٹوریائی عہد کی خصوصیات پیدا ہونے لگیں۔

سید احمد خاں (1817ء1898) نے اردو نثر میں ایک کاروباری، رواں اور ستھرا انداز بیان اختیار کیا۔ یہ ایک نئی اپچ تھی۔ اس لئے کہ اس وقت تک اردو نثر میں تکلف و تصنع کا رواج تھا۔ بہر حال قافیہ پیمائی، عبارت آرائی، صنائع بدائع، جملوں کی نشست و ساخت میں وزن کی پابندی، انتخاب الفاظ وغیرہ پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ جن و پری کی کہانیوں اور طلسماتی داستانوں کی بھرمار تھی۔ شاذونادر موعظت و اخلاق کے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جاتا تھا۔ اردو نثر کو اس طلسم سے کسی حد تک غالب آزاد کر چکے تھے جن کے خطوط مکالماتی نثر کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر مغرب کا پہلا نمایاں اور صحت مندانہ اثر 1800ء میں محسوس ہونا شروع ہوا جب ڈاکٹر گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں آزاد اور سادہ نثر کی تحریک کی سرپرستی کی۔ اس تحریک کا پہلا نتیجہ میرامن دہلوی کی باغ و بہار میں ظاہر ہوا۔ سرسید کی شخصیت نے محسوس کر لیا کہ نثر میں ایک سادہ اور عام فہم پیرایہ بیان اور روزمرہ کے ذخیرہ الفاظ میں وسعت پیدا کئے بغیر مغربی علوم و فنون و خیالات آسانی سے نہیں پیش کئے جا سکتے۔ انھوں نے آثار قدیمہ، فن تعمیر، مذہب، علم کلام، اخلاقیات، فلسفہ، تعلیم اور سیاسی مسائل پر بکثرت کتابیں اور مضامین شائع کئے اور موجودہ اردو اخبار نویسی کی بنیاد رکھی۔ سرسید کی نثر نے اردو زبان میں نئی وسعتیں اور امکانات پیدا کر دیئے اور تاریخی و ادبی علمیت نیز تنقید کی راہیں کھول دیں۔

سرسید کے رفقاء میں مولانا شبلی (1857ء1914) نے مشرقی علوم سے اپنی بے پناہ واقفیت کو

Marfat.com

اسلامی تاریخ کی تدوین و تجدید کی راہ میں صرف کیا۔ شبلی نے ایران کی ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کے سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ سرسید کے ایک اور رفیق کار مولانا نزیر احمد تھے جنھوں نے اصلاحی قصے تصنیف کر کے اردو میں ناول نویسی کی بنیاد رکھی۔ منشی ذکاء اللہ دہلوی نے متفرق موضوعات پر تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ مگر سرسید کے غالبا" سب سے بڑے رفیق کار جو اپنے دل میں سارے جہاں کا درد رکھتے تھے مولانا حالی (1837ء1914) تھے۔ یہ ادبی نقاد اور سیرت نگار تھے۔ حالی نے نثر میں سرسید کی صفائی اور سادگی نہ صرف قائم رکھی بلکہ انداز بیان زیادہ شستہ ورداں کر دیا۔ حالی کی نثر پر ایک اور صاحب کمال کا بھی اثر پایا جاتا ہے جو سرسید کے حلقہ اثر سے باہر تھے۔ یہ بزرگ مولانا محمد حسین آزاد (1834ء1910) تھے۔ آزاد کی نثر میں بلا کی رنگینی و دل کشی پائی جاتی ہے۔ انھیں اصلی یا فرضی واقعات اور قصے لکھنے کا خاص ڈھب آتا تھا۔ اس خصوصیت کی وجہ سے ان کی ادبی تاریخ کی حیثیت کم ہو جاتی ہو مگر پڑھنے والے کی دل چسپی بڑھ جاتی ہے۔

حالی بہ حیثیت ایک شاعر کے غالب اور اقبال کے درمیان ایک زبردست کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالی نے شاعری کو صدہا برس کی پرانی بندشوں سے آزاد کر دیا۔ انداز بیان میں صفائی پیدا کی اور اسے تقریبا" سہل ممتنع کا درجہ دے دیا۔ ان کا شاہکار مسدس ہے جس کا موضوع اسلام اور اس کا احیاہے۔ یہ نظم اردو میں بڑی پر شکوہ' زور دار اور پر اثر ہے۔ اردو شاعری میں یہ ایک بالکل نئی چیز تھی جس نے ایک نئی طرز شاعری کی بنیاد رکھ دی۔ اسی نظم نے اردو غزل کی فرسودہ عاشقانہ شاعری پر بھی ضرب کاری لگائی۔

وہ لقمان و سقراط کے درمکنوں
وہ اسرار بقراط و درس فلاطوں
ارسطو کی تعلیم' سولن کے قانوں
پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہر سکوت ان کی ٹوٹی
اسی باغ رعنا میں بو ان کی پھوٹی

Marfat.com

○ باب 19

مغل مصوری

(MUGHAL PAINTING)

دربار مغلیہ کی رنگین مصوری مغربی فن نقاشی سے کئی لحاظ سے مختلف ہے۔ تصویر کو چوکھٹے پر چڑھا کر اس میں روغنی رنگ بھرنے کے فن سے اس زمانے کے لوگ نا واقف تھے اور جداری نقاشی کو چھوڑ کر نقاش کا کام فقط یہ رہ گیا تھا کہ قلمی کتابوں کے مضامین کو تصاویروں کے ذریعے واضح کر دیں یا کاغذ پر اور بہت شاذ صورتوں میں کپڑے پر چھوٹے پیانے کی تصویر کشی کی جائے۔

یہ ایک غیرمذہبی اور امیرانہ فن ہے' جو بہت حد تک مطابق حقیقت (Realistic) ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اعلیٰ طبقے کی زندگی کے مناظر کے خاکے پیش کئے جاتے ہیں' افراد و مجالس کی شبیہ کشی ہو جاتی ہے اور جانوروں کی تصویریں اور شکار اور جنگ کی کیفیات نظر کے سامنے لائی جاتی ہیں۔ اپنے فنی محاسن سے قطع نظر تاریخ کا ضمیمہ اور تتمہ ہونے کے لحاظ سے بھی یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں ان بادشاہوں اور امراء کے مذاق اور حالات زندگی کی ذرا ذرا سی تفصیل کا پتا چلتا ہے جن کا تعلق تاریخ کے انتہائی درخشندہ اور دلاویز درباروں سے تھا۔ مزید برآں ان تصاویر میں طبقہ امراء کے علاوہ اس زمانے کے غریب عوام کی زندگی کی بہت سی جھلکیاں بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔

عوامی یا روستائی فن کے مقابلے میں اس میں آلات و سامان نقاشی کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ کاغذ' جو هندوستان میں 1400ء کے قریب آیا بڑی احتیاط سے تیار کیا جاتا تھا۔ اسے مہرے سے چکنا کیا جاتا پھر اس پر اصل تصویر کا خاکہ کھینچا جاتا اس خاکے پر ایک سفید مسالے کی تہ چڑھائی جاتی اور اس مسالے کے اوپر سے پہلے خاکے پر قلم پھیر کر اسے اجاگر کیا جاتا تھا۔ رنگوں کو کسی چپکنے والی چیز کے محلول میں گھولا جاتا تھا اور مختلف اقسام کے مو قلموں سے اس خاکے پر رنگ چڑھائے جاتے تھے۔ سب سے باریک قلم اس کام کے لئے گلہری کے بچے کی دم کے بالوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ رنگ بھی زیادہ تر مختلف اقسام کی معدنیات سے بنائے جاتے تھے اور ان میں سے بعض بہت قیمتی ہوتی تھیں' جیسے سونا' سفوف لاجورد' شنگرف' ہڑتال زرد' وغیرہ۔

مغل مصوری بلا شبہہ وہ فن ہے جس کی پرورش خاندان مغلیہ کے ابتدائی بادشاہوں نے کی اور اسے اپنے شخصی مذاق کے مطابق ڈھالا۔ اسے ایک صدی سے زیادہ عرصے تک' یعنی سولھویں صدی کے وسط سے سترھویں صدی عیسوی کے اواخر تک عروج حاصل رہا۔ اس کے بعد یہ اپنی امتیازی خصوصیات سے تو محروم ہو گئی' لیکن اس کا اثر دور دور تک پھیل گیا اور التفات

Marfat.com

شاہانہ سے محروم ہو کر بھی یہ بہت زمانے تک قائم رہی۔ یہ فن مخصوص حالات کی بناء پر وجود میں آیا۔ جب مغلوں کے دوسرے بادشاہ ہمایوں کو اپنے وطن ہندوستان کو چھوڑ کر باہر جانا پڑا تو اس نے ایران کے شاہ طہماسپ (صفوی) کے پاس پناہ لی۔ ایرانی نقاشی، جس کے انحطاط کا زمانہ اب دور نہ تھا، شاہ کی ماہرانہ سرپرستی میں اپنی پرانی اور پختہ آب و تاب کے آخری ایام گزار رہی تھی۔ ہمایوں واپسی میں اپنے ساتھ دو بڑے ایرانی مصوروں، میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد، کو کابل لیتا آیا۔ جب اسے دوبارہ تخت و تاج نصیب ہوا تو ان دو استادوں کے زیر نگرانی ایک بڑا اولوالعزمانہ کام شروع کیا گیا اور وہ یہ کہ مشہور داستان امیر حمزہ سے متعلق 1400 تصاویر کپڑے پر بنائی جائیں۔ حسب روایت اس کام پر پچاس مصور لگائے گئے، جن میں سے بہت سے یقیناً ہندوستانی تھے۔ ان میں سے سو سے زیادہ تصویریں مختلف ذخائر میں آج تک باقی ہیں۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا اہتمام اکبر نے جاری رکھا اور کوئی 25 سال تک یہ کام جاری رہا۔ اس دوران میں مغل فن کاروں کو اس بات کے بہت اچھے مواقع دستیاب ہوتے رہے کہ وہ اپنے فن کے مخصوص طریق کار (Technique) کی مشق کریں اور اپنے تصورات میں ہم آہنگی پیدا کریں۔

ان رنگین تصاویر سے واضح ہوتا ہے کہ ایرانی اسلوب کی کورانہ پیروی ہرگز نہیں کی گئی، اگرچہ بعض تصاویر کی وضع و ساخت نمایاں طور پر ایرانی ہے اور اشکال کشی کے انداز اور ان کی ترتیب میں ایرانی اثر تمام تصاویر پر غالب نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں فن نقاشی بہت قدیم زمانے سے موجود تھا، اور تقریباً" اسی زمانے، یعنی سولھویں صدی کے وسط میں، جب کہ داستان امیر حمزہ کی تصویریں بن رہی تھیں ہندوستان کے اندر میناتوری یا کتابی نقاشی (Miniature) کے کئی مستقل دبستان پیدا ہو چکے تھے، خصوصاً" مغربی ہند اور دکن میں اس فن کا بڑا چرچا تھا۔ اگرچہ ہمیں ان حالات کا جن کے تحت نقاشی کی ان مختلف انواع کی بنیاد پڑی ٹھیک علم نہیں، پھر بھی یہ بات واضح ہے کہ شروع شروع میں اگر وہ مرکز کے زیر اثر تھے بھی تو وہ اثر بہت ہی کم تھا۔

مغربی ہند کی ابتدائی مصوری، جس کے موضوع اہل ہند کے وشنومت کی مزہبی کتابوں سے یا سلسلہ راگ مالا کے گیتوں سے ماخوذ تھے، مغلیہ طرز سے قطعی مختلف تھی، لیکن اس کے مقابلے میں دکن کی اسلامی سلطنتوں کا فن، جو فنی ترتیب و تنظیم اور لباس و طرز تعمیر کی تفصیلات میں واضح طور پر اسلامی مصوری کی روایات کا حامل ہے، غالباً" ایران سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، جس کے ساتھ دکن کے بہت قریبی روابط تھے۔

بہر حال اہم بات یہ ہے کہ ابتدائی مغل مصور اور نقاش، جو بظاہر ہندوستان کے مختلف حصوں کے رہنے والے تھے، اپنے ساتھ اچھا خاصا تجربہ لے کر آئے تھے، جس نے اس نئے اسلوب کی تشکیل میں حصہ لیا۔

Marfat.com

ایرانی استادوں نے اپنے شاگردوں کی بہت اچھی طرح تربیت کی: تکنیک، مثلاً" رنگوں اور کاغذ کی تیاری، میں بھی اور مذاق کو لطیف بنانے اور بہت سی جزئیات کو ایک ہی جگہ اکٹھا کر دینے کے رجحان کو روکنے کے سلسلے میں بھی۔ انھوں نے مقامی فن میں بعض ایسی روایات کی ترویج کی جنھیں ایرانی مصور صدیوں سے ترقی دینے میں مصروف تھے، مثلاً" تصویر کا پہاڑی پس منظر اور تصویر میں کئی نقطہ ہائے نظر کا پیدا کرنا۔ حقیقت میں بعض ابتدائی مغل رنگین تصویروں کو ایران میں بنی ہوئی تصاویر سے متمیز کرنا مشکل ہے، پھر بھی مغل تصاویر شروع ہی سے اپنی خصوصیات کے لحاظ سے عموماً" واضح طور پر ھندوستانی معلوم ہوتی ہیں۔

ہم اکبر کے مصاحب اور مؤرخ ابوالفضل کے احسان مند ہیں کہ اس کی بدولت ہمیں اکبر کے نگار خانے کا تھوڑا بہت حال معلوم ہو سکا ہے۔ نقاش اور مصور شہنشاہ کے نجی تنخواہ دار ملازم تھے اور وہ خود ان کے کام کا ہفتہ وار معائنہ کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جن قلمی نسخوں کو مصور کرنا منظور ہوتا تھا ان کے انتخاب کے معاملے میں بھی اور افراد کی تصویریں بنانے میں بھی اس کی ذاتی پسند کو دخل ہوتا تھا، اکبر کے اپنے محل میں ایک چھوٹا سا نگار خانہ تھا، جس میں اس کے دربار کے سب سربرآوردہ لوگوں کی تصویریں موجود تھیں۔ ایرانی مصوری میں اصل چیز آرائش تھی اور شبیہ کی اصل سے ہوبہو مطابقت کا خیال شاذ و نادر ہی رکھا جاتا تھا۔ الگ الگ تصویریں کھینچنے کے رواج سے بلا شبہہ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مصوروں میں اشیاء کو بغور دیکھنے کی عادت پیدا ہوئی اور مظاہر فطرت اور جانوروں، درختوں اور مناظر کی تصویر کشی میں حقیقت طرازی کا وہ میلان پیدا ہوا جس میں ھندوستانی مصور ماہر و ممتاز سمجھے جاتے تھے۔

کبھی کبھی متعدد مصور مل کر بھی ایک چھوٹی سی تصویر بناتے تھے، جیسا کہ کتبات سے ظاہر ہوتا ہے، مثلاً" ایک آدمی خاکہ کھینچتا تھا اور دوسرا رنگ بھرتا تھا، یا پھر تصویر میں چہرے بنانے کا کام ایک خاص مصور کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ھندو مصوروں میں سب سے مشہور دسونت اور بساون تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اور مصوروں کے نام بھی ملتے ہیں۔

اکبر کے عہد میں جن صدھا فارسی مخطوطات کو مصور کیا گیا ان کے موضوع بے شمار تھے، لیکن ان میں خصوصاً" وقائع و سوانح، تاریخ، کہانیاں اور افسانے، کتب حکایات، فارسی اور سنسکرت رزمیے شامل ہیں۔ اکبر کے زمانے کا سب سے پرانا مغل مخطوطہ کہانیوں کی ایک کتاب انوار سہیلی ہے، جو لنڈن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں موجود ہے۔ اس پر 978ھ/1570ء کی تاریخ درج ہے۔ اس مخطوطے میں جانوروں کی تصویریں آزاد قلم اور طبعی ہیں۔ چند دوسرے قدیم مخطوطات اس عہد کی صورت گری کو اس سے بہتر طور پر عیاں کرتے ہیں۔ یہ صورت گری اسی وقت سے جرائت مندانہ اور متنوع ہے۔ رنگ آرائی میں، جو بہ نسبت ایرانیوں کے زیادہ سیاہی مائل ہے، ایک انفرادیت نظر آتی ہے، لیکن ابھی اس میں بہت زیادہ لطافت اور نفاست پیدا نہیں ہوئی ہے۔

Marfat.com

انوار سہیلی کے مذکورہ بالا مخطوطے کے کوئی پندرہ سال بعد جے پور کا رزم نامہ سامنے آتا ہے' جس میں تصویروں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ یہ سنسکرت مہا بھارت کا ترجمہ ہے۔ اس کی تصاویر میں دکن کے اسلوب مصوری کی جھلک نمایاں ہے۔ اس ضخیم کتاب کی رنگین تصاویر' جو جزئیات و تفصیلات کی ثروت میں ھندی ہنرمندی کا بڑا مکمل نمونہ ہیں' اسلوب کے اعتبار سے ایرانی ہونے کی بہ نسبت ھندوستانی زیادہ ہیں۔ یہی بات اکبری عہد کی تقریباً" بست سالہ مینا توری مصوری پر بھی صادق آتی ہے' لیکن ان آخری سالوں کے دوران میں مصوری کے اسلوب میں نمایاں تغیر آگیا۔

ایرانی اور ھندوستان میں ابتدائی عہد مغلیہ کی کتابی تصویریں ذوبعدین یا دو رخی ہونے میں یکساں ہیں' البتہ مغربی مصوری کی سی ترتیب و تشکیل' تناظر اور سائے ان میں نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ ان تصویروں میں چہرے کے مختلف اوضاع کے اظہار کی کوشش بھی شاذ و نادر ہی کی گئی ہے۔ ایران میں اصل مطابقت کو ہر جگہ آرائش و زیبائش کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی جاتی تھی : آسمان سنہری اور مرغزار ارغوانی ہو سکتا ہے اور اگرچہ وحشی جانوروں کی تصویر ٹھیک بنائی جاتی ہے' لیکن گھوڑے اتنے نازک اور نفیس بنائے جاتے ہیں کہ حقیقت میں ان کا ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ھندوستانی فن کاروں نے ان میں سے بعض خصوصیات میں پہلے ہی سے ترمیم کر دی ہے اور ان کے ہاں طبعی اوضاع و اشکال سے مطابقت کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے' لیکن دھوپ چھاؤں کا فرق دکھانا اور تناظر کو پیش کرنا عہد اکبری کی ابتدائی نقاشی میں موجود نہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کا آغاز مغربی فن سے رفتہ رفتہ روشناس ہونے کے بعد ہوا۔ اس فن سے تعارف کا پہلا موقع عیسائی مبلغوں کی ان تین جماعتوں کی معرفت ملا جنہیں 1580 اور 1605ء کے درمیان دربار اکبری میں باریابی حاصل ہوئی تھی۔ یوں تو ان عیسائیوں کے 1580ء میں فتح پور سیکری پہنچنے سے پہلے ہی اکبر کے طعام خانے میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شبیہیں رکھی جا چکی تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام (اور بعض دوسری مقدس ہستیوں) کی شبیہیں بھی موجود تھیں' لیکن اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ شہنشاہ اکبر کو یورپی مصوری سے کوئی سابق تعارف تھا۔ ان عیسائیوں نے' جیسا کہ ان کے اپنے بیانات سے ظاہر ہے' نہ صرف اپنی مصور مذہبی کتابیں بادشاہ کو دکھائیں بلکہ اسے کچھ مذہبی تصاویر تحفے میں بھی دیں' جو معلوم ہوتا ہے کہ فلمش (Flemish) طرز پر تیار کی گئی تھیں۔ یہاں کے مصوروں نے ان تصاویر کی نقل کر کے انھیں اپنے مذاق کے مطابق درست کر لیا اور اس طرح وہ مغربی مصوری سے آشنا ہوئے۔ ابوالفضل اپنے بادشاہ کے مصوروں کی تعریف میں ان کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے : "ان کی بنائی ہوئی تصاویر یورپی نقاشوں کی حیرت انگیز صنائع کے پہلو بہ پہلو رکھی جا سکتی ہیں' گو یورپیوں کی شہرت تمام عالم میں پھیل چکی ہے"۔ یہ آخری جملہ یورپی مصوری کی محض سرسری رسمی مدح سرائی سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔

Marfat.com

مغرب سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد تصویر کشی کے فن میں نقل کی اصل سے مطابقت کے تصور کو یقیناً" تقویت پہنچی ہو گی اور عہد اکبری کے خاتمے سے بہت پہلے تصویروں میں ایرانی انداز کے بلند کوہستانی افق کے بجائے مغربی طرز کے ارضی پس منظر نمایاں ہونے لگے تھے۔ کبھی کبھی مصور انھیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بناتے تھے۔ انسانی شکلیں اس وقت تک بھی کہیں کہیں بے توجہی سے کھینچی گئی ہیں' مثلاً" اکبر نامہ کے ان دو مخطوطات میں جو ذخیرہ چیسٹر بیٹی (Chester Beauty) اور وکٹوریا البرٹ میوزیم میں موجود ہیں لیکن ان تصویروں میں بھی انواع (Types) کے فرق کو اکثر بڑی مہارت سے واضح کیا گیا ہے اور شبیہہ کشی میں بھی مصور کے کمال میں کوئی شبہہ نظر نہیں آتا۔ اس طرح کی تصویر کشی میں در حقیقت بڑا زور' حرکات میں نمایاں جوش اور تیزی اور پیچیدہ مناظر کو قوت کے ساتھ پیش کرنے کی خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔

اکبر کے بیٹے اور جانشین جہانگیر کے عہد (1605 تا 1627ء) میں مغل مصوری اپنے انتہائی نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں مصوری کے متعلق جہانگیر کے مختصر اشارات اور برطانوی سفیر سرتھامس رو (Sir Thomas Roe) اور دوسرے یورپی سیاحوں کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فن سے جہانگیر کو اکبر سے بھی زیادہ شغف تھا۔ وہ اپنے پسندیدہ مصوروں کو انعامات اور خطابات سے سرفراز کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیتا تھا۔ ان میں سے بعض فنکاروں کے کارنامے ابھی تک محفوظ ہیں' جیسے آقا رضا ایرانی' جو ھرات سے آیا تھا اس کا فرزند ابوالحسن' جس کا لقب نادرالزماں تھا اور چرند و پرند کا مصور منصور' جس کے بہت سے فن پارے ابھی تک موجود ہیں اور ان میں اس کے کمال فن کا شائد سب سے زیادہ حیرت انگیز نمونہ وہ گرگٹ ہے جو قصر ونڈسر میں محفوظ ہے۔ اس عہد کے اور دور مابعد کے دوسرے ماہر مصوروں میں گوردھن' گروہ کی تصویر کشی کے استاد بساون کے بیٹے منوہر' عنایت اور بچتر قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ میناتوری اس وقت بھی زیادہ تر مخطوطات ہی میں ہوتی تھی' تاہم ان کے علاوہ بھی تصویر کشی مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ روز بروز عام ہو رہی تھی۔ تصویروں کو ایک جگہ مجلد کر کے بیاضیں یا جنگ (Album) بنا لئے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض بیاضوں کے متعدد شاندار اوراق اب تک محفوظ ہیں۔ ان تصویروں میں الگ الگ افراد کی یا چند اکھٹے آدمیوں کی تصاویر کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ تصویروں کے موضوع اکثر درباری شہزادے اور امراء ہیں' کہیں کہیں مذہبی پیشواؤں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں اور کچھ تصویریں چرند و پرند کی ہیں۔

حاشیوں کو کبھی کبھی خوشنما اور خوبصورت بیل بوٹے یا شکلیں کھینچ کر سجایا جاتا تھا۔ ان اشکال کی اصل تصویر سے مناسبت ہوتی تھی' مثلاً" ایک جوگی کی تصویر کے حاشیوں پر جوگیوں ہی کی شکلیں بنائی جاتی تھیں۔

Marfat.com

اسلوب کا تغیر اگرچہ تدریجی ہے' لیکن اکبری اور جہانگیری عہد کی تصویروں میں نمایاں فرق ہے۔ مستثنیات سے قطع نظر کہا جا سکتا ہے کہ عہد جہانگیری کی مصوری کا رجحان زیادہ تر سکون اور ٹھہراؤ کی طرف ہے۔ اس سے پہلے کی تصاویر میں جو اضطراب پایا جاتا ہے اور پر شوق حرکات ملتی ہیں وہ کسی حد تک اس عہد کی تصاویر میں مفقود ہیں۔ فنی کاریگری کی خصوصیت اور آداب البتہ زیادہ نمایاں ہیں۔ جہانگیری عہد کی تصویروں کے رنگ پہلے سے بہتر ہیں اور ان کے امتزاج میں زیادہ لطافت اور نفاست نظر آتی ہے' حسن ترتیب میں نمایاں ترقی ہے اور شبیہہ کشی میں زیادہ احتیاط اور توجہ سے کام لیا گیا ہے اور وہ زیادہ جاذب نظر ہیں۔

عہد شاہجہانی (1628 تا 1658ء) کی مصوری اور جہانگیری عہد کی مصوری میں تمیز کرنا البتہ آسان نہیں۔ خصوصاً" شاہجہانی عہد کے مرقعوں کی انفرادی تصویریں دیکھ کر کسی طرح کے فنی انحطاط کا احساس نہیں ہوتا بلکہ سادہ خطوط سے بنی ہوئی بعض نازک تصویریں' جن میں سے بعض رنگین بھی ہیں' ایسی ہیں کہ مغل عہد کی پوری مصوری میں ان کا جواب نہیں۔ ان کے علاوہ اس عہد میں تصویروں میں بعض نئے موضوع بھی سامنے آئے' مثلاً" گھریلو خدمت گاروں کا گروہ' یا گانے بجانے والوں کا گروہ' یا رات کے وقت شکار کا منظر پھر بھی بحیثیت مجموعی جوں جوں زمانہ گزرتا گیا فنی محاسن میں نمایاں انحطاط پیدا ہوتا رہا۔ شاجہان کو شائد مصوری سے درباری مصور اس کے عہد میں بھی تصویریں بنانے میں مصروف رہے' البتہ اورنگ زیب کے عہد (1658 تا 1707ء) میں وہ شاہی سرپرستی سے قطعی طور پر محروم ہو گئے۔

فن پر مغل اثر راج پوتانے اور دیگر صوبوں میں دور دور تک پھیلتا رہا۔ جہانگیر کے عہد کے آغاز ہی میں یہ کسی حد تک راج پوتانے کے فن کو متاثر کر چکا تھا اور ایک صدی بعد تو اس کا پورا پورا تسلط ہو چکا تھا' حتیٰ کہ مرکزی دربار کے فن اور دوسرے صوبائی درباروں کے فن میں تمیز کرنا اکثر دشوار ہو جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کی مصوری کے متعلق' جو بڑی خوبیوں کی حامل ہے' یہاں زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں۔ اس زمانے میں دلفریب رومانیت کی طرف میلان زیادہ نمایاں ہے' لیکن درباری زندگی کے مناظر اور شکار کے موضوعات کی بھی کچھ کمی نہیں' مثلاً" شہنشاہ بہادر شاہ کے شیر کے شکار یا ہرن کے شکار کی تصویریں عام ہیں۔ اس سے آگے چل کر قدامت پسندی کی طرف میلان بڑھا اور تصویروں میں انتہا درجے کی یکسانی نظر آنے لگی' گو ایک آزاد اسلوب کی حسین مصوری نے' جو حقیقت میں مغل فن ہی کی رہین منت تھی' پنجاب کی کوہستانی ریاستوں میں جنم لیا اور وہاں انیسویں صدی میں بھی خاصی مدت تک پھلتی پھولتی رہی۔

ہم نے مغل دبستان مصوری کا سرسری ذکر کیا۔ اب ہم مغل مصوری کا عہد وار تذکرہ کرتے ہیں۔

(1) عہد بابر :

Marfat.com

بابر بادشاہ کے دربار میں جو تصویریں بنائی گئیں ان کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ نہیں ہیں۔ حالانکہ عربی مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بادشاہ ایک عالم فلسفی' سیاح جہانگشت' ماہر شکاری اور فطرت کا دلدادہ ہونے کے علاوہ فنون لطیفہ کا سرپرست بھی تھا۔ تاہم اس کے عہد حکومت سے بہت کم تصاویر منسوب کی جاسکتی ہیں۔

(2) عہد ہمایوں :

ہمایوں اپنے باپ بابر کا جانشین بنا' مگر اسے ایک افغان بادشاہ شیر شاہ نے شکست دے کر ملک سے نکال دیا۔ ہمایوں نے اپنی جلا وطنی کے ایام ایران میں بسر کئے جہاں شاہ طہماسپ نے اس کی پزیرائی کی ہمایوں شاہ ایران کے دربار میں وہاں کے بڑے بڑے مصوروں کی تخلیقات سے آشنا ہوا۔ تبریز میں اس نے خواجہ عبدالصمد شیرازی اور میر سید علی سے ملاقات کی۔ بعد ازاں 1549ء میں اس نے ان دونوں استادوں کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی' تاکہ اس کے لئے داستان امیر حمزہ کو مصور کریں۔ جس میں بہادری اور جوانمردی کے فرضی کارناموں کا ذکر ہے۔ اس طرح وہ مصوری کے مغلیہ دبستان کے اصل بانی قرار پائے۔ داستان امیر حمزہ کی کل تصاویر کی تعداد چودہ سو تھی اور کپڑے کے خاصے بڑے بڑے قطعوں پر بنائی گئی تھیں۔

اب ان میں سے جو تصویریں باقی بچی ہیں وہ مختلف مجموعوں میں بکھری پڑی ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد ویانا کے صنعتی عجائب خانہ اور وکٹوریہ اینڈ آرٹ میوزیم لنڈن میں محفوظ ہیں ریاست ہائے متحدہ میں اس نسخے کی تقریباً" پندرہ تصویریں ہیں۔ جن میں سے پانچ مٹروپالین میوزیم میں ہیں۔

(3) عہد اکبر :

اپنے باپ کی طرح اکبر بھی فنون لطیفہ بالخصوص مصوری کا بڑا دلدادہ اور سرپرست تھا۔ اپنی سکونت کے لئے اس نے 1569ء میں ایک نیا شہر فتح پور سیکری آباد کیا۔ اس کے محلات کی دیواریں ایرانی اور ہندی مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں سے آراستہ تھیں۔ اکبر نے مصوری کے ایک سرکاری دبستان کی بنیاد رکھی جس سے تقریباً" ایک سو مصور منسلک تھے۔ ان میں سے بیشتر مقامی تھے' جو ایرانی مصوروں کی رہنمائی میں کام کرتے تھے۔ ابوالفضل کی آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے' کہ ان مصوروں نے فارسی نظم و نثر کی کتابوں کے لئے تصویریں بنائی تھیں۔ مقامی مصوروں نے یہ فن صرف ان ہنرمندوں ہی سے نہیں سیکھا جو دربار شاہی کے ساتھ وابستہ تھے' بلکہ شاہی کتاب خانے میں موجود بہزاد' میرک اور سلطان محمد کے مصور کئے ہوئے قلمی نسخوں سے بھی اکتساب کیا۔ اکبر کے درباری مصوروں نے ان میں سے بعض بہترین تصویروں کی نقلیں تیار ہیں جن کا ایک نمونہ میٹروپالٹین میوزیم کے مجموعے میں بھی موجود ہے۔ یہ ہفت پیکر کا ایک نسخہ ہے جسے شہنشاہ اکبر کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس پر 988ھ 1580ء کی تاریخ درج ہے

Marfat.com

اور اس کی پانچ تصویروں پر بہزاد کے دستخط موجود ہیں مگر ان کو مستند نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان تصویروں کا انداز بہزاد کا نہیں بلکہ بین طور پر تیموری دور کے اوائل کا ہے۔ ان کی رنگ آفرینی اور دیگر خصوصیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عہد اکبری میں پندرھویں صدی کے نسخے سے نقل ہوئی تھیں۔

داستان امیر حمزہ کی مصوری غالباً" 1557ء کے درمیان میں ہوئی۔ ان تصویروں کے ذریعے ہم مغل عمارتوں اور اس عہد کے رسم و رواج کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مناظر' رنگ اور ان کی تزئین و آرائش ایرانی خصائص کی غمازی کرتی ہے۔

کشمیر' گجرات اور پنجاب کے ہندی مصوروں کے اثر سے سولھویں صدی کے خاتمے کے قریب مغل مصوری میں قومی طرز غالب آتا گیا۔ درباری مصوروں کی بعض تصویریں تیمور' بابر اور اکبر کی زندگی کے تاریخی واقعات پر مبنی تھیں۔ اکبر نامہ کا ایک نفیس مگر نامکمل نسخہ چسٹرابیٹی کے مجموعے میں محفوظ ہے۔ اس میں مکند اور گوردھن کی بنائی ہوئی تصویریں شامل ہیں' جو میٹروپالیٹن میوزیم کے وسیع ذخیرہ میں بھی موجود ہیں۔ عہد اکبری کی مصوری کی ایک خاص مثال تیمور نامہ کے ایک نسخے میں دیکھی جا سکتی ہے جس میں طبقہ امراء کے دو ترک قیدیوں کو تیمور کے دربار میں باریاب ہوتے دکھایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے دھرم داس نے بنایا تھا۔ اس میں مغلوں کے اسلوب کی تمام خصوصیات یعنی ایرانی ہندی اور یورپی عناصر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ایرانی انداز ابھی تک موجود تھا۔ مگر شکلیں اور منظر اس طرز سے پیش کئے جاتے تھے جس سے ایرانی مصور ناآشنا تھے۔ یورپی مصوری کے اثر سے مغل مصوروں نے پہلی بار فضائی مناظر کو پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی چہروں اور لباسوں کو اس طرح بنانا شروع کیا جس سے گولائی کا تاثر پیدا ہونے لگا۔ اکبر یورپی تصاویر کا بے حد مداح تھا چنانچہ اس نے بہت سی تصویریں یسوعی مبلغین سے حاصل کیں۔ مارچ 1580ء میں ان مبلغوں کی ایک جماعت فتح پور سیکری پہنچی اور اکبر کی خدمت میں انجیل کا نسخہ پیش کیا جسے فلانڈرز کے مصوروں نے مصور کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کی دو نہایت خوبصورت تصویریں پیش کیں۔

دربار اکبری میں بساون لال اور رسونت کا شمار ہندو مصوروں کی صف اول میں ہوتا ہے۔ بساون عبدالصمد کا شاگرد تھا لیکن اس کا انداز ایرانی روایات سے آزاد تھا۔ ابوالفضل اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ پس منظر' چہرے کے خدوخال کی ترسیم' رنگوں کی تقسیم' شبیہ سازی اور کئی دوسری اصناف میں وہ مصوروں کی بزم کا صدر نشین نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض نقاد اسے دسونت سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ میٹرو پالیٹن میوزیم میں بساون کی ایک دلکش کتابی تصویر محفوظ ہے جو رنگین چاک اور ہلکے خطوط سے بنائی گئی ہے' جس کے فضائی مناظر اور اشکال کی گولائی سے بلاشبہ یورپی اثر ظاہر ہوتا ہے۔

Marfat.com

میٹروپالیٹن میوزیم میں عہد اکبری کی بنی ہوئی کئی اور کتابی تصویریں بھی محفوظ ہیں۔ ان میں فرخ بیگ، ترنگھ، منوہر اور کھیم کرن کی دستخطی تصویریں بھی ہیں۔ اس سلسلے میں مہابھارت کے فارسی ترجمے رزم نامہ کے ایک قلمی نسخے کی تین تصاویر بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان میں بہترین تصویر وہ ہے جس میں سری کرشن گوردھن پربت اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(4) عہد جہانگیری :

جہانگیر بھی فنون لطیفہ کا بڑا سرپرست تھا۔ اس کے زمانے کی تصویریں مجموعی طور پر مغل طرز کی ہیں، لیکن ان میں ابھی تک ایرانی اثرات نظر آتے ہیں۔ جہانگیر کا ذاتی میلان کتابی مصوری کی بہ نسبت ایسی تصاویر کی طرف زیادہ تھا جن میں واقعات زندگی، نباتات اور حیوانات کی نقاشی کی جائے کیونکہ فطرت پرست ہونے کی وجہ سے ان چیزوں میں اس کی دل چسپی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سفر میں دو تین درباری مصوروں کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا تاکہ وہ اہم واقعات کو تصویر کشی کے ذریعے محفوظ کرلیں۔ منصور، مراد اور منوہر پرندوں اور جانوروں کی تصویر کشی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ منصور پھولوں کی تصویریں بھی بناتا تھا۔ چنانچہ اس کی اس مہارت کا ذکر توزک جہانگیری میں کئی جگہ ملتا ہے۔ استاد منصور نادرالعصر ہوچکا ہے اور نقاشی میں اس زمانے کا کوئی شخص اس کا ہم پایہ نہیں۔ نواح کشمیر میں جو پھول دیکھنے میں آتے ہیں ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ استاد منصور نے ایک سو سے زیادہ پھولوں کی تصویریں بنائی ہیں۔ منصور کی اس قسم کی واحد دستخطی تصویر کتاب خانہ حبیب گنج، علی گڑھ کی ایک بیاض میں محفوظ ہے۔ میٹروپالیٹن میوزیم میں تیتر کی نہایت عمدہ تصویر موجود ہے جس کے پس منظر میں ایک خوبصورت قدرتی نظارہ اور پھولوں کی مختلف اقسام دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس تصویر کو استاد موصوف کے باکمال شاگرد سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہ شاہ جہاں کی ایک تصویر کی پشت پر چسپاں ہے۔

جہانگیر کے عہد میں شبیہ سازی بے حد مقبول ہو گئی تھی۔ دربار سے وابستہ شبیہ سازوں میں بشن داس، منوہر، محمد نادر ابوالحسن اور گوردھن کے نام بہت مشہور ہیں۔ جہانگیر کا دل پسند شبیہ ساز ایک ایرانی ابوالحسن تھا جو آقا رضا کا بیٹا تھا۔ جہانگیر نے اسے نادرالزماں کا خطاب دیا تھا۔ میٹروپالیٹن میوزیم میں عہد جہانگیری کی جو تصویریں محفوظ ہیں ان میں ایک نفیس کتابی تصویر بھی ہے جس میں شہنشاہ دو ہاتھوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ان تصاویر کو عہد مغلیہ کے پختہ اسلوب مصوری کی بہترین مثالوں کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ دربار مغلیہ کے مصوروں کا ایک مرغوب طبع موضوع یہ تھا کہ شہزادوں اور امیروں کو کسی ہندو سادھو یا جوگی سے بات چیت کرتے ہوئے دکھائیں اس قسم کی ایک ممتاز تصویر میٹروپالیٹن میوزیم میں موجود ہے جس پر منوہر داس کے دستخط ثبت ہیں۔ ایک اور تصویر میں جو ہونہار کی بنائی ہوئی ہے جہانگیر کو ایک جوگی کے ہاں جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

(5) عہد شاہ جہاں اور عہد اورنگ زیب :

Marfat.com

شاہ جہاں کے عہد میں مغلوں کا فن شبیہ سازی اوج کمال پر پہنچ گیا۔ اکیلی شبیہوں اور دربار کی مجموعی تصویروں سے شاہانہ شان و شوکت عیاں ہے۔ میٹروپالیٹن میوزیم میں شاہ جہان کی دو مشہور شبیہیں ہیں۔ ایک میں شہنشاہ لباس زیب تن کیے تخت طاؤس پر بیٹھا ہے۔ دوسری میں وہ پورے شاہان تجمل کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہے۔ رنگ چمک دار ہیں۔ چہرے نہایت نفاست سے بنائے گئے ہیں اور بعض مقامات پر انتہائی باریک جزئیات بھی آشکارا ہیں۔ اس دور کے مشہور ترین مصور محمد فاخراللہ خان' میرہاشم ہونہار' بچتر اور انوپ چھتر تھے۔ انوپ چھتر کی بنائی ہوئی سید امیرخان کی ایک شبیہ میٹروپالیٹن میوزیم میں موجود ہے۔

شاہ جہان کا فرزند داراشکوہ بھی فنون لطیفہ کا سرپرست اور تصاویر جمع کرنے کا شائق تھا۔ اس شہزادے کی کئی تصاویر ملتی ہیں۔ اسے تخت حکومت پر بیٹھنے کا موقع نہ مل سکا اور اس کا چھوٹا بھائی اورنگ زیب ہندوستان کا شہنشاہ بنا۔ میٹروپالیٹن میوزیم کی ایک تصویر میں داراشکوہ گھوڑے پر سوار ہے اور اس کے ملازمین اس کے ارد گرد کھڑے ہیں۔

اورنگ زیب کے عہد میں بہت کم مصور شاہی دربار کے ساتھ وابستہ تھے لیکن امیراور منصب دار نجی طور پر مصوروں کو اپنے ہاں ملازم رکھنے لگے۔ میٹروپالیٹن میوزیم کی کئی تصویریں اس دور سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ شاہی سرپرستی سے محروم ہونے اور چند دیگر اسباب سے مغل مصوری اٹھارویں صدی میں زوال پذیر ہو گئی۔

Marfat.com

باب 20

مغل فن تعمیر

(MUGHAL ARCHITECTURE)

مغل خاندان کے بادشاہ ہندوستان میں اپنے ہمراہ بڑے قوی وسط ایشیائی رجحانات اور حسن فطرت کا ایک گہرا احساس لائے تھے' لیکن ان میں سے ہر فرمانروا نے اپنی جبلت' افتاد طبع اور تعلیم و تربیت کے مطابق عمل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی خاص مکتب فن کی سرپرستی نہیں کی بلکہ رفتہ رفتہ فنکاروں کی ایک مخلوط اور ہمہ گیر جماعت سے کام لینے لگے' جس میں ایرانی بھی تھے اور ہندوستانی بھی' ترک بھی تھے اور یورپین بھی اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے قواعد و اصول فن اپنے آقاؤں کی فنی افتاد طبع کے مطابق ڈھالنے پڑے۔ عام طور پر مغل بادشاہوں نے انسانی شکل کی بت سازی کی ممانعت جاری رکھی' لیکن راسخ العقیدہ یونانی کلیسا کی طرح اس کی تصویر بنانے کے معاملے میں انھوں نے عموماً" کم سختی برتی' بلکہ فن شبیہ نگاری (Partraituros) کی تربیت کرتے رہے' یہاں تک کہ یہ فن ایک بہت بلند سطح کو پہنچ گیا۔ بایں ہمہ چند ایک مستثنیات سے قطع نظر اکثر مغل عمارتیں مذہبی قسم کی تھیں' جن میں مساجد اور مقابر یا درگاہیں شامل تھیں۔ اگرچہ ان عمارتوں کا میدان تنگ تھا' تاہم اپنی حدود کے اندر یہ اس خاندان کے مذہبی جذبات اور سیاسی حکمت عملی کا اظہار ضرور کرتی ہیں۔

بابر : یہاں تک کہ فاتح ہند بابر بادشاہ نے بھی اپنی مختصر پنج سالہ حکومت (1526 تا 1531ء) میں پانی پت میں کابلی شاہ مسجد بنانے کی فرصت نکال لی ایک طرف تو اس کا نام بیک وقت اس کی کابل سے محبت کا مظہر ہے اور دوسری طرف یہ 1526ء پانی پت کی فتح کی یادگار ہے۔ روہیلکھنڈ کے شہر سنبھل میں اس کی بنا کردہ مسجد اپنے بیضوی شکل کے گنبد کی وجہ سے نمایاں ہے۔ جب اسے تعمیری کام کی ضرورت پیش آئی تو بابر نے قسطنطنیہ کے البانوی الاصل معمار سنان کے شاگردوں کو بلا بھیجا اور ہندی' ہندوانی اور مقامی طرز تعمیر سے اجتناب کیا۔ اگرچہ بابر نقشہ کشی یا فن عمارت میں ہندوستانی کاریگروں کی مہارت اور علم کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا' تاہم اس نے ان سے کام ضرور لیا ہو گا۔

ہمایوں : ہمایوں کے نسبتہً" طویل اور پر آشوب عہد حکومت میں بہت سی عمارتیں تیار ہوئیں' جن میں سے اب بہت کم باقی رہ گئی ہیں۔ دہلی کے قریب اس کی تعمیر کردہ فتح آباد کی مسجد ٹھوس اور بھاری ہونے کے باوجود موزوں اور متناسب ہے' جس سے تغلق یا ترک عہد کی یاد

Marfat.com

تازہ ہوتی ہے۔ اس کے گنبد نصف کرے سے کسی قدر زیادہ ہیں اور اسے ایرانی طرز میں روغنی کاشی کے ٹکڑوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس اسلوب کی غالباً یہ قدیم ترین مثال ہے، جو باقی رہ گئی ہے۔ دہلی میں اس کا مقبرہ، جو بلاد مشرق کے دین دار لوگوں کے عام دستور کے مطابق بلا شبہ اس کی زندگی ہی میں بننا شروع ہو گیا تھا، سنگ سرخ کا ہے اور یہ بھی ایرانی طرز کا ہے، لیکن اس میں بجائے رنگین کاشی کے سفید سنگ مرمر استعمال ہوا ہے۔ پورا گنبد اسی پتھر سے بنایا گیا ہے اور باقی عمارت میں بھی اسی کی پچی کاری کی گئی ہے۔ بڑے گنبد کی گردن پتلی ہے۔ اس وضع کا یہ پہلا گنبد تھا جو ہندوستان میں تعمیر ہوا۔ چاروں کونوں کے قبوں اور برجیوں پر، جو خود ایک نئی چیز ہیں، زیادہ پرانے نمونے کے گنبد بنائے گئے ہیں۔

اکبر : اکبر (1556 تا 1605ء) کی عمارتوں میں بھی وہی اپج اور تلون پایا جاتا ہے جو اس کے مذہب میں نظر آتا ہے۔ آگرے کے قلعے میں اس نے وہ محل تعمیر کیا جو جہانگیری محل کے نام سے مشہور ہے اور جو مغل عہد کی ان چند غیر مذہبی عمارتوں میں سے ہے جو اب تک قائم ہیں۔ آگرے میں اس کی بنوائی ہوئی دوسری عمارتیں شاہجہان نے مسمار کر دی تھیں۔ سنگ سرخ سے تعمیر کردہ یہ محل، جو مرور زمانہ کا مقابلہ اچھی طرح نہیں کر سکا، اکبر کی قوت عمل اور جدت خیال کا آئینہ دار ہے۔ پوری عمارت میں محرابوں سے بہت کم کام لیا گیا ہے اور عموماً افقی ساخت کا اصول مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس عمارت کی وضع قطع بھی ویسی ہی ہندوانی ہے جیسی اس کی ساخت لیکن آرائشی نقش و نگار، جو ہر سپاٹ سطح پر کندہ ہیں، ایک ایسے نمونے کے ہیں جسے اکبر ہی نے استعمال کیا اور جو کسی اور عمارت میں نظر نہیں آتا۔ اس کے ابتدائی عہد حکومت میں گوالیار میں حضرت محمد غوثؒ کا مقبرہ (م 1562ء) تعمیر ہوا۔ اگرچہ یہ مقبرہ شیر شاہ کے مقبرے سے، جو سہسرام میں ہے، بہت مشابہ ہے، تاہم اس سے اس مختصر سے عرصے کے اندر جو ان دونوں مقبروں کی تعمیر کے درمیان گزرا ایک نمایاں ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس ترقی کو فرگوسن (Fergusson) نے اکبر کی جدت طرازی سے منسوب کیا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی حد تک گوالیاری فنکاروں اور معماروں کی مہارت فنی کی مرہون منت ہے، جو غالباً ہندو تھے۔ عمارت مربع شکل کی ہے، جس کا ہر پہلو مسدس برجوں کو چھوڑ کر سو فٹ لمبا ہے۔ اس کا اندرونی حصہ 43 فٹ مربع ایک ایوان ہے، جس کے کونے نوکدار محرابوں سے اس طرح کاٹ دیے گئے ہیں کہ اس کی شکل ایک مثمن کی سی ہو گئی ہے، جس پر گنبد قائم ہے۔ اس مربع عمارت کے گرد ایک چوڑی غلام گردش ہے، جو ہر سمت سے پتھر کے بہت عمدہ جالی دار کام کے ایک پردے سے بند کر دی گئی ہے اور جس کے ہر پہلو میں ایک آگے کو نکلی ہوئی ڈیوڑھی ہے۔

فتح پور سیکری، یعنی اکبر کے بنا کردہ نئے شہر میں، جو 1569 سے 1584ء تک دارالسلطنت رہا، شہنشاہ کا انتخابی اسلوب اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا۔ یہاں کی عمارتوں کی بہت عمدہ تصویریں "W.E. Smith" کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن ان کی پوری اہمیت کی ابھی تشریح نہیں کی گئی۔

Marfat.com

یہ محل وقوع اس لئے انتخاب کیا گیا تھا کہ اکبر کے مربی و مرشد اور مشہور صوفی بزرگ حضرت سلیم چشتیؒ اس پہاڑی کی چوٹی پر ایک غار میں رہا کرتے تھے۔ اکبر کی اپنی سکونت "خواب گاہ" میں تھی، جو ایک معمولی سی عمارت تھی اور محل خاص کی چھت پر بنی تھی۔ یہاں کچھ تصویریں بنی ہیں جنہیں سمتھ (Smith) چینی نقاشوں کی طرف منسوب کرتا ہے اور جن میں بظاہر بدھ کو بطور یمان تکہ (Yamantaka) دکھایا گیا ہے۔ یہ صحیح ہو یا غلط، اس کے تخت کی وضع قطع، جو دیوان خاص کے بھاری ستون پر رکھا ہے، اس بات کی علامت ہے کہ وہ وہاں، بقول Havell' بطور ایک چکرورتن یا چار اکناف کے حاکم کے بیٹھا تھا۔ اگرچہ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ تخت اس کی اپنے نئے مذہب دین الٰہی کی صدارت ترجمانی کرتا ہے، لیکن ایک ایسے بانی کی علامتیت (Symoblism) کے بارے میں جس کے پاس اپنے نئے شہر کے نقشے کے لئے کوئی طے شدہ نمونہ موجود نہ تھا، کسی عقیدے کا اظہار کرنا ایک بے جا جسارت ہے۔ محل خاص میں، جسے فرگوسن (Fergusson) فتح پور سیکری کی عمارت کا سب سے پہلا جزو تصور کرتا ہے، دو وسیع صحن ہیں اور وہ آگرے کے لال محل سے بڑا ہے لیکن اس کے اردگرد کی عمارتیں طرز و اسلوب اور آرائش میں اس سے کمتر درجے کی ہیں۔ اکبر یہاں وقتاً فوقتاً صحنوں اور کوشکوں کا اضافہ کرتا رہا تاکہ اس کی کم مائگی، تلافی ہو جائے۔ دیوان خاص، جیسا کہ ایک درباری ایوان کے لئے مناسب ہے، مربع شکل کا ہے، لیکن دفتر خانہ اسی طرح ستونوں سے گھرا ہوا ہے جیسے اکبر کے تعمیر کردہ قلعہ الہ آباد کا دفتر خانہ ہے۔ پنج محل ایک پنج منزلہ کھلا کوشک ہے۔ اس میں تکلف سے تراشے ہوئے ستون ہیں اور لمبی غلام گردشیں (Colonndes) اور دیواریں ہیں، جو ان عمارتوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔ پنج محل سے اس سلسلہ عمارات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ مخصوص اکبری وضع کی بہترین عمارتوں میں یہاں کی حسب ذیل تین چھوٹی عمارات سب سے زیادہ خوبصورت ترین ہیں: بیربل کی بیٹی کا محل یا رہائش گاہ، جہانگیر کی والدہ مریم زمانی کا محل اور اکبر کی بنت عم اور سب سے پہلی بیوی رومی سلطانہ رقیہ بیگم کا محل۔ بہرحال اکبر کی عظمت اس سے کہیں زیادہ پرشکوہ یادگاروں کی متقاضی تھی۔ اس کی فتوحات کی یادگار ہے۔ یہ 1571ء میں تعمیر ہوئی اور اسی سال اس نے مجتہد عصر ہونے کا اعلان کیا اور اسلام کی روحانی سیادت کا اعلان کیا تھا۔ یہ ہندوستان میں اسلام کی بہترین مذہبی عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے کتبے کی رو سے خود شیخ سلیم چشتیؒ نے اس کا نقشہ خانہ کعبہ کے نمونے کے مطابق بنایا تھا۔ اگرچہ یہ بہت زیادہ مذین ہے، تاہم اس میں ہندوستانی اثر کی کوئی علامت تقریباً" مفقود ہے۔ اس کے صحن میں شیخ سلیمؒ کا جو مقبرہ ہے وہ سرتاسر سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اس میں ہندی اشکال کے بہت اعلیٰ جالی دار نقش و نگار ہیں اور سنگ مرمر کا ایک چوڑا چھجا، جو ایسے پر تکلف اور پیچیدہ نمونے کی مثلث دیوار گیریوں پر قائم ہے جنھیں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ صحن میں دوسرا مقبرہ شیخ سلیمؒ کے پوتے شیخ اسلام خان کا ہے۔ اس کی وضع بہت عمدہ لیکن نسبتاً" سادہ ہے، اسی لئے یہ اپنے

Marfat.com

گردوپیش کی عمارتوں کے آگے ماند پڑ گیا ہے۔ "بلند دروازہ" (1602ء) اکبر کی فتح خاندیش کی یادگار ہے اور اس کے سامنے خود جامع مسجد بھی چھوٹی معلوم ہونے لگی ہے۔ یہ ہندوستان میں سب سے زیادہ شاندار دروازہ ہے اور دنیا کے بلند ترین دروازوں میں شمار ہوتا ہے۔ فتح پور سیکری کا شہر جس پہاڑی کی چوٹی پر آباد ہے اس پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کی بلندی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کے معمار نے اس کے مدخل (Portals) ایک نصف گنبد کی پشت پر رکھے ہیں' جس سے ایک طرح کی ڈیوڑھی بن گئی ہے۔ اس گنبد کا طول و عرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خود دروازے کا طول و عرض ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اکبر اپنے نئے دارالحکومت کو فنون لطیفہ کا مرکز بنانا چاہتا تھا اور اس نے فن عمارت اور فن تصویر میں ایک گہرا رشتہ قائم کر دیا تھا۔ اندرونی دیواروں کی تصاویر کے باقی ماندہ ٹکڑوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے ایرانی اور ہندوستانی فنکاروں سے کام لیا جو الگ الگ کام کرتے تھے۔ ان کے طریق عمل کا کچھ اندازہ بلا شبہہ اس زمانے کی میناتوری تصاویر (Miniatures) بھی ہو سکتا ہے' اس لئے کہ دیواروں پر تصویریں بنانے والے فنکاروں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ قلمی نسخوں کو بھی تصاویر سے مزین کریں۔

الہ آباد میں' جہاں حکومت کے کاروبار کی وجہ سے اکبر کو مجبوراً" اپنے نئے مگر الگ تھلگ دارالسلطنت کی بہ نسبت زیادہ قیام کرنا پڑتا تھا' اس نے چالیس ستونوں والا کوشک تعمیر کیا' جس کا صرف وسطی ایوان باقی رہ گیا ہے۔ یہ مربع شکل کا ہے اور ستونوں کی آٹھ قطاروں پر قائم ہے اور ہر قطار میں آٹھ ستون ہیں۔ یہ سب مل کر ایک چوڑا برآمدہ ہے' جس میں دہرے ستون ہیں' اس طرح کہ ہر کونے پر چار ستون اکٹھے ہو جاتے ہیں' جن کے اوپر انتہائی پر تکلف وضع کے سرستون بنے ہیں۔ بہرکیف' بقول فرگوسن' مخصوص اکبری وضع کی بہترین عمارت اسکندرہ میں اس کا مقبرہ ہے' جو اس کی زندگی ہی میں بننا شروع ہو گیا تھا' لیکن جس کی تکمیل اس کے جانشین نے کی۔ جہانگیر اپنی توزک میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اکبر کی تعمیر کردہ عمارت کو منہدم کر کے مقبرے کو از سر نو تعمیر کیا' لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ اس عمارت کا نقشہ ہندوستان میں بالکل یگانہ ہے اور کوئی ایرانی یا عرب (Saracenic) عمارت اس کے مماثل نہیں' یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صرف بیرونی حصہ نفاست پسند اور راسخ العقیدہ جہانگیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا اصل نقشہ پنج محل کے نمونے کا تھا' جس میں پانچ چھتیں (منزلیں) ہیں' جو بلندی کے ساتھ ساتھ طول و عرض میں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔ اس طرح عمارت کی ظاہری شکل اہرام نما ہے نہ کہ گنبد نما۔ یہ ایک وسیع باغ کے درمیان واقع ہے اور اندر جانے کے لئے صرف ایک دروازہ ہے۔ یہ ایک اونچے چبوترے پر قائم ہے۔ کونے کے برجوں کو چھوڑ کر سب سے نیچے کی منزل ہر پہلو سے 320 فٹ لمبی ہے۔ اس کی چھت پر تین اور منزلیں ہیں' جو وضع قطع میں پہلی منزل کے مشابہ لیکن اس سے زیادہ مزین ہیں اور جن میں سے ہر ایک کی بلندی نیچے کی منزل یا

Marfat.com

چبوترے سے تقریباً" نصف ہے۔ سب سے اوپر کی منزل کے اندر اور اس کے اوپر کو نکلا ہوا ایک سفید سنگ مرمر کا 157 فٹ مربع مُجر (Enclosure) ہے' جو باقی عمارت میں لگے ہوئے سرخ پتھر کے مقابلے میں ایک تضاد پیدا اس مُجر کی بیرونی دیوار سرتاسر خوب صورت جالی کے کام پر مشتمل ہے۔ اس کے اندر سفید سنگ مرمر ہی کی ایک غلام گردش ہے۔ اس کے وسط میں ایک چبوترے پر اکبر کی قبر ہے' اور چبوترے پر بہت عمدہ منبت گل کاری نظر آتی ہے۔ بلا شبہ یہ اکبر کی آخری آرام گاہ کا مثالی نمونہ ہے' اس لئے کہ نیچے اس کا جسد فانی تہ خانے میں ایک بہت ہی سیدھے سادے سنگ مزار کے نیچے مدفون ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ یہاں جہانگیر نے اصل نقشے کو بدل دیا تھا۔ بقول فنچ W.Finch ارادہ یہ تھا کہ قبر پر بیش بہا پتھروں سے مرصع ایک عجیب و غریب سفید اور چتی دار سونے کی چتری بنائی جائے۔ اکبر نے کیا نقشہ سوچا تھا اور اپنے اس نقشے سے وہ کسی چیز کا اظہار کرنا چاہتا تھا' اس کے بارے میں اب محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ فرگوسن (Fergusson) ایک بدھی نمونے کا نظریہ پیش کرتا ہے بلکہ اسے ان کوشکوں میں' جو اوپر کی منزلوں کو مزین کرتے ہیں ان حجروں کی جھلک نظر آتی ہے' جو مالی پورم کی اس بڑی رتھ کے کنارے پر بنے ہیں جسے چٹان میں سے تراش کر بنایا گیا ہے لیکن ممکن ہے کہ ان کوشکوں کی طرح' جو ہمایوں کے مقبرے کی اوپر کی منزل میں ہیں' یہاں بھی ایک دینی درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ ہو۔ فرگوسن کا یہ بھی خیال تھا کہ سنگ مزار کے اوپر ایک قبہ دار کمرے کی تعمیر اصل نقشے کا ایک جزو تھی' کیونکہ ایسا کوئی مقبرہ موجود نہیں جس میں بادشاہ کی قبر بغیر چھت کے ہو: لیکن اس طرح کے مفروضے کو بطور مسلمہ پیش کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ ھیول Havell نے اس عمارت میں ایک پنج منزلہ ہندوستانی دیوان عام نظر آتا ہے' جو بظاہر بادشاہ کا دین الٰہی قبول کرنے والوں کی جائے اجتماع ہو گا۔ اس میں نیچے کے چار مراتب سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کمبوڈیا کے اثرات کی موجودگی کا خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی زرتشتی نمونہ پیش نظر رہا ہو' اس لئے کہ اکبر نے جہاں اور مذاہب سے استفادہ کیا وہاں اس مذہب سے بھی کچھ باتیں اخذ کی تھیں۔

جہاں گیر : اکبر کے مقابلے میں عہد مغلیہ کے ہندوستان کی تعمیری شان و شوکت میں جہانگیر کا حصہ بہت کم ہے۔ لاھور میں' جسے اس نے اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا' اس نے قلعے میں بڑی خوابگاہ کا اضافہ کیا اور انار کلی کا مقبرہ بھی اسی شہر میں تعمیر ہوا۔ کشمیر میں سری نگر کے قریب اس نے شالا مار باغ مع اس کے کوشکوں (Summer Houses) کے بنایا۔ جالندھر کے قریب نور محل کی سرائے کا خوب صورت دروازہ بھی اس کے عہد کی طرف منسوب ہے۔ لاھور کے قلعے کی مستطیل عمارت بلا شبہ ہندو کاریگروں نے بنائی ہو گی۔ یہی صورت اس کے صحن کے گرداگرد بنی ہوئی محراب دار غلام گردش کی ہے' جو سرخ پتھر کے ستونوں پر قائم ہے اور سر ستونوں میں ویسی ہی گل کاری اور ہاتھیوں' موروں اور فرضی جانوروں کی ویسی ہی تصویریں کندہ ہیں جیسی کہ

Marfat.com

آگرے کے لال محل میں پائی جاتی ہیں۔ جہانگیر کی سب سے شاندار عمارتیں ڈھاکہ' مشرقی بنگال' میں تعمیر کی گئیں' جسے اس نے گوڑ کے بجائے اس صوبے کا نیا دارالحکومت مقرر کیا تھا؛ لیکن وہاں اس کی عمارتیں زیادہ تر اینٹوں سے بنائی گئی تھیں' جن پر چونے کا پلستر کر دیا گیا تھا اور صرف ستونوں اور دیوار گیریوں میں پتھر استعمال ہوا تھا؛ لیکن جنگل نے انہیں تقریباً" برباد کر دیا ہے صرف ایک چیز میں جہانگیر نے کچھ جدت پیدا کی 1600ء میں اس نے لاهور میں موتی مسجد بنائی' جو ہندوستان میں اپنی نوع کی پہلی مسجد ہے۔ اکبر اور جہانگیر کی طرز تعمیر میں برائے نام فرق ہے۔ مقدم الذکر نے فتح پور سیکری میں رنگین آرائش سے کام لیا تھا اس کی بعد کی عمارتوں کو دیواری تصویروں سے پر تکلف طریقے پر آراستہ کیا گیا اور جامع مسجد میں سنگ مرمر کی پچی کاری سے کام لیا گیا۔ جہانگیر نے اور بھی زیادہ پچی کاری کی آرائش پر انحصار کیا ہے' مثلاً" اکبر کے مقبرے میں لیکن اس کی تکمیل کے کچھ عرصے ہی بعد ہمیں رنگ برنگ سنگ مرمر کی پچی کاری' جس میں مرصع کاری کا اضافہ کر دیا گیا تھا' اعتماد الدولہ کے مقبرے میں نظر آتی ہے اور تاج محل میں اس کے بعد بھی تقریباً" بغیر کسی اور آرائش کے مرصع کام دکھائی دیتا ہے۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں روغنی کاشی کا استعمال چھتوں کے لئے اور ذرا کمتر پیمانے پر آرائش کے لئے بھی جاری رکھا تھا۔ جہانگیر نے اسکندرہ میں اور اس کے وزیر' وزیر خاں' نے لاهور میں اپنی مسجد میں اسی سے کام لیا واقعہ یہ ہے کہ مسجد وزیر خاں محض اس آرائش ہی کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ اکبر نے اندرونی دیواروں پر تصویریں بنانے کا دستور بھی جاری کیا تھا۔

نور جہاں : جہانگیر کی ملکہ نور محل یا نور جہاں نے آگرے میں اپنے والد اعتماد الدولہ کا مقبرہ تعمیر کیا' جو 1628ء میں مکمل ہوا۔ یہ عمارت' جو تقریباً" سب کی سب سفید سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے اور جسے ذرا کم قیمت کے جواہرات سے مرصع نقش و نگار سے آراستہ کیا گیا ہے' شاہجہان کے عہد کے نفیس ترین کاموں کی پیشرو تھی۔ جہانگیر کے مقبرے میں' جو لاهور کے قریب شاہدرہ میں واقع ہے' کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ ایک چبوترے پر واقع ہے' جس کا ہر پہلو 209 فٹ ہے اور جس کے چاروں کونوں پر ایک ایک مینار ہے۔ روکاریں سفید سنگ مرمر سے سجائی گئی ہیں' جو سرخ پتھر میں جڑا گیا ہے اور مسطح چھت پچی کاری سے۔ شہنشاہ کا جسد خاکی غالباً" چھت کے ایک کھلے حصے کے نیچے مدفون ہے تاکہ آسمان کی بارش اور شبنم اس کی قبر پر گر سکے' جیسا کہ اس کے قدیم ترین تذکرہ نگار نے لکھا ہے۔ مختصر یہ کہ بابر کی مثال پر عمل کرتے ہوئے جہانگیر کی اصل قبر غیر مسقف تھی۔ قبر کا تعویذ سفید سنگ مرمر کا ہے' جس پر مرصع کاری (Pietra dura) کی آرائش ہے۔ یہ ایک ہشت پہلو کمرے میں ہے' جو اکیس فٹ بلند ہے اور جس کا قطر ساڑھے بیس فٹ ہے۔ یہ کمرہ چونے اور پتھر کی تقریباً" ٹھوس دیواروں سے محصور ہے' جو ہر طرف سے چھپن فٹ موٹی ہیں اور اس کے دروازے دو مستطیل شکل کے بغلی کمروں میں کھلتے ہیں' اس کا کوئی دروازہ ان محرابوں کی پشت پر بنے ہوئے دوسرے چالیس کمروں میں

Marfat.com

نہیں کھلتا' جو اس کے چاروں طرف ہیں۔ ہر روکار میں ایک وسطی محراب ہے اور پانچ چھوٹی چھوٹی محرابیں اس کے ہر پہلو میں ہیں۔

شاہ جہاں : شاہجہان کے عہد (1673 تا 1658ء) میں مغل فن عمارت اپنے معراج کمال کو پہنچ گیا۔ اس کی ابتدائی عمارتوں میں سے ایک بے نظیر عمارت تاج محل ہے' جو اس کی ملکہ ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل یا "برگزیدہ محل" کی وفات کے ایک سال بعد بننا شروع ہوا۔ شاہجہان کا ارادہ تھا کہ اس کے بالمقابل دریائے جمنا کے دوسرے کنارے ایک اور ایسا ہی شاندار مقبرہ سیاہ سنگ مرمر سے خود اپنے لئے تعمیر کرے لیکن اورنگ زیب نے اس منصوبے کی تکمیل نہیں کی' شاید اس لئے کہ اس سے بت پرستی کی بو آتی تھی۔ تاج محل کے معمار کے بارے میں بہت اختلاف رائے رہا ہے۔ شاہجہان کی طرز تعمیر دراصل ایرانی ہی تھی' لیکن اس سے ایک مختلف اور ناقابل توضیح و تعریف تاثر کا اظہار ہوتا تھا۔ اصفہانی اور استانبولی طرز کے مقابلے میں اس کا بڑا امتیازی پہلو سفید سنگ مرمر کا بڑے پیمانے پر استعمال تھا' جسے پر تکلف طریقے پر مرصع کاری سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت تک رنگین کاشی کا استعمال بہت کم ہو گیا تھا۔ وسعت اور شان و شکوہ میں ایک نسوانی سج دھج کا امتزاج کر دیا گیا تھا' جو ایک حد تک بے مثل جالی کے کام سے پیدا ہوتی تھی۔ مسجدوں میں رنگ آمیزی سے اجتناب کیا جاتا تھا اور آگرے اور دہلی کی موتی مساجد میں بہترین فن کے نمونے ملتے ہیں مقدم الذکر 1646 تا 1653ء میں تعمیر ہوئی۔ شاہجہان اس اثنا میں شاہجہان آباد یعنی اس عظیم الشان محل کی بنیاد رکھ چکا تھا' جو موجودہ شہر دہلی کے قریب واقع ہے۔ ایک ایرانی انجنیر علی مردان خان نے دہلی سے چھ میل اوپر دریائے جمنا سے پانی لیا اور اس کی بنائی ہوئی نہر نئے دارالحکومت کو بہت سی چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعے پانی پہنچانے لگی۔ ان میں سب سے پسندیدہ نہر بہشت تھی' جس کا یہ نام خود شاہجہان نے رکھا تھا۔ یہ سنگ مرمر کے ایک جھرنے سے آبشار کی شکل میں ایک کوشک (شاہ برج) میں گرتی تھی اور اس چبوترے کے ساتھ ساتھ' جو باغ حیات بخش کے کنارے تھا' بہتی ہوئی محل (لال قلعہ) کی مشرقی دیوار کے پہلو میں واقع شاندار عمارتوں کے سلسلے میں سے گزرتی تھی اور حمام' دیوان خاص' خوابگاہ اور میزان انصاف ("انصاف کی ترازو") کے نیچے سے خاموشی سے پھسلتی ہوئی دھوپ میں نہائے ہوئے صحن کے پار امتیاز محل کی ٹھنڈک میں' جس کا نام بعد میں اس کی پرتکلف رنگین آرائش اور سنہری کام کے سبب رنگ محل کلاں ہو گیا' پہنچ جاتی تھی۔ سنگ مرمر کے ایک چبوترے (Terrace) پر بہتے ہوئے' جو پہلے قلعے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا تھا' یہ نہر دریائے جمنا کو اوپر سے جھانکتی تھی' جو اس زمانے میں سنگ سرخ کی دیواروں کی بنیادوں کے پاس سے بہتا تھا۔ مغرب کی طرف ایک میوہ باغ اسے دیوان عام سے جدا کرتا تھا۔ وہاں سے اور آگے بڑھ کر وہ رنگ محل خرد اور شاہی زنان خانے کی دوسری عمارتوں میں سے گزرتی تھی۔ اس طرح دہلی میں مغلوں کا بہتی ہوئی نہروں سے سیراب شدہ پردہ دار باغوں

Marfat.com

کا شوق ان کے عمارتی خوبصورتی سے عشق کے ساتھ مجتمع ہو گیا۔ دہلی نے قدرتی مناظر سے بابر کی الفت کو برقرار رکھا اور شائد اس کے ساتھ منظر زمینی (Landscape) کا ذوق بھی پیدا کر دیا' جس کا اظہار کشمیر کے مغل باغوں میں بھی ہوتا ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر : اورنگ زیب (1659 تا 1707ء) کے عہد ہی میں فن تعمیر پر زوال آنا شروع ہو گیا تھا' جس کا بڑا باعث بلا شبہ یہ تھا کہ شہنشاہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کی بناء پر فنون لطیفہ کا کچھ ایسا شائق نہیں تھا اور اس کا ضمیر بھی اسراف بے جا کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس نے شاہجہان کے مقبرے کو مکمل کرنے سے انکار کر دیا' بظاہر خرچ کی بناء پر' لیکن شائد اس لئے بھی کہ اسے اس منصوبے میں بت پرستی کی بو آتی تھی۔ بایں ہمہ اس نے بنارس کی بڑی مسجد کے علاوہ' جس میں بلند اور خوش وضع مینار ہیں' لاھور میں بھی دہلی کی جامع مسجد کی ایک نقل بنوائی اور اورنگ آباد میں اپنی محبوب بیوی کے مقبرے میں چھوٹے پیمانے پر' تاہم کامیابی کے ساتھ' تاج محل کی نقل تیار کی۔ اورنگ زیب کا اپنا مقبرہ' خلد آباد کے گاؤں میں ایلورا کے غاروں سے ذرا اوپر' خاصی کم حیثیت اور غیر اہم عمارت ہے' لیکن اس انحطاط پذیری کے باوجود اس کی بعض عمارتوں کو مغل طرز کی آخری بڑی مثالوں کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نے لاھور میں جو جامع یا بادشاہی مسجد تعمیر کی' وہ بے حد خوش وضع ہے۔ اس کی مرکزی' نیز سامنے کی روکاروں کی مرمریں آرائش جزئیات میں اپنے دہلی کے اصلی نمونے سے کمتر درجے کی ہے' تاہم سفید سنگ مرمر کے تین گنبد اور سرخ پتھر کا شاندار دروازہ' جو حضوری باغ کی طرف کھلتا ہے' اس مسجد کے بہترین حصے ہیں۔

دہلی کے قریب نواب صفدر جنگ وزیر اودھ کا مقبرہ (1756ء) ھمایوں کے مقبرے کی اچھی خاصی نقل ہے' لیکن اس کے اندرونی حصے کو معمولی قسم کی پلستر کی آرائش نے خراب کر دیا ہے۔

اودھ کے نواب وزیروں کے دارالحکومت لکھنؤ میں جو عمارتیں اس خاندان نے یا اس کے امراء نے تعمیر کیں انھیں مغل عمارتوں کی ذیل میں بمشکل شمار کیا جا سکتا ہے' البتہ نواب آصف الدولہ کے تعمیر کردہ وسیع امام باڑے (1784ء) کو اس سلسلے میں واحد استثناء قرار دیا جا سکتا ہے۔ شیعی رسومات کے ساتھ محرم منانے کے لئے اس امام باڑے کا منصوبہ ایک بڑے پیمانے پر سوچا گیا تھا' لیکن اس کی جزئیات زیادہ گہرے معائنے کے آگے نہیں ٹھہر سکتیں' تاہم اس کا ٹھوس پن ضرور مؤثر ہے۔ میسور کے مسلمان فرمانروا خاندان (1760 تا 1777) کی عمارتیں مغل اسلوب کی حامل ہونے کا اور بھی کم دعویٰ کر سکتی ہیں۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلوں کا فن عمارت ان کے دوسرے فنون کی طرح بہت سی قوتوں کا مجموعی نتیجہ تھا' لیکن ہندو فن پر اس کی اصل فوقیت کا راز اس کی اس امتیازی خصوصیت میں مضمر ہے کہ اس نے خالص ہندی اور غیر ملکی تکنیک کو بڑے متوازن طریق سے استعمال کیا۔

Marfat.com

اگرچہ مغل اپنی عمارتوں میں علامتیت کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتے تھے، تاہم انھوں نے ہندو فن سنگ تراشی کی طرح اسے مقصود فن ہرگز نہیں ٹھہرایا۔

Marfat.com

باب 21

مغل عہد میں موسیقی

(MUGHAL MUSIC)

اگرچہ سنسکرت ادب مذہبی موسیقی (صوتی و آلاتی) کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے' لیکن مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی غیرمذہبی موسیقی کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں ملتیں۔ اس کے برعکس سندھ کے مند اور زط (= جٹ) قبیلوں کو غیرمذہبی موسیقی سے جو شغف تھا وہ بخوبی ثابت ہے۔ عربوں کو اپنی ابتدائی فتوحات (89ھ/708ء تا 96ھ/715ء) میں انھیں سے واسطہ پڑا۔ زطوں کی موسیقی کا کوئی ذکر صراحتہً تو کہیں نہیں ملتا۔

ہمیں اس بارے میں بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں کہ شمال مشرق اور مشرق میں مسلمانوں کی جو سلطنتیں بعد میں قائم ہوئیں ان میں موسیقی کا کیا خاص مقام تھا۔ اس سے میرا مطلب بالخصوص برصغیرپاک و ہند کی ان ریاستوں سے ہے جو غزنویوں اور غوریوں کے زیر سیادت تھیں۔ 602ھ/1206ء میں قطب الدین دہلی کا پہلا سلطان ہوا۔ اس کے زمانے اور اس کے بعد کے ادوار میں برصغیرپاک و ہند کی مسلمان قوموں کی موسیقی کی ہیئت اور نوعیت کا حال ہمیں معلوم ہو سکتا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کے چار بڑے فقہی مذاہب کے نزدیک موسیقی ایک ناپسندیدہ چیز تھی کیونکہ یہ چیز اکثر دوسرے دو (ملاھی) یعنی شراب اور عورت کا جوڑ سمجھی جاتی تھی اور فقہا' جو دنیائے اسلام میں ہمیشہ ہی بڑے اقتدار کے حامل رہے ہیں' ہر ملک میں ' ہر سلطان اور ہر امیر کو اکثر افہام و تفہیم سے مجبور کرتے رہے کہ وہ موسیقی کو ممنوع قرار دیں' لیکن اسی کے ساتھ صوفیوں اور درویشوں کے سلسلے بھی' جو روحانی وجد و حال کے حصول کی خاطر موسیقی اور رقص دونوں سے کام لیتے تھے' بہت بااثر ہو گئے۔ خاندان غلاماں کے تیسرے سلطان شمس الدین التمش 633ھ/1235ء کے عہد میں یہ ہوا کہ پہلے تو اس بادشاہ نے فقہا کے احکام کے تحت موسیقی کو ممنوع قرار دے دیا لیکن کچھ مدت بعد وہ دہلی کے چشتی درویشوں کے سماع اور وجد سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے موسیقی پر سے پابندی اٹھا لی۔ صوفیوں کا یہ سلسلہ' جس کی بنیاد حضرت معین الدین چشتیؒ نے رکھی تھی' ہندوستان بھر میں بے حد احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے قوالوں کے عارفانہ گیت درگاہ کی حدود سے باہر دور دور تک پھیل گئے تھے اور ان گیتوں میں سے بعض فی الواقع ہندی میں گائے جاتے تھے۔

اس کے بعد' جیسا کہ تاریخ فرشتہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے' اگلے سلطان فیروز شاہ اول

Marfat.com

رکن الدین نے اس فن کی مزید سرپرستی کی۔ طبقات ناصری میں اس سلطان کو حاتم ثانی کہا گیا ہے کیونکہ وہ اہل غنا اور گویوں کو بے اندازہ مال و دولت عطا کرتا تھا۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں یہ کیفیت تھی کہ ہفتے میں ایک شام تو دربار شاہی میں شاعروں اور ادیبوں کے لئے مخصوص کی جاتی تھی اور ایک شام صرف مغنیوں' رقاصوں' نعاتوں اور داستان گوون کے لئے رکھی گئی تھی۔ بلبن کے بعد کیقباد سلطان ہوا جو شراب کا رسیا تھا۔ بداؤنی نے اسے اس بات پر لعنت ملامت کی ہے کہ وہ اپنے دربار میں مغنیوں اور موسیقاروں کو جگہ دیتا ہے۔ فرشتہ بھی اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ اس زمانے میں قریب قریب ہر گھر میں موسیقی کا چرچا تھا۔

اس کے بعد دہلی کے خلجی سلاطین کا زمانہ شروع ہوا' جن میں سے پہلا فیروز شاہ ثانی جلال الدین بھی موسیقی کی نہایت فیاضی سے سرپرستی کرتا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ اس سلطان کے دربار میں امیر خاصہ اور حمید راجا جیسے بلند پایہ مغنی اور محمد شاہ چنگی' فتو' نصیر خان اور بہروز جیسے بے بدل مطرب موجود تھے۔ اسی دربار سے امیر خسروؒ جیسے نابغہ روزگار کا تعلق تھا' جن کے متعلق فارسی کے نامور انگریز فاضل براؤن (Edward G. Brown) نے لکھا ہے کہ "وہ موسیقی اور شاعری دونوں میں یکساں شہرت رکھتے تھے"۔ اگرچہ امیر خسروؒ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ جیسے ولی اللہ کے پر جوش مرید اور شاگرد تھے' لیکن اپنے زمانے کے عظیم موسیقار بھی ہوئے ہیں۔ وہ سابق الذکر سلطان بلبن اور کیقباد کے درباروں میں بھی ملازم رہے۔ انھوں نے اپنی کتاب قران السعدین میں درباری موسیقی کا بہت اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب اعجاز خسروی گوئے اور ہندوستانی مغنیوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں موسیقی کی تمام ترقی اصطلاحات پر ایرانی تخیلات کا تسلط واضح ہے' لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کچھ نہ کچھ تغیر ہو کر رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ فارسی اور پاک و ہند کی موسیقی کے امتزاج کا کام امیر خسرو نے انجام دیا۔ ایک کتاب راگ درپن میں امیر خسروؒ کی ایجادات و اختراعات کے متعلق بڑے دعوے کئے گئے ہیں' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض اقسام' مثلاً" قول' غزل' ترانہ (فرووداشت) اس سے پیشتر عربی ایرانی "نوبہ" کے اجزا تھے' جنھیں مشکل سے "ایجاد" کہا جا سکتا ہے۔ واجد علی نے صوت المبارک میں لکھا ہے کہ خسروؒ "خیال" کے نائک (یعنی موجد و استاد) تھے۔ غالباً یہ رائے بالکل درست ہے' گو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خیال سنسکرت کے راگ لہوریکا تھا' جسے جونپور کے سلطان حسین شرقی نے تصرف کر کے اپنایا۔ خسروؒ چھے کے چھے خلجی سلاطین کی ملازمت میں رہے اور اس خانوادے کے خاتمے پر ان کے جانشینوں' یعنی خاندان تغلق کے سلاطین سے وابستہ ہو گئے۔ فرشتہ نے خسروؒ کے متعلق لکھا ہے کہ شائد ہی کوئی ایسی مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں امیر خسروؒ کوئی نیا گیت یا کوئی نئی نظم پیش نہ کرتے ہوں۔ مولانا شہاب معمائی کے قطعے میں' جو امیرؒ کے سنگ مزار پر نقش ہے' انھیں "بلبل دستان سرای بیقریں" کہا گیا ہے۔ تیسرے تغلق بادشاہ فیروز شاہ ثالث کو موسیقی کے فن سے خاص شغف تھا' چنانچہ اس کے حکم سے بظاہر سنسکرت کی

Marfat.com

بعض کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا، جس میں پنگل و دیا (یعنی فن موسیقی بلکہ زیادہ صحیح : علم عروض) اور مختلف قسم کے "اکھاڑوں" کا بیان تھا، یعنی عورتوں کا رقص و سرور، جنھیں "پاتر بازی" کہتے ہیں۔

اس کے بعد دہلی کے تخت پر خاندان سادات کا تسلط ہوا۔ اس زمانے میں بھی موسیقی کو دربار شاہی اور عوام کی زندگی میں بدستور اہمیت حاصل رہی۔ تاریخ مبارک شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مبارک شاہ ثانی معزالدین اس فن کا والہ و شیدا تھا۔ جب لودی سلاطین دہلی کے تخت پر قابض ہوئے تو موسیقی کے متعلق یہ روش بدل گئی۔ فقہا نے دیکھا کہ ملاہی میں شراب اور موسیقی اکثر لازم و ملزوم بن جاتے ہیں تو انہوں نے سلطان کو مجبور کیا کہ موسیقی کو مذموم قرار دے، لیکن اس کے باوجود احمد یادگار لکھتا ہے کہ سکندر لودی نے چار غلام ملازم رکھے، جو بڑے باکمال موسیقی دان تھے۔ ان میں سے ایک چنگ، دوسرا قانون، تیسرا طنبور اور چوتھا بین بجانے میں کمال رکھتا تھا۔ اس بیان سے منکشف ہوتا ہے کہ خاص پاک وہند کا صرف ایک ہی ساز، یعنی بین، پسند کیا جاتا تھا۔ یہ بادشاہ اپنے نقار خانے کے سرنای بجانے والوں میں گہری دلچسپی لیتا تھا اور ان سے اپنے چار پسندیدہ "مقامات" میں سے کسی نہ کسی مقام کو بڑے ذوق شوق سے سنتا تھا۔ اگرچہ وہ باہر سے آنے والے مشہور موسیقی دانوں کو باریابی کا موقع نہ دیتا تھا، لیکن اگر اس کے امرا برسرعام موسیقی سنتے تو معترض نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد کے افغان (سوری) سلاطین دہلی بھی موسیقی کی مسرتوں کے دلدادہ تھے۔ اس کی ایک مثال اسلام شاہ ہے، جس کے دو مشہور ترین مطرب رام داس اور مہاپاتر تھے۔ یہ دونوں بعد میں اکبر کے دربار میں چلے آئے۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ اسلام شاہ کی بیوی (بی بی بائی) کا بھائی مبارز خان تو ساز اور راگ راگنیاں سننے ہی میں زندگی گزارتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ جب یہ خبر آئی کہ بابر کا بیٹا ہمایوں ہندوستان میں داخل ہوگیا ہے تو اسلام شاہ اس وقت اپنے افغانی مطرب سے گانا سن رہا تھا، جس کے ساتھ رباب بجایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمد خامس عادل شاہ سور کا زمانہ آیا۔ بداؤنی کے قول کے مطابق یہ سلطان گانے بجانے کے فن میں ایسا ماہر تھا کہ تان سین جیسا مشہور اور نامور استاد اس سلطان کے شاگرد ہونے کا معترف تھا اور یہی عدلی (سلطان عوام الناس میں اس نام سے مشہور تھا) باز بہادر کا بھی استاد تھا۔ اس کے عہد میں کسی دکھنی سازندے نے ایک پکھاوج پیش کیا، جو قد آدم بلند تھا اور اسے بجانے کے لئے کسی کے دونوں ہاتھ اس کے دو جانب نہ پہنچتے تھے۔ دہلی کے سازندے اس کے بجانے سے عاجز آئے، مگر عدلی تکیہ لگا کر بیٹھ اور پکھاوج کو کبھی ہاتھ سے اور کبھی پاؤں سے اس طرح بجایا کہ اہل مجلس عش عش کر اٹھے۔ آخر خاندان افغاناں اور دیگر ملوک ہند بابر کی شمشیر خارا شگاف کی تاب نہ لا سکے اور مغل قلمرو قائم ہوگئی۔ اس زمانے کا ذکر کرنے سے پہلے ہمیں پاک و ہند کے ان چھوٹے چھوٹے شاہی خاندانوں اور ان کی موسیقی کا جائزہ لینا چاہئے جو آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی ہجری/

Marfat.com

سولھویں صدی عیسوی تک حکمران رہے۔

سلاطین کشمیر ایک ایسے ملک پر حکومت کرتے تھے جو راگ کے لئے مشہور تھا۔ سلطان زین العابدین جیسے دانشمند اور شائستہ بادشاہ کی سرپرستی میں ایرانی اور تورانی موسیقی دانوں نے جو دبستان قائم کئے انھوں نے بے حد شہرت پائی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اس بادشاہ کے عہد میں علم موسیقی پر مختلف کتابیں لکھی گئیں، جس سے یہ علم بہت ترقی کر گیا۔

اسی زمانے میں بہمنی خاندان نے اپنی عظمت کی شعاعیں دکن پر ڈالیں۔ گلبرگہ کے بادشاہوں میں سے تاج الدین فیروز شاہ کو موسیقی سے بہت شغف تھا۔ اس بادشاہ کے ایک قاضی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار وہ گیا، جہاں ناچنے والیاں رہتی تھیں اور وہاں ان کا ڈھول، جسے منڈل کہتے ہیں، بجا کر دکھایا۔ بادشاہ کا بھائی درویشوں کے آئین و رسوم کا اس قدر دلدادہ تھا کہ کبھی ان کی درگاہ سے غیر حاضر نہ ہوتا تھا، تاہم اس قسم کی موسیقی اور اس مظاہرہ فن میں زمین و آسمان کا فرق تھا جسے حرم شاہی کی سات سو رقص و موسیقی میں ماہر لڑکیاں دکھاتی تھیں۔ احمد شاہ اول بھی اس قسم کی تفریحات کا اسی طرح دلدادہ تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ وہ ہر وقت "موسیقی کی سریلی تانوں" میں محو رہتا تھا۔ علاء الدین احمد شاہ ثانی نے ایک ہندو راجا کی بیٹی کو داخل حرم کیا اور فرشتہ لکھتا ہے کہ یہ عورت علم موسیقی میں مثال نہ رکھتی تھی جب وہ کرناٹک کی مہم سے واپس آیا تو وہاں کے ایک ہندو مندر سے کوئی ایک ہزار نر کیاں (ناچنے والیاں) ہمراہ لایا۔ محمد شاہ ثانی کا اقتدار شاہی ایک سمندر سے لے کر دوسرے سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے ایک دفعہ ایک سو غلام اور لونڈیاں پیش کی گئیں، جو زیادہ تر قفقاز، گرجستان اور حبشہ سے آئی تھیں اور گانے اور ناچنے میں کمال رکھتی تھیں۔ اس کا جانشین (محمود شاہ ثانی) اپنے راگ رنگ کا شوق پورا کرنے میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کے دربار میں لاہور، دہلی، ایران اور خراسان سے ماہرین موسیقی جوق در جوق جمع ہوتے تھے۔

بہمنی خاندان کے زوال کے بعد دکن میں جو چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں بیجا پور کی عادل شاہیہ سلطنت کے پہلے بادشاہ یوسف عادل شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موسیقی میں اس کا ذوق اور کمال اس درجے کا تھا کہ اس کے عہد میں جو بڑے بڑے ماہرین اس کے دربار میں حاضر ہو کر مورد الطاف و کرم ہوتے تھے ان میں سے اکثر اس فن میں اس سے مات کھا جاتے تھے۔ وہ کئی ساز نہایت خوبی سے بجاتا تھا اور جب کی طبیعت میں لہر اٹھتی تو گیت بداہتہ تصنیف بھی کر لیتا تھا۔ اس کا جانشین اسماعیل دکن کی موسیقی کے مقابلے میں ترکی اور ایرانی موسیقی کو ترجیح دیتا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ اول نے دکنی زبان اور رسم و رواج کو زیادہ فروغ دیا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے فن موسیقی پر ایک کتاب نورس لکھی، جس کا دیباچہ فارسی کے مشہور شاعر ملا ظہوری نے تحریر کیا تھا۔ بیجاپور کی حسین و جمیل عمارات، جن کی انگریزی عہد میں بہت عمدگی کے ساتھ مرمت ہوتی رہی، فنون لطیفہ کے دلدادہ عادل

Marfat.com

شاہیوں کی نہایت عمدہ یادگاریں ہیں۔

ان کے ہم عصر گولکنڈہ کے شاہان قطب شاہیہ تھے۔ سلطان قلی نے اس زمانے کے مروجہ معمولات کو ترک کر کے دربار میں ایرانی رسم و رواج کو اپنایا۔ نوبت کا شمار بھی اسی سلسلے میں کیا جا سکتا ہے' جو دن میں پانچ دفعہ بجائی جاتی تھی۔ ابراہیم شاہ کے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک محاصرے کے دوران میں سلطان کے حکم سے برجوں کے اوپر شامیانے تانے گئے' جن کے نیچے " موسیقی کے ماہرین گویوں اور سازندوں نے اس کی تفریح کے لئے اپنے کمالات کا اظہار کیا"۔ اس سے وہ دشمن پر اپنی بے پروائی اور بے خوفی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ بعض حکمران' جو سیاسی اعتبار سے چنداں اہمیت نہ رکھتے تھے' فن موسیقی کی سرپرستی کے باعث قابل ذکر ہیں۔ گوالیار کا دبستان موسیقی پاک و ہند کے طول و عرض میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ یہاں کا راجہ مان سنگھ خود بھی بہت اچھا گویا تھا اور اس دبستان کی کامیابی کا سہرا زیادہ تر اسی کے سر ہے۔ اس دبستان کا شائد بہترین تلمیذ تان سین تھا' جس نے گانے کے ابتدائی اسباق وہاں کے سب سے بڑے موسیقار محمد غوث سے حاصل کئے۔ راجا کے دربار میں جو دوسرے موسیقی دان تھے ان میں نائک بخشو' مچھو اور بھانو بھی تھے۔ ان لوگوں نے مان سنگھ کی ترغیب سے راگ کا ایک عام پسند اسلوب رائج کیا' جسے بڑے بڑے ارباب ذوق نے پسند کیا۔ آگے چل کر بخشو کے "دھرپد" شاہ جہان نے جمع کر کے شائع کئے۔ مان سنگھ کی موت کے بعد بخشو یکے بعد دیگرے کالنجر کے راجا کیرت اور گجرات کے سلطان بہادر اور سلطان محمود کے درباروں سے وابستہ رہا۔ آخر میں بھٹہ کا راجا رام چند بگھیلا کا ذکر بھی ضروری ہے' جس نے نامور گویے تان سین کو 1562ء تک اپنے دربار میں رکھا تا آنکہ بعد شہنشاہ اکبر اسے اپنے دربار میں لے گیا۔

بابر : اس وقت تک فنی موسیقی کو جس قدر عظمت و شوکت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ مغل سلطنت کی خیرہ کن ترقیات اور سرپرستیوں کے مقابلے میں ماند پڑ گئی۔ اس سلطنت کا پہلا شہنشاہ بابر تھا جس نے موسیقی کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ اس کے تایا سلطان احمد مرزا کے امرا میں سے درویش بیگ ترخان کو علم موسیقی میں خاصا درک حاصل تھا اور وہ متعدد ساز بہت خوبی سے بجاتا تھا۔ ایک اور امیر سید یوسف قوپوز خوب بجاتا تھا بابر کا داماد عود بجانے کا شوقین تھا اور اس کا قاضی القضاۃ خوجہ عبداللہ مروارید کی نسبت میر علی شیر نے لکھا ہے کہ ویسا قانون بجانے والا کوئی اور معلوم نہ تھا قیام کابل کے ابتدائی ایام میں بابر کے دربار میں موسیقی کے تین نامور ماہر موجود تھے' یعنی قل محمد عودی' حسین عودی اور شیخی۔ یہ تینوں موسیقار مشہور شاعر اور مطرب علی شیر نوائی کے تربیت یافتہ تھے علی شیر نوائی نے متعدد بلند پایہ دھنیں ترتیب دیں۔ اس کا ایک لحن خصوصا مشہور ہے' جو بطور خاص بابر کے لئے لکھا گیا اور اس مقام (= راگ) میں گایا جاتا تھا جسے نوا کہتے ہیں۔ ایک اور درباری مطرب شاہ قلی غچکی عراق سے آیا تھا اور وہ "پیشرو"' "نقش" اور اس کے ترکی مترادف "نیشار" جیسی دھنیں بجانے میں بے نظیر تھا۔ بابری دربار کے دوسرے

Marfat.com

موسیقار غلام شادی' میر ازو اور محمد بو سعید تھے۔ آخرالذکر اپنی اس دھن کے لئے بالخصوص مشہور ہے جو مقام "چارگاہ" میں گائی جاتی تھی۔ ھرات کا شاعر بنائی موسیقی کا بھی ماہر تھا اور ہمیں مقام "راست" میں اس کی بنائی ہوئی ایک دھن کا پتا چلتا ہے۔ یہ راگ "نہرنگ" کہلاتا تھا اور اس کی تعریف علی شیر نوائی نے بھی کی ہے' جو بنائی کا حریف تھا۔ بابر کے بعض ناقدانہ اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی موسیقی کا ماہر تھا۔ وہ کسی حد تک دھنیں بنانے میں بھی دسترس رکھتا تھا' جو بابر نامہ کے اس بیان سے ظاہر ہے: "میں نے مدت سے کوئی راگ مرتب نہیں کیا تھا' لیکن جب میں نے ملا یاراک سے پانچ آھنگ میں گانا سنا تو اس فن سے میرا شغف از سرنو زندہ ہو گیا"۔ پھر اس نے بیٹھ کر "چار آھنگ" میں کچھ نغمے مرتب کئے۔ اینٹ بیورج (Annette St. Beveridge) نے وثوق سے لکھا ہے کہ بابر کے نغمات کا ایک مجموعہ بھی کسی زمانے میں موجود تھا۔

ہمایوں : نصیرالدین ہمایوں (م963ھ/1556ء) بھی اپنے باپ ہی کی طرح ہر قسم کی موسیقی کا حامی و مربی تھا۔ تاریخ الفی کے بقول ہمایوں کی رائے یہ تھی کہ صوفیوں کا رقص حقیقت میں "حکمت الٰہی" کی جان ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ عہد ہمایوں میں موسیقی دان اور گوئے "اہل مراد" میں شامل سمجھے جاتے تھے اور ان کے اظہار کمال کے لئے دربار میں دو شنبہ اور سہ شنبہ کے دن مقرر تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے نام معلوم ہیں: میر عبداللہ قانونی' مولانا حاتم قانونی' استاد شاہ محمد سرنائی اور اسی طرح حافظ دوست محمد خوافی مغنی اور استاد یوسف مودود مغنی۔ ان سب کے نام اکبر نامہ میں درج ہیں۔ بقول ابوالفضل علامی' مرزا حیدر دو غلاتی جس نے 948ھ/1541ء میں کشمیر فتح کیا تھا (وہ اس علاقے کا فرماں روا بن گیا' تاہم ہمایوں کو بدستور اپنا شہنشاہ تسلیم کرتا رہا)' اپنے ایام کشمیر میں موسیقی سے بطور خاص شغف رکھتا تھا اور ستار خوب بجاتا تھا۔ اس کے برعکس خود مرزا حیدر صراحتہ لکھتا ہے کہ جب ایک مطرب کے بارے میں اس کی رائے طلب کی گئی اس نے کہا کہ میں اس مسئلے میں کوئی قابل وثوق رائے نہیں دے سکتا' کیونکہ میں موسیقی دان نہیں ہوں۔

اکبر : اس کے بعد مشہور شہنشاہ اکبر کا دور آیا' جس کا دربار' بالخصوص اس کی موسیقی نہ صرف تمام ازمنہ ماضیہ پر سبقت لے گئی بلکہ اس کے بعد بھی اس کی کوئی مثال نظر نہیں آئی۔ ابوالفضل کی کتاب آئین اکبری میں اس عظیم شہنشاہ کے دربار کی موسیقی کے متعلق پوری معلومات مہیا کی گئی ہے۔ اس کے موسیقار سات طائفوں میں منقسم تھے اور ہر طائفے کے گانے بجانے کے لئے ایک ایک دن مقرر تھا۔ ابوالفضل نے ان میں سے چھتیس مطربوں کے نام لکھے ہیں' جن میں بعض گانے والے (گوئندہ) تھے' بعض انشاد کرنے والے (خوانندہ) تھے اور بعض آلات موسیقی کے ماہر' (سازندہ) تھے۔ یہ سب موسیقار دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے آئے

Marfat.com

تھے۔ مشہد سے خراسانی، ھرات سے افغانی اور گوالیار اور کشمیر سے ہندو (اور مسلمان) جمع تھے۔ ابوالفضل نے جن مطربوں کے نام لکھے ہیں ان میں نصف سے زیادہ کے نام مسلمانوں کے ہیں۔ ان حقائق سے یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ اگرچہ سنگیت، جسے ابوالفضل نے آئین اکبری میں بزبان فارسی پیش کیا ہے، سنسکرت کے پرانے راگ و دیا ہی کا مظہر تھا، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اس کے دربار میں دنیا بھر کے مطربوں کی جو چوکیاں موجود تھیں وہ عملاً بھی اس نظام موسیقی کی پابند تھیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ جن دس سازندوں کے نام لئے گئے ہیں ان میں سے صرف دو ان سازوں کو بجاتے تھے جن کے نام سنسکرت سے ماخوذ ہیں، یعنی بین (سنسکرت: وینا) اور سرمنڈل (سنسکرت: سور منڈل) لیکن باقی سازوں کے نام عربی، فارسی یا ترکی سے آئے ہیں، مثلاً" قانون، طنبورہ، غچک، قوبوز، رباب، نای، سرنای اور قرنای اور اس امر کی کوئی حتمی شہادت موجود نہیں کہ یہ ساز مسلمانوں کی فتح سے پہلے بھی ہندوستان میں موجود تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان مختلف سازوں کے اصوات اور ان کے بجانے کے مخصوص طریقوں میں ایسی قطعی خصوصیات موجود ہیں جیسے مثلاً" پاک و ہند کی مختلف بولیوں میں پائی جاتی ہیں۔ صحیح ہو یا غلط، آئین اکبری کا یہ بھی بیان ہے کہ اکبر اس فن میں پیشہ ور موسیقاروں سے زیادہ مہارت رکھتا تھا اور اس نے دو سو لحن یا راگنیاں بنائی تھیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور "جلال شاہی" اور "مہ میر کرگت" تھیں۔ ایک نبرالحن "نوروزی" بھی مذکور ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اس مقام کے نام ہے جس میں وہ ترتیب دیا گیا تھا۔ اس بادشاہ کے عہد کے مرقعوں میں مذکورہ بالا سازوں میں سے اکثر کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ایک قلمی تصویر میں مشہور مطرب تان سین کو دربار اکبری میں حاضر ہوتے دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویر انڈین میوزیم کلکتہ میں موجود ہے۔ تان سین کی ایک شبیہ جہانگیر کے جلوس شاہانہ کے ایک منظر میں بھی ہے۔ یہ تصویر ریاست رام پور میں ہے۔

موسیقی کے نظری اور عملی پہلوؤں پر آئین اکبری کا ایک باب مخصوص ہے، جسے ابوالفضل نے "سنگیت" کا عنوان دیا ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کی بنیاد سنسکرتی کے ماخذ پر ہے۔ اس نے گیتوں کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے: ایک "مارگ" جو زیادہ ممتاز پکے گانے کا اسلوب ہے۔ دوسرا "دشی" جس کے مظہر یہ ہیں: گوالیار میں دھرپد، دکن میں چھند، بنگال میں بنگہ، جونپور میں چٹکلا، گجرات میں جکری یا ذکری اور دہلی میں قول اور ترانہ۔ موخرالذکر دونوں اصلاً مسلمانوں کے راگ ہیں، لہٰذا ان کی پوری کیفیت عبدالقادر بن غیبی نے بیان کی ہے۔ سازوں کے شعبے میں اس نے مندرجہ ذیل شامل کئے ہیں: وینا (ہندی: بین)، [illegible] انبرتی، رباب، سرمنڈل، قانون، سارنگی، غچک، پناک، ادھ ھتی کنگرہ تار دار سازوں میں تت علاوہ ازیں چار قسم کے پھونک مار کر بجانے والے ساز (سکھر): آٹھ طرح کے ڈھول (بتت) اور آلات ضرب (گھن)۔ ان میں سے اکثر کے نام اپنی اسلامی اصلیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ سنسکرتی راگ ودیا کا رواج عام تھا، پھر بھی ایرانی موسیقی کی مانگ برابر جاری تھی۔ موسیقی کی جن دو

Marfat.com

کتابوں کا تہدیہ اکبر کے نام کیا گیا وہ فارسی میں تھیں' یعنی عنایت اللہ بن میر حاج الہروی کی تحفتہ الادوار اور قاسم بن دوست علی البخاری کا رسالہ در علم الموسیقی۔ اکبر کے سب سے بڑے موسیقار تان سین کی لکھی ہوئی کتاب سنگیت سرہندی زبان میں ہے۔

جہاں گیر : جہانگیر (1037ھ/1627ء) ہر نوع کی موسیقی کا عاشق تھا اور ہمیں علم ہے کہ اس کا بھائی دانیال ہندی کے گیتوں کا خاص شائق تھا بلکہ ان گیتوں کے لحن نکالنے والوں کے لئے اشعار بھی تصنیف کیا کرتا تھا۔ 1014ھ/1606ء کے "جشن اولین نوروز" میں شہنشاہ نے گرمی محفل کی خاطر گوئندے اور سازندے طلب کئے تھے۔ اگلے سال اس نے کابل میں افغانوں کے ارغشک ناچ میں بے حد دلچسپی کا اظہار کیا۔ 1025ھ/1616ء میں اس بادشاہ نے اپنے دربار کے ایک اعلیٰ درجے کے سازندے شوقی کو آنند خان کا خطاب دیا۔ شوقی کی بہت قدر و منزلت کی جاتی تھی کیونکہ وہ ہندی اور فارسی کی راگنیاں ایسے انداز سے بجا سکتا تھا جو "انسانوں کے دلوں سے زنگ صاف کر دیتی تھیں"۔ آنند کمار سوامی کے پاس شوقی کی ایک شبیہ تھی' جو Fox-Strangways : Music of Hindustan میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں اسے "نما خان کلاونت" (کذا□ نوا خان کلاونت) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس زمانے میں درباری مطرب کو علی العموم کلاونت کہتے تھے۔ یہ اصطلاح خاص معنی رکھتی ہے۔ اس شبیہ میں شوقی کو بین بجاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ شہنشاہ نے اپنے داروغہ نقار خانہ علی خان کروری کو بھی نوبت خان کا خطاب عطا کیا تھا۔ جہانگیر کا ایک اور پسندیدہ مطرب جتر خان کلاونت تھا' جس نے عادل خاں کو ہندی دھرپد گانا سکھایا تھا۔ میاں لال خان گوالیاری' جو اکبر کے دربار میں بھی رہا اور بعد میں جہانگیر کے دربار میں تھا' 1017ھ/1608ء میں فوت ہوا۔ توزک جہانگیری اور اقبال نامہ میں بعض دوسرے مطربوں کا ذکر بھی ہے' یعنی حمزہ' چتر خان' پرویز داد' خرم داد اور ماکھو۔ توزک جہانگیری سے 1037ھ/1627ء اس کے نقار خانے کی کیفیت معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس میں ایسے ایسے باجے تھے جیسے ایک دیو پیکر نقارہ' جسے کورگ یا کورگا کہتے تھے نقارہ' سرنای' کرنای' تمام چاندی کے بنے ہوئے تھے' مگر ڈھولکوں کی ایک خاص جوڑی سونے کی بھی تھی۔ ان باجوں پر پینسٹھ ہزار روپے لاگت آئی تھی۔ آخرالذکر میں تین سازوں کا خاکہ جہانگیر کے جلوس کی اس تصویر میں بنا ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ اس تصویر میں درباری مطرب بھی دکھائے گئے ہیں' جن میں سے بعض شاہ رود یا سرود' بین' چِک' یا کمانچہ اور نای بجا رہے ہیں اور گانے والی طوائف بھی ڈھول' دائرہ' چارپارہ اور تالا جیسے سازوں کے ساتھ گا رہی ہے۔

شاہ جہاں : شہاب الدین شاہ جہاں (م 1068ھ/1658ء) کا عہد موسیقی کے لئے بہت مساعد تھا۔ اس زمانے میں موسیقی تمام درباری اور عوامی جشنوں اور تیوہاروں پر تفریح کا ذریعہ بن چکی تھی۔ خوافی خان نے شہنشاہ کی رقاصاؤں کا' جو چنگ اور دف کی تال پر ناچتی تھیں' خاصی تفصیل

Marfat.com

سے ذکر کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے فرزند اورنگ زیب کی شادی کے جلسوں میں موسیقی کی کیسی کچھ بھرمار تھی' لیکن اسی شہزادے نے سریر آرائے سلطنت ہو کر موسیقی کے متعلق سخت مخالفانہ روش اختیار کی۔ شاہ جہان نے گوالیار کے مشہور شاعر اور لحن طراز بخشو کی تمام تصانیف کا مجموعہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ مجموعہ ایک ہزار دھرپدوں پر مشتمل تھا' جس میں چار راگ اور چھیالیس راگنیاں شامل تھیں۔ یہ ہزار دھرپد نائک بخشو میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

اورنگ زیب عالم گیر : اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی کے بعد فن موسیقی متروک ہو گیا۔ شہنشاہ نے اپنے درباری مطربوں کو موقوف کر دیا اور دوسرے گانے بجانے والے بھی اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو گئے۔ جس گھر میں بھی اس فن سے دلچسپی کا عملی اظہار ہوتا اس کی زبردستی تلاشی لی جا سکتی تھی اور آلات لہو تلف کر دیئے جاتے تھے۔ اس رویے کے خلاف احتجاج کے طور پر مطربوں نے موسیقی کے پتلے کا ایک جنازہ تیار کیا اور اسے دفن کرنے کے لئے لے چلے۔ واضح رہے کہ اس سے کچھ پہلے ہی حرمت سماع کے خلاف عربی اور فارسی بولنے والے ملکوں میں ایک تحریک شروع ہو چکی تھی اور اس زمانے کی دو کتابوں سے' جن میں احتجاج کیا گیا اور جو فارسی میں تھیں' ہم واقف ہیں۔ ایک کتاب محمد بن جلال الرضوی نے لکھی اور دوسری عبدالجلیل عبدالرحمٰن نے لکھ کر نائب مسیح الزمان کے نام معنون کی۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ یہ کتاب اورنگ زیب کے ایک درباری امیر شاہ قباد بن عبدالجلیل الحارثی کے لئے لکھی گئی تھی۔ یہ امیر موسیقی کا بے حد شیدا اور مربی تھا اور اس نے اسی زمانے میں موسیقی کے علم و فن کے متعلق سترہ مخطوطات نقل کرائے اور یہ سب اب تک محفوظ ہیں۔ ان میں الکندی' ابن منجم' الفارابی' ابن سینا' ابن زیلہ' صفی الدین عبدالمومن' عبدالقادر ابن غیبی اور دوسرے اکابر علم کے بیش بہا رسالے شامل ہیں۔ فقہا کے اقتدار کو دیکھتے ہوئے یہ بات اور بھی حیرت انگیز نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں موسیقی پر متعدد کتابیں خود اہل ملک نے لکھیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موسیقی کے علم و فن پر کتابیں لکھنے کی اجازت تھی' گو موسیقی کا عمل ممنوع تھا۔ 1073ھ/1622ء کے قریب ایک شخص فقیر اللہ نے راگ درپن کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالباً یہ سنسکرت کی ایک کتاب ما نکتو ھل پر مبنی تھی' جس کا ذکر راگ درپن میں موجود ہے اور جو گوالیار کے راجا مان سنگھ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ موسیقی پر فارسی میں ایک اور کتاب پرجات سنگیت بھی لکھی گئی اور شائد اس کا ماخذ بھی سنسکرت ہی تھا۔ اس کا مصنف مرزا روشن ضمیر تھا' جسے شیر خان لودی نے "باکمال شاعر اور مطرب" بتایا ہے۔ موسیقی کے متعلق فارسی میں ایک تیسری کتاب تحفتہ الہند ہے' جس میں سنسکرتی ماخذ کے حوالے موجود ہیں۔ اس کا مصنف مرزا خان محمد بن فخرالدین محمد تھا اور اس پر 1086ھ/1675ء کی تاریخ ثبت ہے۔ ایک چوتھی کتاب رسالہ در عمل بین و ٹھاٹھ راگ عوض محمد کامل خانی نے بھی اسی زمانے کے قریب لکھی۔ اسی موضوع پر پانچویں کتاب معرفتہ النغم ابوالحسن قیصر نے اور چھٹی مصباح السرور حسن بن خواجہ طاھر نے

Marfat.com

تصنیف کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک نظری اور عملی اعتبار سے ایرانی موسیقی کا عمل برابر جاری رہا' البتہ مختلف علاقوں کے اختلافات کی بنا پر متعدد اسالیب (مثلاً" افغانی' خراسانی اور ترکمانی) ظہور میں آئے۔ اس عہد میں دکن' گوالیار اور کشمیر کے غنائی دبستانوں کا گہرا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔ جو چیز ان سب کو ایک معین نظام میں منسلک کرتی تھی وہ نظریۂ موسیقی پر سنسکرت کی کتابوں کا اثر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بھرت کے نٹ شاستر (پانچویں صدی عیسوی؟) اور سارنگ دیو کی سنگیت رتناگر (تیرھویں صدی عیسوی) کے درمیان سنسکرت میں موسیقی پر کوئی کتاب ہمیں نہیں ملتی' بحالیکہ اسی زمانے میں مسلمانوں کے پاس عربی میں موسیقی کے متعلق بیسیوں کتابیں تھیں اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ان میں سے بعض پاک و ہند کے مسلمانوں کے علم میں تھیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موسیقی کے متعلق سنسکرت کی بعض کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ ممکن ہے کہ پہلے پہل یہ کتابیں صرف ان مقامی موسیقاروں کے زیر مطالعہ رہتی ہوں جنھوں نے ان کی تعلیمات کے مطابق تربیت پائی تھی' لیکن بعد میں سنسکرتی نظریہ عام طور پر اختیار کر لیا گیا۔ ایرانی اور سنسکرتی طریقوں کے درمیان جو خلا تھا وہ ناقابل عبور نہ تھا۔ ایرانی سپتک سترہ حصوں (اقسام) پر مشتمل ہے' جو 90-90 و 24 سرتیوں (cent=ٹھاٹھ میں آدھے سر کے ایک سواں حصہ) کے وقفوں کا غیر تغیر پذیر تسلسل پیدا کرتی ہیں' لیکن سنسکرت سپتک کی اقسام بائیس ہیں' جنھیں شوتی کہتے ہیں اور تغیر پذیر ہیں کیونکہ ایرانی سرگم کے پہلے دو وقفے سنسکرتی نظریے میں ستر یا نوے "سینٹ" پر مشتمل ہیں اور ایرانی سرگم کے چوبیس "سینٹ" سنسکرتی سرگم میں بیس یا بائیس "سینٹ" ہوتے ہیں۔ جہاں تک سامع کا تعلق ہے اسے دونوں میں بہت کم فرق محسوس ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں نظاموں کے اندر بہت سے مقام اور راگنیاں ایسی ہیں جو عملاً" یکساں ہیں۔

عالمگیر کے جانشین : اب پھر تاریخ کی طرف آئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کا جانشین ایک ایسا بادشاہ ہوا جس نے موسیقی کو دربار میں اور گھروں میں دوبارہ مقبول عام بنایا۔ یہ بادشاہ شاہ عالم بہادر شاہ اول (م1124ھ/1712ء) تھا' جس کی وسیع المشربی کی یہ کیفیت تھی کہ بقول خوافی خان اس کے دربار میں تین ولندیزی مطربوں کو بھی نوازا گیا۔ اس کے بعد جہاندار شاہ تخت نشین ہوا' جس کے عہد میں مطرب اور رقاص ترقی کر کے صاحبان منصب بن گئے۔ پھر فرخ سیر کے عہد میں خانہ جنگی کے فتنوں کے باوجود موسیقی کی جگہ بحال رہی۔ یہ بیان سیر المتاخرین کا ہے اور اسی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کا دبستان موسیقی' جس کی رہنمائی لال میاں نے کی تھی' ملک کے اکابر کو مغنی اور رقاص مہیا کر رہا تھا اور وہ بھاری تنخواہیں پاتے تھے۔ یہ حالت ناصرالدین محمد شاہ کے عہد میں تھی' حالانکہ اس وقت رفتہ رفتہ سلطنت مغلیہ اپنی گزشتہ شوکت و عظمت کا محض ایک سایہ سا رہ گئی تھی۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں' جو خاندان مغلیہ کا بڑا بد

Marfat.com

نصیب بادشاہ گزرا ہے، ایک شخص نے اس کے نام پر موسیقی کی ایک کتاب لکھی، جس کا نام خلاصتہ العیش عالم شاہی تھا۔ یہ اگرچہ فارسی میں لکھی گئی تھی، لیکن اس کا ماخذ زیادہ تر سنسکرت کی سنگیت درپن تھا۔ اس کتاب کے مطالب کا مستعار ہونا ہی اس زمانے کے ثقافتی زوال کی علامت تھی۔ مانچسٹر کے کتاب خانہ رائلینڈ (Ryland) میں فارسی کی ایک دلچسپ کتاب دستیاب ہوئی ہے، جو 1174ھ/1760ء سے قریب در علم موسیقی کے نام سے لکھی گئی تھی۔ اس میں بیس سازوں کے نقشے موجود ہیں۔ ان میں جلترنگ بھی شامل ہے، جس کا خاکہ اس سے قبل شائد ہی کبھی کھینچا گیا ہو۔ شاہ عالم ثانی نے زندگی کے آخری دن ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تحفظ پورے کئے۔ بالفاظ دیگر اب ایک نئے عہد کا آغاز ہو گیا۔ مشہور فرانسیسی فاضل Joanny Grosset نے، جو ہندوستانی موسیقی کے متعلق مستند مصنف سمجھا جاتا ہے، لکھا ہے کہ بارھویں صدی ہجری /اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر سے برطانوی عہد میں ممتاز اور دولت مند خاندانوں کی حوصلہ افزائی کی بدولت تمام فنون میں عموماً" اور فن موسیقی میں خصوصاً" از سر نو جان پڑ گئی۔

پاکستان میں: دھرپد سے خیال اور ٹھمری تک، برصغیر کی موسیقی کے ارتقاء میں مسلمان موسیقاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ برطانوی دور حکومت میں جن موسیقاروں نے کلاسیکی موسیقی کے تحفظ کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دیں ان میں بھی مسلمان اساتذہ، مثلاً" عبدالکریم خاں، مہربان خاں، ولایت خاں، امام الدین خاں، فیاض خاں، عاشق علی خاں اور عبدالوحید خاں، پیش پیش تھے۔ موسیقی کے جن گھرانوں نے اس فن کے مختلف اسالیب کو بنایا سنوارا ان میں کرانا، پٹیالہ اور شام چوراسی کے گھرانے بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ حصول آزادی (1947ء) کے بعد یہ فن ریاستوں کی سرپرستی سے محروم ہو گیا اور اکثر مسلمان مغنی پاکستان چلے آئے۔ ان میں روشن آرا بیگم، امانت علی خاں، فتح علی خاں، نزاکت علی خاں، سلامت علی خاں اور شاہد احمد دہلوی اور مقامی مغنیوں میں غلام علی خاں، برکت علی خاں، نزر حسین شامی اور فیروز نظامی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ سازندوں میں بندو خاں سارنگی نواز، عبدالعزیز خاں بین کار، فتح علی خاں ستار نواز، قادر بخش پکھاوجی اور علاقائی ساز بجانے والوں میں منبر سرحدی، مصری خاں اور نمیسو خاں قابل ذکر ہیں۔

آج کل عام فہم اور مقبول عام موسیقی پر بھی سنجیدگی سے توجہ دی جا رہی ہے۔ علاقائی لوک دھنوں کا احیا ہو رہا ہے۔ مشرقی اور مغربی موسیقی کے امتزاج سے نئی نئی دھنیں بنانے کے تجربات ہو رہے ہیں۔ سازینوں میں قدیم مشرقی سازوں کے ساتھ جدید ترین یورپی آلات موسیقی کے استعمال میں بھی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات کی بدولت وہاں کی دھنیں بھی یہاں کی موسیقی (بالخصوص قوالی) میں دخل پا رہی ہیں۔ اس ضمن میں فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اہم حصہ لے رہے ہیں۔ عسکری موسیقی کو بھی خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا گیا ہے۔' چنانچہ پاکستان آرمی اور پنجاب پولیس کے بینڈ متعدد قومی اور بین الاقوامی مظاہروں میں داد تحسین پا چکے ہیں۔

Marfat.com

باب 22

مغلوں کا نظام تعلیم

(SYSTEM OF EDUCATION)

مغلیہ دور حکومت میں برعظیم پاک و ہند کا کوئی شہر' قصبہ یا دیہات شائد ہی ملے جہاں تعلیم کا بندوبست نہ تھا کیونکہ مغل حکمرانوں اپنی رعایا کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ آیئے ذیل میں مغلیہ نظام تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں۔

تعلیمی ڈھانچہ :

تعلیم کا ڈھانچہ وہی تھا جو کہ سلاطین دہلی کے زمانے میں تھا۔ مکاتب ابتدائی مدرسے تھے۔ جہاں عربی' فارسی اور تھوڑا سا حساب پڑھایا جاتا تھا۔ زیادہ تر توجہ دینی تعلیم و تربیت پر دی جاتی تھی۔ مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کے ساتھ مکاتب کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ مکتب زیادہ تر مسجدوں سے وابستہ تھے۔ مسجد ہر قریہ اور ملک کے ہر کونے میں تھی۔

مدرسے اعلیٰ تعلیمی مرکز تھے۔ شاہان مغلیہ اور امراء نے بیشمار مدرسے قائم کئے اور ان کے اخراجات کے لئے دل کھول کر جاگیریں وقف کر دی تھیں۔ مدرسوں میں قابل معلم تھے۔ اکثر مدرسوں میں ہزاروں طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے۔ طلباء کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ ہر بڑے شہر میں مدرسے پائے جاتے تھے۔ بعض شہروں میں متعدد مدرسے تھے۔ پایہ تخت دہلی اور صوبائی صدر مقامات میں مدرسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

طلباء دور دور سے تحصیل علم کے لئے آئے۔ ان کی رہائش اور خورد نوش کا معقول انتظام تھا۔ مغل شہنشاہ مدرسوں کے اندرونی انتظامات یا تعلیمی معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتے تھے۔ غرضیکہ مکتب اور مدرسہ ملک کی تعلیمی ضرورت کو بخوبی پورا کرتے تھے۔ کوئی بچہ جس کو علم کا شوق ہو علم سے محروم نہیں رہتا تھا۔ البتہ حکومت کسی پر جبر نہیں کرتی تھی معیار تعلیم بلند تھا۔ مدرسوں میں دینوی علوم فقہ' حدیث' تفسیر کے علاوہ دینوی علوم فلسفہ' منطق' خطابت' ادب' ریاضی' تاریخ' طب فلکیات وغیرہ جن کی اس زمانے میں ضرورت تھی پڑھائے جاتے تھے۔ فنی تعلیم اور دست کاری کا وہی پرانہ طریقہ تھا جو ملکی ضرورت کو پورا کرتا تھا لیکن اس کے علاوہ مغل شہنشاہوں نے اپنی خانگی ضرورت اور مملکت کی ضروریات کے لئے بڑے بڑے کارخانے قائم کئے تھے۔ یہ کارخانے ان مقامات پر قائم کئے گئے تھے۔ جہاں مصنوعات کے لئے ضروری سامان عمدہ اور آسانی سے فراہم ہو سکے۔ دہلی' لاہور' آگرہ' بنگال' گجرات وغیرہ میں متعدد مقامات

Marfat.com

پر شاہی کارخانے تھے۔ شاہی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جملہ اشیاء ان کارخانوں میں تیار کی جاتی تھیں۔ شاہی ضروریات کے علاوہ رعایا کے لئے ضروریات کی اشیاء یہی کارخانے تیار کرتے تھے۔ یہ کارخانے بڑے بڑے ماہر استادوں کی نگرانی میں شاہی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ ایک قسم کے سرکاری ٹیکنیکل اسکول بھی تھے۔ کیوں کہ ان کارخانوں میں بے شمار نوجوان کام سیکھتے اور شاہی ضروریات تیار کرنے میں مصروف رہتے شاہی کارخانوں کے علاوہ صوبوں کے گورنر اور بڑے بڑے منصب دار بھی اپنی ضرورتوں کے لئے کارخانے قائم کرتے تھے۔ اس طرح ملک میں ایسے کارخانوں کی کمی نہیں تھی اور ان کارخانوں میں ماہرین فنی اور استادوں کی نگرانی میں نوجوان ہنر کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ مصنوعات کے اعتبار سے مغلوں کے عہد میں ہند مغربی ممالک سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ ہند کی مصنوعات ڈھاکہ کی ململ' لکڑی اور ہاتھی دانت کی اشیاء عطر و روغنیات کی یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ دوشالے ریشمی اور زر بفت کے کپڑے' دھاتوں کے خوبصورت برتن' شیشے کا سامان' کتابیں تصاویر' جوتے' اسلحہ جات شامیانے' خیمے' کشتیاں غرضیکہ ہر قسم کا سامان ملک میں تیار ہوتا تھا۔ ملک علمی' فنی' اور دستکاری اعتبار سے آسودہ تھا۔

تعلیمی مقاصد :

تعلیم کا مقاصد دینی اور دنیوی افادیت پر مبنی تھا۔ تعلیمی معاملات میں مسلمان فرمانرواؤں نے زیادہ دخل اس وجہ سے بھی نہیں دیا کہ ملک میں اکثریت اہل ہنر کی تھی۔ اکبر نے البتہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو ملا کر ایک قوم بنانے کی کوششیں کیں اور اس نظریہ کے مطابق اس نے ملکی رسم و رواج میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی باقاعدہ تعلیمی لائحہ عمل نہ تو تیار کر سکا اور نہ وقت اس کے لئے ساز گار تھا۔ اس لئے مغل عہد میں تعلیم کا مقصد اس زندگی اور عاقبت کی تیاری تک ہی محدود رہا۔

بہر حال فرد کو اپنی قدرتی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے لیکن بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ اس میں ترمیم اور اصلاحات نہیں کی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور بالا آخر ایک بیرونی قوم نے ملک پر اپنا تسلط جما لیا۔

نصاب تعلیم :

نصاب دینی اور دنیوی دونوں قسم کے مضامین پر مشتمل تھا۔ طلباء کو آزادی تھی کہ وہ اپنی دلچسپی کے مطابق مضامین کا انتخاب کریں۔ علمی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملک میں دستکاری کی تربیت کے معقول انتظامات تھے۔ گو وہ غیر رسمی تھے مگر فرد اور معاشرتی کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

طریقہ تدریس :

تدریس کے طریقے روائتی تھے جن کا دارومدار حافظہ پر تھا لیکن استاد اور شاگرد میں رابطہ

Marfat.com

اس زمانے کی خصوصیت تھی۔ اساتذہ ساگردوں کے لئے قابل قدر نمونہ تھے۔ جن کی شخصیت کا طلباء کے اخلاق و کردار پر گہرا اثر پڑتا تھا تعلیم محض لفظی یا کتابی نہیں تھی بلکہ اس میں عمل کو بھی کافی دخل تھا۔ اخلاقی و دینی اصولوں پر نہ صرف شاگرد بلکہ اساتذہ بھی عمل کرتے تھے اس طرح اوائل عمری سے بچوں اور نوجوانوں میں صلاحیت نشوونما پاتی تھی اور ذہنی تربیت کے ساتھ اعلیٰ کردار تشکیل پاتا تھا۔

مغل بادشاہوں کی تعلیمی خدمات :

آیئے اب ہم مغل بادشاہوں کی تعلیمی خدمات کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ انہوں نے برعظیم کے لوگوں میں کس حد تک تعلیم کی اشاعت کی۔

(1) بابر :

بابر خود نہایت لطیف ادبی ذوق اور علمی کمالات کا جامع تھا۔ عربی' فارسی اور ترکی زبان کا مانا ہوا ماہر تھا۔ ترکی میں اس نے کئی اعلیٰ معیار کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس نے اپنی زندگی کے حالات پر ایک کتاب لکھی ہے جس کو تزک تیموری کہا جاتا ہے۔ جس کا ترجمہ ایشیاء اور یورپ کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔

بابر خوش مزاج اور نیک طبع انسان تھا۔ وہ اکثر اپنے بے تکلیف احباب کو جمع کر کے شعر گوئی اور شعر خوانی کی محفلیں برپا کرتا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں بہت سے نفیس اور ستھرے مذاق کے اہل علم ہوتے تھے۔

بابر کو علم نجوم سے دلچسپی تھی۔ ہندوستان میں اس فن کے بڑے بڑے عالم تھے اور پرانی کتابیں بھی موجود تھیں بابر کو ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور یہاں اس نے اپنے اس شوق کی تکمیل کی بابر کو سمرقند کی مشہور صدگاہ اور اس کے حساب کی ترتیب کا پورا علم تھا جس کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ سمرقندی رصد گاہ کے خلیفہ علو بیگ مرزا نے گرگائی زائچے تیار کئے تھے۔ بعد میں ایک رصد گاہ خلیفہ مامون الرشید نے تعمیر کرائی۔ ہندوستان میں ایک مشہور رصد گاہ راجہ بھسوا جیت نے اجوین میں تعمیر کرائی تھی۔ بابر نے بھی ان تمام رصد گاہوں کے زائچوں سے مدد لیکر علم نجوم کی ترقی میں کافی حصہ لیا۔ بابر کو کتب خانوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ پنجاب کے حاکم غازی خان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جو اکبر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

بابر نے تعلیم کے فروغ کے لئے ضروری رفائے عامہ کے کاموں میں ترقی دینے کی کوشش کی اس نے ڈاک کا انتظام کیا۔ ایک محکمہ تعمیرات عامہ قائم کیا جس کو ایک گزٹ نکالنے اور مدارس و دارالعلوم تعمیر کرنے کے فرائض بھی سونپ دئے گئے تھے۔ مسٹر ابن این لاء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تعلیمی عمارتوں کی تعمیر کا کام مملکت کے ایک محکمے کے فرائض میں شامل

Marfat.com

کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت تعلیمی امور پر توجہ دیتی تھی۔

(2) ہمایوں :

ہمایوں کو علم و ہنر کا شوق اور تعلیمی دلچسپی وارثتاً" بزرگوں سے ملی تھی وہ بڑا اچھا شاعر تھا لیکن اس کو جس علم سے دلی لگاؤ تھا وہ ریاضی اور علوم نجوم تھے۔ کتب بنی کا بھی وہ بڑا شائق تھا یہاں تک کہ ایک منتخب کتابوں کا ذخیرہ وہ سفر میں یا میدان جنگ میں بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس کے دربار کی زیب و زینت قائم کرنے والے کثیرا لا تعداد جید علماء اور صاحبان ضمن ہے۔ ہمایوں ان کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ اس کا ملازم جوہر بڑا صاحب علم تھا اس کو تاریخ لکھنے کا بڑا ملکہ تھا۔ چنانچہ اس نے تذکرہ الا واقعہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ہمایوں کے حالات بڑی صحت اور تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہ کتاب عہد ہمایوں کے واقعات پر ایک مستند اور قابل تعریف ذریعہ معلومات سمجھی جاتی ہے۔ ہمایوں نے لاہور میں ایک بڑی صدر گاہ تعمیر کرائی اور دہلی میں اپنے دربار میں سات دیوان خانے تعمیر کرائے۔ مورخ فرشتہ نے لکھا ہے ایک ان دیوان خانوں کے علیحدہ علیحدہ درجوں میں ملنے والوں سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ سات دیوان خانوں کے نام بالترتیب سات سیاروں کے نام پر رکھے گئے تھے۔

ہمایوں کی کتابوں اور کتب خانوں اور کتب خانوں سے دلچسپی کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب اس نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کیا تو پرانے قلعے میں شیر شاہ کی تعمیر کی ہوئی عمارت شیر منڈل کو کتب خانے میں تبدیل کر دیا۔ وہ خود اس کتب خانے میں کتابوں کے مطالعہ کے لئے جایا کرتا تھا۔

(3) اکبر :

اکبر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نا خواندہ تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ناخواندہ تھا تو یہ اور بھی زیادہ تعجب اور فخر کی بات ہے کہ اس عظیم الشان بادشاہ کا عہد حکومت زمانہ وسطی کی تعلیم کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر کے عہد میں تعلیم' فنون لطیفہ' ادب' فلسفہ میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اس کے دربار میں بہت سے علماء اور فضلا موجود تھے۔ بادشاہ خود ان سے بڑے شوق و انہاک کے ساتھ مختلف علمی مباحث پر بحث کیا کرتا تھا۔ ہر مذہب کے علماء سے وہ آزادانہ طور پر تبادلۂ خیال کرتا تھا۔ جس سے اس عہد کے علوم اور مفید معلومات میں اضافہ ہونا یقینی تھا۔ اس سے عوامی تعلیم کے لئے قواعد اور اصول منضبط ہوئے۔ اکبر نے سابقہ زمانے کی تعلیمی روایات سے ہٹ کر عوام کی تعلیم کو سرکاری نگرانی میں سے لیا دہلی میں اس نے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا۔ جس میں مختلف مذاہب کی بہترین اور قیمتی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ سی طرح مختلف علوم و فنون اور ہر مضمون کی کتابیں یہاں موجود تھیں۔ اکبر کے زمانے میں فتح پور سیکری اور لاہور علوم و فنون کے عظیم مرکز بن گئے۔ سیکری میں اس

Marfat.com

نے ایک عبادت خانے کی بنیاد ڈال کر ایک نیا قدم اٹھایا جس نے خود اکبر کے عہد میں مذہبی اور سیاسی، ہلچل پیدا کر دی اور اس کی ذات آج تک موضوع بحث بنی ہوئی ہے اس عبادت خانے کے قیام سے اس کا یہ مقصد تھی کہ ہندوستان میں یا بیرون ہند جتنے مذاہب ہیں۔ ان کے پیروں کو اس عبادت خانے میں جمع کیا جائے ان سے بحث مباحثہ اور باہمی اشتراک تبادلہ خیال کر کے تمام مذاہب کے حصول کو سمجھا جائے اور مختلف مذاہب میں باہمی اشتراک اور یکجہتی کی صورت نکال کر ایک ایسے دینی نظام کا ڈھانچہ تیار کیا جائے کہ جس میں بلا اختلاف مذہب پر ہر شخص شریک ہو سکے۔

اکبر نے تعلیم کو مذہبی قدیمی روایات اور فرسودہ طریقوں تک محدود رہنے سے نجات دلانے کی کوشش کی اس نے چند نئے علوم سکھانے کا بھی انتظام کیا۔ نصاب میں مفید تبدیلیاں کی گئیں۔ ہندوؤں کو ترغیب دی گئی۔ کہ وہ اسلامی درسگاہوں میں شرکت کریں اور مسلمانوں کے ساتھ تعلیم حاصل کریں۔

مہا بھارت کا ترجمہ بادشاہ کے حکم سے فارسی میں کیا گیا اس ترجمہ بادشاہ میں ہندو پنڈت مسلمان علماء اور عبدالقادر مصنف تاریخ بدایوانی شامل تھے۔ فارسی میں اس کتاب کا نام ازم نامہ رکھا گیا۔ دوسری مشہور کتاب رامائن کا ترجمہ فارسی میں عبدالقادر بدایوانی نے چار سال میں پورا کیا اسی طرح کئی ویدوں اور دوسری ہندوؤں کی پرانی کتابوں کو فارسی زبان میں نقل کیا گیا۔ اکبر ان کوششوں سے ہندو مسلم اور ارتباط کی بنیاد پڑی اور ان کے باہمی میل جول سے ایک نئی زبان جنم لینے لگی جو آگے چل کر اردو کہلائی۔

اکبر کو اپنے کتب خانے سے دلچسپی تھی۔ اس کی کتابوں کی تقسیم دو حصوں میں کی گئی تھی۔ ایک حصہ علوم طبعی کی اور دوسرا تواریخ کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد وہاں کا کتب خانہ بادشاہ کے قبضے میں آیا اور اس کی کتابوں سے شاہی دربار کے امراء اور علماء کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کا کتب خانہ بھی جس میں چار ہزار چھ سو کتابیں تھیں۔ شاہی ملکیت میں آگیا۔ اس کتب خانے کی کتابیں بڑی خوبصورتی سے مکمل کی گئی تھیں اس کتب خانے کی ترتیب موجود عہد کے اصول پر کی گئی تھی۔ کتب خانوں کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کی بہت سی کتابیں تصویروں سے آراستہ کی گئی تھیں جن میں اس عہد کے مشہور مصوروں نے اپنے کمال فن کے ذریعے بہت خوب صورت بنا رہا تھا۔ قصہ امیر حمزہ جو بارہ جلدوں میں ہے۔ اس میں چودہ سو تصویریں شامل ہیں۔ اکبر نے نصاب کی اصلاح کے علاوہ تعلیم کی توسیع کے لئے بہت کوشش کی اور تعلیم کو عام لوگوں میں مقبول بنانے کی تدابیر اختیار کیں۔ اکبر کے زمانے میں حکومت کی طرف سے تعلیمی توسیع کے لئے سرکاری امداد دینے کا طریقہ بھی شروع ہوا اور مدارس کی نگرانی بھی ہونے لگی۔ اکبر نے آگرہ، فتح پور سیکری اور کئی دیگر مقامات پر نئے اسکول جاری کرائے۔

Marfat.com

(4) جہانگیر :

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا اکبر نے اس کی تعلیم کا بہت معقول انتظام کیا تھا۔ اس کام کے لئے اس نے اعلیٰ قابلیت کے اساتذہ اور اتالیق مقرر کئے تھے۔ جہانگیر نے حصول تعلیم میں محنت کی اور کئی علوم حاصل کر لئے۔ کتابوں سے اسے عشق تھا اس کی زیر نگرانی بھی ایک اعلیٰ پائے کا کتب خانہ وجود میں آیا سفر میں کتابیں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ گجرات کے سفروں میں بالخصوص یہ اچھی اچھی کتابیں اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں کے علماء میں تقسیم کیں بابر کی طرح یہ بھی اپنی زندگی کے حالات اور حکومت کے کارناموں کو خود لکھنے کا بہت شائق تھا۔ اس نے تزک جہانگیری میں اپنے عہد کے تمام واقعات اور حالات صداقت کے ساتھ تحریر کئے۔ ایک کتاب اقبال نامہ جہانگیری بھی لکھی ہے جس میں اس عہد کے واقعات مشہور علماء اور شعراء کا ذکر ہے۔

جہانگیر نے ایک سرکاری حکوم جاری کیا تھا کہ جب بھی کوئی دولت مند شخص یا امیر مسافر مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی دولت مدرسوں اور خانقاہوں وغیرہ کی تعمیر و مرمت پر صرف کی جائے یہ حکم پوری مملکت میں جاری کیا گیا تھا۔ تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے ان مدرسوں کی بھی مرمت کرائی جو تیس سال سے پرندوں اور چوپایوں کی پناہ گاہ بنے ہوئے تھے۔ ان عمارتوں کو پھر طلبہ اور مدرسین سے آباد کر دیا۔

(5) شاہ جہاں :

شاہ جہاں کے دور میں تعلیمی کام ماند پڑ گئے۔ اور مورخین نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی۔ فرانس کے مشہور سیاح بریز نے ہندوستان کی تعلیمی حالت کی تصویر عہد شاہ جہان میں بہت خراب کھینچی ہے۔ جس میں مبالغے کا پہلو حقیقت پر غالب نظر آتا ہے۔ مسٹر نریندرناتھ اپنی کتاب عہد اسلامی میں علمی ترقی میں شاہ جہاں کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ برنیر کا یہ بیان کہ ان مملکتوں میں سخت جہالت جہاں پھیلی ہے۔ جہاں اچھی درس گاہیں اور معاملات کے لئے قائم ہو سکتے ہیں۔ صحیح حالات کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ یہ امر کہ شاہ جہاں رجعت پسند نہیں تھا۔ جس واقعہ سے ثابت ہیں کہ عام تعلیمی ادارے مع ان اوقات کے جو سابقہ بادشاہوں امراء اور غیر سرکاری اشخاص نے ان کے لئے قائم کئے تھے۔ اس کے زمانے میں جاری رہے اور ان کی خوش حالی میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی۔

بعض مورخین نے شاہ جہاں کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے وثوق کے ساتھ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس کی ہندو نوازی اور ہندو مذہب و ادب سے گہری وابستگی اس کی ناکامی کا بڑا سبب تھا۔

(6) اورنگ زیب :

Marfat.com

اورنگ زیب مذہب اسلام سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ اورنگ زیب نے بے شمار دارالعلوم اور مدارس قائم کئے اس نے اپنے عہد میں شہر لکھنوٴ میں ایک ڈچ عمارت پر قبضہ کر کے ایک مدرسہ اسلامی علوم کی تدریس کے لئے جاری کیا۔ اس نے گجرات کے دیوان اور دوسرے صوبوں کے والیوں کو یہ احکام بھیج کر مدرسوں کے تمام طلبہ کو شاہی خزانے سے مالی امداد دی جائے جس کی منظوری مقامی صدر سے حاصل کی جائے۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ احمد آباد پٹن' سوات میں ایک ایک استاد کا تقرر کیا جائے اور گجرات کے تمام مدرسوں کی مرمت کے لئے ایک رقم منظور کی۔ احمد آباد میں ایک دارالعلوم قائم کرنے کے لئے اس نے وہاں کے صدر کی درخواست پر ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے منظور ئے اور ایک پورا موضع اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بطور جاگیر عطا کر دیا۔

اورنگ زیب نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لئے جو اقدامات کئے وہ اس الزام کی تکذیب کرتے ہیں کہ اس بادشاہ کو تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی۔ بوہروں کے لئے اس نے کافی تعداد میں استاد مقرر کئے ماہانہ امتحانات کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ امتحان کے نتیجوں سے شہنشاہ کو مطلع کیا جاتا رہے۔ بوہروں کے لئے اس نے تعلیم لازمی کر دی تھی اور طلبہ کو وظائف دئے جاتے تھے۔ بیانہ اور دیگر مقامات پر اورنگ زیب کے زمانے میں غیر سرکاری اشخاص نے بھی صدر سے قائم کئے ہیں۔

اورنگ زیب کے زمانے میں سیالکوٹ علم و فضل کا ایک بڑا مرکز تھا جہاں دور نزدیک سے علماء آتے تھے۔ مولوی عبدالحکیم جو فن تدریس میں کامل سمجھے جاتے تھے۔ ایک مدرسہ قائم کیا جس میں ان کے لڑکے مولوی عبداللہ تعلیم دیتے تھے۔

اورنگ زیب تعلیم کے متعلق بہت ترقی یافتہ خیالات رکھتا تھا۔ اس وقت کے نظام اور نصاب تعلیم سے اسے بہت بے اطمینانی تھی۔ اس کے تعلیمی اصول کے متعلق جو خیالات تھے وہ اس کی ایک تقریر سے ظاہر ہوئے ہیں۔ جو اس نے اپنے ایک پرانے استاد ملا صالح (یا ملا جیون) کے سامنے کی۔

اورنگ زیب دین کا بہت پابند تھا۔ دینی کتابوں کے مطالعہ کا اسے بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنے کتب خانے میں مذہبی علوم کی کتابوں کا بہت اضافہ کیا۔ جس کی وجہ سے شاہی کتب خانہ بہت وسیع ہو گیا۔ سلاطین مغلیہ میں اورنگ زیب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا اس کی معلومات دینی اور تاریخی معاملات میں بہت وسیع تھیں۔

Marfat.com

باب 23

مغلوں نظام عدلیہ

(SYSTEM OF JUDICIARY)

مغلوں کے انصاف کے بارے میں Monserato اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ مغل بادشاہ انصاف میں کسی رو رعائت کے قائل نہ تھے۔ اسی لئے ہمیں مغل حکمران دوسرے تمام حکمرانوں سے بڑھ کر انصاف کرنے کی کوششیں کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ وہ انصاف کرنے کو دیگر تمام امور پر فوقیت دیتے تھے۔ بادشاہ کے علاوہ مرکز اور صوبائی سطح پر انصاف کرنے کے لئے قاضیوں کا تقرر کیا گیا جو لوگوں کے مسائل کو حل کرنے اور جھگڑوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے اور بادشاہ کے بعد دوسرا بڑا افسر تھا وہ قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔

(1) قاضی القضاۃ :

یہ مرکز میں اعلیٰ ترین عدالتی افسر تھا اور اس کو بادشاہ کے بعد بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کو صدر بھی کہا جاتا تھا۔ ابتداء میں صدرالصدور اور قاضی کے عہدے ایک ہی ہوا کرتے تھے لیکن اورنگ زیب کے دور میں ان عہدوں کو الگ کر دیا گیا۔

(2) قاضی :

صوبے میں انصاف کرنے والے شخص کو قاضی کہا جاتا تھا یہ مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا یعنی صوبائی سطح پر بھی قاضی اور صدر ایک ہی آدمی کی شکل میں دونوں فرائض یعنی عدل کرنا اور مذہبی معاملات کو طے کرنا انجام دیا کرتے تھے۔

صوبے میں جو دوسرے چھوٹے افسران ہوا کرتے تھے ان کا تقرر قاضی کیا کرتا تھا اور وہ اپنے تمام کاموں کے لئے قاضی کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ صوبائی قاضی سرکار اور پرگنے کے قاضیوں کا بھی تقرر کیا کرتا تھا گویا یہ تمام ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھے جو مرکز سے شروع ہو کر پرگنہ کی سطح تک پہنچتی ہے۔

(3) سرکار قاضی :

سرکار سطح پر ایک کوتوال ہوا کرتا تھا جو فوجداری مقدمات کا فیصلہ کیا کرتا تھا لیکن جہاں تک مذہبی معاملات اور اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا تعلق تھا تو یہ فرائض سرکار قاضی انجام دیا کرتا تھا۔ قاضی مذہبی معاملات' شادی' وراثت کے مقدمات جن کا

Marfat.com

تعلق مذہب سے ہوا اور اس کے علاوہ خاندانی جھگڑوں کو بھی نبٹانہ تھا۔

(4) پرگنہ قاضی :

پرگنے کی سطح پر کوتوال کی بجائے شقدار ہوا کرتا تھا جو کوتوال کے فرائض انجام دیتا تھا۔ پرگنے کے قاضی کا تقرر سرکار قاضی کرتا تھا اور کوئی بھی شخص انصاف کے حصول کے لئے پہلے پرگنے کے قاضی پھر سرکار قاضی' پھر صوبے کے قاضی کے پاس جانے کی بجائے براہ راست مرکز میں بادشاہ تک بھی پہنچ سکتا تھا۔

(5) مفتی :

یہ شخص اسلامی تاریخ میں قاضی کی مدد کے لئے موجود ہوتا تھا۔ مفتی محض فتویٰ دیتا تھا کسی بھی ایسے معاملے میں جس میں قاضی کو پوری طرح دینی معلومات حاصل نہ ہوں تو پھر وہ مفتی سے اس بارے میں مشورہ کرتا تھا۔ مفتی کا کام محض فتویٰ دینا تھا کہ فلاں جرم میں مجرم کو فلاں سزا دی جائے اس پر عمل در آمد کروانا قاضی کا کام ہوتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں مفتیوں کو بے حد اہمیت دی جاتی تھی۔ مغلوں کے دور میں بھی ان سے مشورے کئے جاتے تھے لیکن ان کا باقاعدہ تقرر نہیں کیا جاتا تھا۔

(6) میرعدل :

یہ عہدہ صرف مغلوں کے زمانے میں قائم ہوا اور نہ اس سے پہلے یہ عہدہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

تاریخ داؤدی میں شیر شاہ سوری کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ اس کی قائم کردہ عدالتوں میں قاضی کی مدد میرعدل کرتا تھا۔ اگر قاضی دیگر کئی مقدمات میں مصروف ہوتا تو وہ کوئی مقدمہ میرعدل کو دے سکتا تھا کہ وہ اس کا فیصلہ کرے یعنی میرعدل قاضی کے مدد گار کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

(7) قاضی عسکر :

عسکر سے مراد ہوتی ہے فوج لہٰذا قاضی عسکر سے مراد ہے ایسا قاضی جو فوج کے ساتھ رہے۔ یعنی قاضی عسکر فوج کے کیمپ میں رہتے ہوئے ہی اپنے فرائض کو انجام دیتا تھا اور فوج جہاں کہیں بھی جاتی تھی اسے بھی ساتھ ہی جانا پڑتا تھا وہ دوران سفر تمام مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔

مقدمہ کی سماعت کا طریقہ کار :

اگر کسی شخص کے ساتھ زیادتی ہوتی تو وہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں جاتا تھا اور قاضی

Marfat.com

سمن جاری کرتا تھا کہ مخالف فریق فلاں تاریخ' دن اور وقت میں حاضر ہوا اور پھر جب مقررہ تاریخ دونوں فریقین عدالت میں حاضر ہو جاتے تھے تو اپنے اپنے دلائل پیش کیا کرتے تھے۔ صفائی پیش کرتے تھے اور ایک دوسرے پر مختلف الزامات لگاتے تھے۔

اس دور میں چونکہ وکلاء نہیں ہوا کرتے تھے لہذا فریقین خود اپنے حامیوں کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو کر دلائل دیا کرتے تھے۔ مدعیان کے لئے دو معزز گواہ پیش کرنا ضروری ہوتا تھا۔

پھر قاضی ثبوت مہیا کرنے کا حکم دیتا اور دونوں طرف کے گواہوں سے روداد سنی جاتی تھی اور اس تمام کاروائی کے بعد قاضی اپنا فیصلہ محفوظ رکھتا تھا وہ ایسا اس لئے کرتا تھا کہ بعض اوقات کوئی شخص دو گواہ سچا ہونے کے باوجود مہیا نہیں کر سکتا تھا تو قاضی اپنے طور پر معاملات کی خفیہ چھان بین کرواتا تھا اور پھر فیصلہ دیتا تھا۔ اس ضمن میں فریقین سے قسمیں بھی لی جاتی تھیں۔

ججوں کی تقرری :

قاضی القضاۃ (یعنی صدر) کا تقرر بادشاہ کرتا تھا اسے جج کے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ قلمرو کے دیگر علاقوں کے ماتحت قضاۃ مقرر کرنے کا اختیار بھی صدر ہی کو حاصل تھا لیکن ایسے تمام تقررات میں بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ بادشاہ بھی اپنے اختیار سے کام لے کر ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضی مقرر کیا کرتا تھا اور اسی لحاظ سے ان کے فرائض کی تصریح بھی کر دی جاتی تھی۔ یہ قاضی اور میر عدل ہوتے تھے اور تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں دونوں موجود رہتے تھے۔

بادشاہ ایک قاضی عسکر بھی مقرر کرتا تھا اور اس کے ساتھ بھی میر عدل کا تقرر ہوتا تھا۔ البتہ مفتی ہر جگہ نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ سلطنت کے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں ان کے تقرر کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ محتسب دارالحکومت کے علاوہ صوبوں میں بھی مقرر کئے جاتے تھے ان کے فرائض میں مذہبی احتساب کے علاوہ پولیس کے فرائض بھی داخل تھے۔ لیکن انھیں نہ سڑکوں کی دیکھ بھال سے کوئی تعلق ہوتا تھا' نہ کشتیوں' جہازوں اور ان کے مسافروں کی سلامتی سے کوئی واسطہ' جیسا کہ الماوردی کے حوالے سے پہلے بتایا گیا ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ قاضی محض دارالحکومت' صوبائی صدر مقامات اور دیگر بڑے بڑے شہروں ہی میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن عہد مذکور کی تاریخوں میں جو واقعات جابجا مندرج ہیں ان سے حتمی طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے مقامات یعنی قصبات اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کئے جاتے تھے البتہ دیہات اس سے مستثنیٰ تھے۔

ابوالفضل اس کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ عدالتی عہدہ داروں کے متعلق آئین میں صرف دو جگہ ذکر ملتا ہے۔ سیورغال کے ضمن میں وہ صدر کی حیثیت کے بارے میں لکھتا ہے کہ

Marfat.com

"قاضی اور میر عدل اس کے زیر فرمان ہوتے ہیں" اور سرکاری افسروں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنے کے سلسلے میں وہ لفظ میر داد استعمال کرتا ہے اور اس کی بابت لکھتا ہے کہ وہ ایسا شخص ہونا چاہئے جو حرص و خود غرضی سے پاک ہو' جو کمال احتیاط و دقت نظر سے متصف ہو اور محض گواہوں اور حلفیہ بیانات پر تکیہ نہ کرتا ہو بلکہ مختلف سوالات کے ذریعے صحیح حال معلوم کر سکتا ہو"۔

صاحب مرآۃ کے بیان میں بہت قطعیت ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "صوبے اور قصبات کے قاضی صدر اعلیٰ کی معرفت مقرر کئے جاتے ہیں اور وہ دربار سے ملی ہوئی سند کی بناء پر' صدر صوبہ کی معرفت' اپنے فرائض منصبی کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔۔۔۔۔ قاضیوں کو نقد تنخواہ (روزینہ) ملتا ہے اور ان کے پاس اراضی مدد معاش رہتی ہیں جو انھیں ملازمت کی مدت کے لئے عطا کی جاتی ہیں"۔ اس کتاب کے علاوہ جو صوبائی امور سے متعلق بہترین سند کی حیثیت رکھتی ہے' ان مالی حسابات میں بھی جو ہر پرگنے سے مرکزی حکومت کو بھیجے جاتے تھے' ایک مستقل مد مقامی قاضیوں کے لئے انعام کی ہوتی تھی جو انھیں عیدین کے موقع پر دیا جاتا تھا۔ نیز ہر پرگنے کے بازار کے نرخوں کی' جن سے دارالحکومت کو مطلع کیا جاتا تھا' تصدیق بھی یہی قاضی کیا کرتے تھے۔

بہر حال اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ قصبات یا پرگنہ جات میں میر عدل بھی ہوا کرتے تھے اور اس زمانے کے معاشرے کی تنظیم اور معاشی حالات بھی ایسے ہی تھے جن میں زیادہ مقدمہ بازی کی گنجائش نہ تھی۔ غرضیکہ یہ باور کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ مذکورہ مقامات میں میر عدل قطعاً موجود نہ تھے۔

بادشاہ اور عدل گستری :

عدل گستری کا دوسرا مقام بادشاہ کا دربار ہوتا تھا۔ شاہان مغلیہ نے مسلم فقہا کی اس اجازت کو' کہ عدالتی مقدمات کا فیصلہ بادشاہ کو خود کرنا چاہئے' پوری طرح استعمال کیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ معمولی مقدمات کی سماعت بادشاہ دربار عام میں روزانہ کیا کرتا تھا لیکن اہم مقدمات کی سماعت جن میں گواہوں کی شہادت لینا اور ان پر جرح کرنا ضروری ہوتا' وہ ہفتے میں صرف اس دن کرتا تھا جو محض عدل گستری کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بادشاہ خواہ کسی فوجی مہم پر ہوتا یہ محض تفریح کے لئے دارالحکومت سے باہر جاتا یا صوبوں کے دورے پر نکلتا لیکن ان معمولات میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ جہانگیر اس فرض کی جانب سب سے زیادہ توجہ کرتا تھا چنانچہ بہت سے مقدمات کے فیصلے اس نے اپنے دوروں کے زمانے میں کئے۔

بادشاہ دونوں قسم کے مقدمات (دیوانی و فوجداری) کی سماعت کرتا تھا۔ اسے عدالت ابتدائی اور عدالت مرافعہ دونوں ہی کے اختیارات حاصل تھے۔ ان واقعات سے جو عہد مذکور کی تاریخوں

Marfat.com

میں منتشر طور پر مذکورہ ہیں یہ پتا چلتا ہے کہ بادشاہ کے حضور دیوانی مقدمات سے زیادہ فوجداری مقدمات پیش ہوتے تھے۔ اس کی توجیہ نہایت آسان ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قانون دیوانی کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ دربار شاہی تک ان مقدمات کے پہنچنے کی بہت کم گنجائش رہ جاتی تھی۔ صرف پیچیدہ یا غیر معمولی طور پر اہم مقدمات اس کے حضور بصورت مرافعہ پیش ہوتے تھے اور خود قاضی بھی ایسے مقدمات بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس فوجداری مقدمات کے لئے اس قسم کی کوئی قید یا رکاوٹ نہ تھی اور بحیثیت مجموعی شہنشاہوں کا اصول بھی یہی تھا کہ سزا دہی کے وسیع اختیارات عاملہ یا عدلیہ کے عہدہ داروں کے ہاتھوں میں نہ رکھے جائیں اور ضوابط میں یہ حکم قطعی طور پر موجود تھا کہ سزائے موت کے لئے ہر صورت میں بادشاہ کی منظوری لازمی ہے۔ ان حالات میں صوبوں کے گورنر بلکہ دارالحکومت کے اعلیٰ عہدہ دار بھی سزائے موت دینے یا اعضا کی قطع و برید کے احکام جاری کرنے کا خطرہ برداشت کرنے سے مجتنب رہتے تھے اور ایسے مقدمات بادشاہ کے پاس بھیج دینے کو ترجیح دیتے تھے۔ غرضیکہ ملزموں نے بادشاہ سے اپیل کی ہو یا ابتدائی سماعت کرنے والے مجسٹریٹوں اور ججوں نے مقدمات بادشاہ کے پاس بھیجے ہوں' مقدمات فوجداری کی تعداد مقدمات دیوانی سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔ مصارف کے لحاظ سے بھی معاملے کی نوعیت یہی ہو سکتی تھی۔ مقدمہ فوجداری میں ملزم کو تمام گواہوں کے ساتھ سرکاری خرچ پر دربار روانہ کر دیا جاتا تھا۔ لیکن مقدمہ دیوانی میں فریقین خود مصارف مقدمہ برداشت کرتے تھے۔

مرافعہ :

مرافعے سے متعلق کوئی خاص قواعد و ضوابط مقرر نہ تھے' نہ مختلف درجوں کی عدالتیں تھیں جہاں ابتدائی سماعت کرنے والی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف مرافعہ کیا جاتا۔ لیکن جہاں تک عملی صورت حال کا تعلق تھا دیوانی مقدمے کا ہر دو فریقوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست اپنا مقدمہ بادشاہ کے حضور پیش کریں یہ قاضی کے فیصلے کے خلاف اس سے اپیل کریں۔ اسی طرح مقدمہ فوجداری میں' ملزم کو حق مرافعہ حاصل تھا اور ابتدائی سماعت کرنے والا مجسٹریٹ بھی یہ اختیار رکھتا تھا کہ وہ فوجداری مقدمے کی سماعت خود کرے یا دوران سماعت جس مرحلے پر چاہے اسے دربار میں بھیج دے۔

مقدمات فوجداری کی سماعت :

جہاں تک مقدمات کی سماعت کے طریقے کا تعلق ہے' مقدمات دیوانی کی طرح عاملہ کو عدلیہ سے ہمیشہ علیحدہ نہ رکھا جاتا تھا۔ آئین کے بموجب گورنر کو سزائے موت دینے کا اختیار بھی حاصل تھا اگرچہ عملاً" اس اختیار کے استعمال پر بڑی پابندیاں عائد تھیں۔ پلسائرٹ کا یہ قول کہ گورنر' دیوان اور بخشی روزانہ یا ہفتے میں چار دن ججوں کے ساتھ اجلاس کرتے ہیں' صرف

Marfat.com

نہایت اہم فوجداری مقدمات کے متعلق ہو گا۔

مرآتہ میں مذکور ضوابط و ہدایات سے، جو وقتاً فوقتاً صوبوں کو بھیجے گئے تھے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنر کو اپنے صوبے میں مقدمات دیوانی کی سماعت پر عام نگرانی رکھنے کا حق حاصل تھا۔ مقدمات کی سماعت کے لئے وہ خود عدالت میں بیٹھتا تھا اور فوجداران ضلع جن ملزمان کو گرفتار کرتے انھیں اس کے حضور بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کا فرض تھا کہ نوعیت مقدمات کے بارے میں باز پرس کر کے دائرہ شرع میں آنے والے مقدمات کو فیصلے کے لئے قاضی کے پاس بھیج دے، سیاسی جرائم کی سماعت خود کرے اور مالگزاری سے متعلق مقدمات دیوان کے پاس بھیجے۔

کوتوال شہر براہ راست گورنر کی نگرانی میں رہتا تھا اور مجرمین شہر کے بارے میں گورنر ہی اسے ہدایات دیتا تھا۔ ان مجرموں کو یا تو کوتوال کے ماتحت ملازمین یا خود مستغیث گورنر کے حضور لے کر آتے تھے۔

گورنر کو یہ ہدایت بھی تھی کہ وہ مہینے میں ایک بار قید خانوں کا معائنہ کیا کرے اور قیدیوں کی حالت معلوم کرے۔ اسے یہ اختیار حاصل تھا کہ جن قیدیوں کو وہ بے گناہ سمجھے انھیں رہا کر دے اور قاضی کو حکم دے کہ وہ زیر حراست ملزمین کے فیصلہ طلب مقدمات کی سماعت بلا تاخیر کرے۔

اس نوعیت کے معاملات میں اس کے اختیارات کا اندازہ ایک معاملے سے، جس میں احمد آباد کے قاضی کو اورنگ زیب نے تنبیہہ کی تھی، نہایت اچھی طرح ہوتا ہے۔ اس تنبیہہ کی وجہ یہ تھی کہ قاضی مذکور نے بعض ایسے قیدیوں کو رہا کر دیا تھا جنھیں گورنر کے حکم سے مفسدہ پردازی کے الزام میں حراست میں رکھا گیا تھا۔ چنانچہ دیوان کے نام یہ حکم جاری ہوا کہ وہ اس قسم کے قیدیوں کو رہا نہ ہونے دیا کرے۔ آئندہ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری خود اس پر عائد ہو گی۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت کے بعض حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ گورنر کے علاوہ ہر صوبے کے دیوان کا بھی یہ فرض تھا کہ وہ عدل گستری کے اس شعبے پر نظر رکھے۔ چنانچہ ایک فرمان کے ذریعے خواجہ محمود حاشم، دیوان احمد آباد کو براہ راست حکم دیا تھا کہ وہ فیصلہ طلب مقدمات کا جائزہ لے کر ایسی تدابیر اختیار کرے کہ وہ بلا تاخیر مزید فیصلہ کر دئے جائیں۔ نیز اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں گورنر کے مشورے سے کام کرے اور تمام معاملات سے دربار کو مطلع کرتا رہے۔

غرضیکہ جس طرح دارالحکومت میں مقدمات فوجداری کے منصفانہ فیصلے کی نگرانی بادشاہ کرتا تھا اسی طرح صوبے میں اسی کی نگرانی بادشاہ کے نائب یعنی گورنر صوبہ کے ذمے تھی اور گورنر نیز قاضی کے کام کی نگرانی، دیگر صوبائی امور کی طرح، دیوان کرتا تھا۔

Marfat.com

سزائیں :

سزاؤں کے معاملے میں بھی مغل اسلامی قانون کی پابندی کرتے تھے اور اگرچہ بادشاہوں نے بعض معاملات میں اس کی پابندی نہ کی لیکن بحیثیت مجموعی قاضی اور مجسٹریٹ تمام مقدمات کے فیصلے اسلامی قانون ہی کے مطابق کیا کرتے تھے۔

اس امر کا فیصلہ کہ کس قسم کی اور کتنی سزا دی جائے قطعاً جج کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا کیونکہ اس قسم کی سزا کا مقصد اصلاح ہے لہٰذا اس سزا کی مقدار ہر شخص کے لئے الگ الگ ہوتی ہے۔ بعض فقہا معاشری حیثیت اور ذہنی صلاحیتوں کی بناء پر عوام کو چار طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں اور بعض "فرد کے باطنی اوصاف" اس کی دین داری اور طرز معاشرت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔

"حد" کی بہ نسبت "تعزیر" والے مقدمات کی سماعت کا طریقہ آسان ہے۔ یہ سزا اقبال جرم کر لینے پر دی جاتی ہے۔ اقبال جرم کر لینے کے بعد انکار جرم نہیں ہو سکتا یہ سزا دو گواہوں کی شہادت پر بھی دی جا سکتی ہے خواہ ان میں سے ایک گواہ کوئی عورت کیوں نہ ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ جرم کے متعلق جج کی ذاتی واقفیت ہی کافی ہے۔

جہاں تک قصاص یعنی قتل ۔کے مقدمات میں سزائے موت کا تعلق ہے اکبر اور اس کے قریبی جانشینوں کی کوشش خاص طور پر یہی رہی کہ اس سزا کا اختیار کلی طور پر قاضیوں اور دوسرے مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں نہ رہے۔ 26 سنہ جلوس اکبری میں اکبر کے حضور یہ تجویز پیش کی گئی کہ صوبائی گورنروں کے ہاتھوں سے اس سزا کا اختیار واپس لے لیا جائے اور یہ قاعدہ وضع کیا گیا کہ اس سزا کی تعمیل کے لئے بادشاہ کی منظوری لازمی ہے۔ اکبر کے جانشینوں نے بھی یکساں طور پر سے برقرار رکھا۔ چنانچہ ہر جانشین کے حالات میں اس سلسلے کے قطعی احکام یا حوالے موجود ہیں۔ حتیٰ کہ ' بقول پادری مانسریٹ کے جب اکبر خود فرائض قضا انجام دیتا تو اس کی تاکید یہی تھی کہ جب اکبر خود فرائض قضا انجام دیتا تو اس کی تاکید یہی تھی کہ جب تک وہ تیسری بار حکم صادر نہ کرے' مجرموں کو سزا نہ دی جائے۔ تھوناٹ (Thevenot) کہتا ہے " بادشاہ یہ اختیار اپنے لئے ہی مخصوص رکھتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص سزائے موت کا مستوجب ٹھہرتا ہے تو بادشاہ کی مرضی معلوم کرنے کے لئے ایک نامہ پر اس کے حضور بھیجا جاتا ہے اور جوں ہی وہ بادشاہ کا حکم لے کر واپس آتا ہے فوراً" اس کی تعمیل کی جاتی ہے" شاہ جہاں کے متعلق لاهوری بھی یہی کہتا ہے۔ "جب کسی صوبے میں کسی شخص کا ایسا جرم ثابت ہو جاتا ہے جس کی سزا موت ہو تو ناظم (گورنر) یہ جرائت نہیں کر سکتا کہ بادشاہ کی منظوری حاصل کئے بغیر سزائے موت کے فیصلے کی تعمیل کر دے"۔

Marfat.com

ایم اے سیاسیات پر انفرادی خصوصیات کی حامل کتب

سال اول

لازمی

پرچہ نمبر1	مغربی سیاسی افکار	ایس۔ ایم۔ شاہد
پرچہ نمبر2	مسلمانوں کے سیاسی افکار	ایس۔ ایم۔ شاہد
پرچہ نمبر3	تقابلی و ترقیاتی سیاست	عمانویل یونس
پرچہ نمبر4	بین الاقوامی تعلقات	نعیم اکبر یسین
پرچہ نمبر5	پاکستان کی نظریاتی تاریخ حکومت و سیاست	مجاہد فاروق

سال دوئم لازمی

پرچہ نمبر6	تقابلی سیاسی نظام	ایس۔ ایم۔ شاہد
پرچہ نمبر7	تحریک پاکستان	سید اصغر علی شاہ جعفری

مندرجہ ذیل میں سے کوئی سے تین پرچے منتخب کرنے ہیں

قانون بین الاقوام	ایس۔ ایم۔ شاہد
بین الاقوامی تنظیمیں	ایس۔ ایم۔ شاہد
پاکستان کی خارجہ پالیسی	زاہد حسین انجم
نظمات عامہ (نظم و نسق)	ایس۔ ایم۔ شاہد
جدید مسلم مفکرین	ایس۔ ایم۔ شاہد
مقامی حکومتیں	ایس۔ ایم۔ شاہد

Marfat.com

ایل ایل بی سال اول کے لئے ماسٹر سیریز گائیڈ

- ★ پرچہ اول — اصول قانون — تنویر بخاری
- ★ پرچہ دوئم — قانون معاہدہ و قانون بیع مال — تنویر بخاری
- ★ پرچہ سوئم — اصول قانون اسلامی — تنویر بخاری
- ★ پرچہ چہارم — قانون ٹارٹ و قانون آسائش — تنویر بخاری
- ★ پرچہ پنجم — تعزیرات پاکستان — تنویر بخاری
- ★ پرچہ ششم — دستور برطانیہ و دستور امریکہ — تنویر بخاری

ایل ایل بی سال دوئم کے لئے ماسٹر سیریز گائیڈ

- ★ پرچہ اول — تاریخ آئین پاکستان
  اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور 1973ء — تنویر بخاری
- ★ پرچہ دوئم — اصول نصفت و قانون وقف قانون داری مختص — تنویر بخاری
- ★ پرچہ سوئم — قانون بیع' شرئی' شراکت و کمپنی — تنویر بخاری
- ★ پرچہ چہارم — قانون انتقال جائیداد رجسٹری و جانشینی — تنویر بخاری
- ★ پرچہ پنجم — قانون شریعت و مخصی قانون و حق شفعہ — تنویر بخاری
- ★ پرچہ ششم — قانون بین الاقوام — تنویر بخاری
- ★ پرچہ ہفتم — مقامی قوانین ر معاملہ زمین و مزارعت — تنویر بخاری

ایل ایل بی سال سوم کے لئے ماسٹر سیریز گائیڈ

- ★ پرچا اول — ضابطہ دیوانی و قانون میعاد سماعت — تنویر بخاری
- ★ پرچا دوم — ضابطہ فوجداری و قانون پولیس — تنویر بخاری
- ★ پرچا سوم — قانون شہادت — تنویر بخاری
- ★ پرچا چہارم — قانون عرضی دعوئی — تنویر بخاری
- ★ پرچا پنجم — دستوری قوانین
  تاریخ و ارتقاء رٹ' قانون رٹ — تنویر بخاری
- ★ پرچا ششم — قانون خورد
  قانون اشامپ' قانون بالغان' قانون تشخیص دعوئی بات'
  قانون کورٹ فیس' قانون ثالثی' شہری قانون کرایہ داری — تنویر بخاری
- ★ پرچا ہفتم — عدالتی طریقہ کار
  قوانین سپریم کورٹ طریقہ کار' قوانین ہائی کورٹ طریقہ کار'
  سول و فوجداری عدالتوں کا طریقہ کار — تنویر بخاری

نیو بک پیلس اردو بازار لاہور فون نمبر: 7224925

اشاکسٹ: فاروق سنز الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

Marfat.com

پاکستان کی تمام یونیورسٹیز کے لئے

MODERN WORLD CONSTITUTIONS

جدید دساتیر عالم

1- دستور امریکہ
2- دستور برطانیہ
3- دستور فرانس
4- دستور سوویت یونین
5- دستور پاکستان
6- دستور ترکیہ
7- دستور سوئزرلینڈ
8- دستور چین
9- دستور بھارت
10- دستور جرمنی
11- دستور انڈونیشیا
12- دستور مصر
13- دستور ملائشیا
14- دستور ایران

تنویر بخاری

نیو بک پیلس
اُردو بازار لاہور

اردو بازار، لاہور (فون: 042-7224925)

Marfat.com

Marfat.com

ایم اے مطالعہ پاکستان برائے زکریا یونیورسٹی ملتان

سال اول

(لازمی)

پرچہ نمبر 1- جغرافیہ پاکستان	از ایس ایم شاہد
پرچہ نمبر 2- تحریک پاکستان	اصغر علی شاہ جعفری
پرچہ نمبر 3- پاکستانی معاشرہ و ثقافت	ایس ایم شاہد
پاکستانی معاشرہ	جمیل احمد پال
پرچہ نمبر 4- حکومت و سیاست	مجاہد فاروق
پرچہ نمبر 5- پاکستان کی خارجہ پالیسی	زاہد حسین انجم
پاکستان کی خارجہ پالیسی	جمیل احمد پال

سال دوئم

(لازمی پرچہ)

1- پاکستان میں منصوبہ بندی و معاشی ترقی	ذیشان بخاری

آپشنل

ذیل سے چار سے پیپرز اختیار کریں۔

1- جنوبی ایشیاء میں ہندو مسلم تہذیب	ایس ایم شاہد
2 پاکستان میں سیاسی جماعتیں اور سیاست	(زیر طبع)
3- پاکستانی زبانیں اور ادب	ایس ایم شاہد
4- پاکستان کی دفاعی پالیسی اور عسکری مشکلات	(زیر طبع)
5 جنوبی ایشیاء میں مسلمانوں کی مذہبی تحریکیں	(زیر طبع)
6- پاکستان کا انتظامی اور قانونی نظام	(زیر طبع)
7- پاکستان کا افسر شاہی' فوجی اور سیاسی نظام	(زیر طبع)
8- تحقیق طریقہ کار	(زیر طبع)
9- ہندو اور مسلمانوں کے معاشرتی و سیاسی افکار	(زیر طبع)

Marfat.com